فہرست مضامین

تصاویر:- (۱) منشی دیانرائن نگم (۲) رفیقۂ حیات منشی دیانرائن نگم (۳) مسٹر سری نرائن نگم
(۴) فرزندان منشی دیانرائن نگم (۵) اراکین دفتر رسالہ "زمانہ"

---

۱ پیش لفظ ... سری نرائن نگم ۵
... جدید اور کچھ پرانے ۶
... اپنے معاصرین کی نگاہ میں
۵۔ منشی دیانرائن نگم ایک انسان اور دوست کی حیثیت
حق پرست ۲۱
۲۵

مدیر

ماہنامہ رسالہ "زمانہ"

و

ہفتہ وار اردو "آزاد"

کانپور

مرتبہ

سری نرائن نگم

قیمت :- ۵۰ روپے ۔ اعلیٰ ایڈیشن ۱۰۰ سو روپے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فہرست مضامین

تصاویر: (۱) منشی دیا نرائن نگم (۲) رفیقۂ حیات منشی دیا نرائن نگم (۳) مسٹر سری نرائن نگم (۴) فرزندان منشی دیا نرائن نگم (۵) اراکین دفتر رسالہ "زمانہ"

۱۔ پیش لفظ — سری نرائن نگم — ۵
۲۔ پیغامات — جدید اور کچھ پرانے — ۶

منشی دیا نرائن نگم، اپنے معاصرین کی نگاہ میں

۳۔ زمانہ اور ترقی اردو — سر شیخ عبدالقادر — ۱۵
۴۔ اردو ہندی اور رسالہ زمانہ — خواجہ حسن نظامی — ۱۹
۵۔ منشی دیا نرائن نگم ایک انسان اور دوست کی حیثیت سے — حق پرست — ۲۱
۶۔ نگاہِ خلوص بیں — حضرت جوش ملیح آبادی — ۲۵
۷۔ پیامِ محبت — ــــــ — ۲۶

منشی دیا نرائن نگم: اپنے مضامین کے آئینہ میں

۸۔ عرضِ حال — ۳۱
۹۔ مطالعہ رامائن — ۳۳
۱۰۔ مسلم خیالات میں ایک اہم تبدیلی — ۳۸
۱۱۔ دیہاتوں کی تنظیم — ۴۵
۱۲۔ ہندوستانی زبان کی ترقی — ۴۹
۱۳۔ ہندوستانی اکیڈمی — ۵۵
۱۴۔ یادِ رفتگاں — ۶۰
۱۵۔ حضرت جوش ملیح آبادی — ۸۰
۱۶۔ تھانیسر کی لڑائی اور اسکے اثرات — ۸۸
۱۷۔ خط "نگاہِ خلوص بیں" کا جواب — ۹۵
۱۸۔ پریم چند — ۹۶

زمانہ: اپنے مضامین کے آئینہ میں

۱۹۔ حب وطن کی منزل — لالہ لاجپت رائے — ۹۹
۲۰۔ ہندی مذاق — سلطان احمد — ۱۰۴
۲۱۔ اردو زبان میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال — مولوی ذکاء اللہ — ۱۰۷

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۲۲۔ لکھنؤ کے پرانے سین — نوبت رائے نظر — ۱۰۹
۲۳۔ ڈھائی گھڑی کی سلطنت — خواجہ عبدالرؤف عشرت — ۱۱۹
۲۴۔ کلامِ ٹیگور کا فلسفہ — رگھوپتی سہائے فراق — ۱۳۴
۲۵۔ ہندوستان کا فنِ تصویر کشی — جگت موہن لال رواں — ۱۳۴
۲۶۔ رفتارِ خیال — نیاز فتحپوری — ۱۴۴
۲۷۔ ادب الکاتب — نواب حیدر یار جنگ طباطبائی — ۱۴۷
۲۸۔ اسلافِ ہند کے تمدنی کارنامے — جے آر رائے — ۱۵۱
۲۹۔ چھوٹی لین — رام سرن نگم — ۱۶۰
۳۰۔ رسم الخط — مولوی عبدالحق — ۱۶۵
۳۱۔ شاعر اور خودستائی — حامد اللہ افسر — ۱۷۱
۳۲۔ شیخ و برہمن — ڈاکٹر اعظم کریوی — ۱۷۵
۳۳۔ میری شہسواری — عظیم بیگ چغتائی — ۱۸۲
۳۴۔ سہی — سلیم جعفر — ۱۸۹
۳۵۔ حالی اور نذیر احمد کے خطوط — ۱۹۶
۳۶۔ کرکٹ میچ — پریم چند — ۲۰۰
۳۷۔ عورتوں کی مضمون نگاری — مسز شفیع احمد قدوائی — ۲۱۳
۳۸۔ اردو ادب میں طوائفوں کا اثر — آنند نرائن ملا — ۲۱۸
۳۹۔ گلدستۂ نظم — ۲۲۳

منشی دیا نرائن نگم؛ موجودہ اہلِ قلم کی نگاہ میں

۴۰۔ منشی دیا نرائن نگم اور زمانہ — طالب چکوالی — ۲۴۷
۴۱۔ منشی دیا نرائن نگم، ایک صحافی — علامہ ابوثاقب کانپوری — ۲۵۰
۴۲۔ منشی دیا نرائن نگم ایک نصب العین — ڈاکٹر تارا چرن رستوگی — ۲۵۲
۴۳۔ منشی دیا نرائن نگم اور زمانہ کی ادبی خدمات — ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری — ۲۵۵
۴۴۔ منشی دیا نرائن نگم اور زمانہ — ڈاکٹر اطہر شیر — ۲۶۱
۴۵۔ خراجِ عقیدت — گوپال متل — ۲۶۵
۴۶۔ منشی دیا نرائن نگم کی خطوط نگاری — محمد ایوب واقف — ۲۶۶
۴۸۔ رسالہ زمانہ — ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی — ۲۷۵
۴۹۔ زمانہ منشی دیا نرائن کی ادارت میں — غافل انصاری سنسارپوری — ۲۷۸
۵۰۔ منشی دیا نرائن نگم اب ایسے انسان کہاں — اختر الاسلام — ۲۸۱
۵۱۔ منشی دیا نرائن نگم۔ مجاہدِ قلم — رام پرکاش راہی — ۲۸۳
۵۱۔ بابو جی — جیندر بھوشن سنگھ — ۲۸۵
۵۲۔ دادا صاحب — برج نرائن نگم — ۲۸۷
۵۳۔ بھولی بسری یادیں — سری نرائن نگم — ۲۹۴

سری نرائن نگم ایڈیٹر و برج نرائن نگم پرنٹر و پبلشر نے لیتھو کے صفحات نامی پریس نخاس لکھنؤ و سرورق سرل پرنٹنگ پریس لکھنؤ میں چھپوا کر نمبر ۱ جگبست روڈ لکھنؤ [illegible] سے شائع کیا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

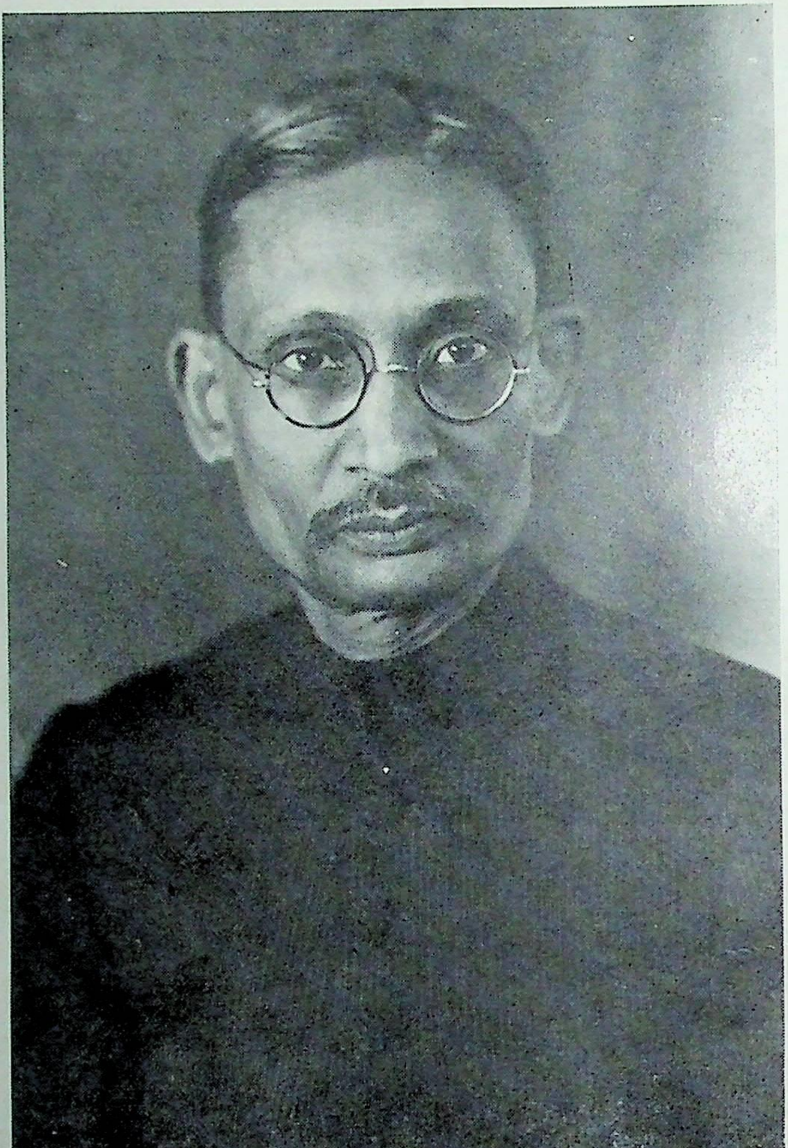

Munshi Daya Narain Nigam
March 22, 1882 – November 2, 1942

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پیش لفظ

یہ نثر و نظم کا گلدستہ منشی دیا نرائن نگم جنھوں نے انتالیس ۳۹ سال کے طویل عرصہ تک آبیاری کرکے اردو کے بے مثال رسالہ زمانہ کو تر و تازہ و شاداب رکھا، کی تاریخ ولادت کے صد سالہ جشن پر آپ کے پیش نظر ہے۔ اس مجموعہ میں نہ فقط اردو کے موجودہ ادیبوں و نقادوں کے مضامین ہیں بلکہ اُن مضامین کا بھی انتخاب ہے جو منشی دیا نرائن نگم کے افکار کا نتیجہ ہیں اور جو وقتاً فوقتاً "زمانہ" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ مضامین پہلی مرتبہ یکجائی شکل میں شائع کئے جا رہے ہیں علاوہ اس کے ان صاحب قلم و شعرا کے بھی نمونے شامل ہیں جنھوں نے اپنے افکار سے "زمانہ" کے صفحات کو زینت بخشی اور جن کی مشترکہ و متفقہ کوششوں نے زمانہ کو اردو کا بہترین رسالہ و ملک کے چوٹی کے ادبی رسالوں میں شمار کرا دیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے کئی طویل مضامین جو ادبی و لٹریری حیثیت سے کسی طرح کسی سے کم نہیں ہیں نظر انداز کرنا پڑے۔ اسی طرح ایک کثیر تعداد لکھنے والوں کے مضامین جو کسی رسالے کے لئے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں شامل نہیں کئے جا سکے۔ چند نمونے جو آپ کے پیش نظر ہیں ان سے آپ یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زمانہ کی گذشتہ جلدوں میں کتنے جواہر پارے چھپے ہوئے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اردو کا کوئی بھی شاعر و نثر نگار ایسا نہیں تھا جس کے مضامین و کلام نے "زمانہ" کے صفحات کو زینت نہ بخشی ہو۔

اس جشن کے منانے کا سہرا میرے چھوٹے بھائی برج نرائن جی کے سر ہے۔ یہ خیال اوّل ان کے دل میں پیدا ہوا اور اپنے ارادہ کی تکمیل میں انھوں نے نہ فقط ایک سال سے زیادہ اَن تھک کوشش کی بلکہ اپنا سارا وقت اس کے نذر کر دیا۔ اور اس کا مالی بار بھی برداشت کیا۔

آخر میں مَیں جناب حشمت سہیل صاحب کا جو نہ فقط اردو کے ادیب اور شاعر ہیں بلکہ میرے عزیز دوست و کرم فرما بھی ہیں، ممنون ہوں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر اس خیال کو جو ایک خواب تھا حقیقت بنا دیا۔

سری نرائن نگم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پیغامات

شریمتی اندرا گاندھی صاحبہ وزیر اعظم ہند

(ترجمہ)

مجھے خوشی ہے کہ جشن پیدائش یوم صد سالہ منشی دیانرائن نگم مارچ ۱۹۸۲ء میں منایا جا رہا ہے۔

منشی جی نے اردو صحافت کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

میں ان تقریبات کی کامیابی کے لئے دعا کرتی ہوں۔

۱۰ دسمبر ۱۹۸۱ء

جناب محمد ہدایت اللہ صاحب نائب صدر ہند

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ منشی دیانرائن نگم جو اردو ادب کی ایک عظیم المرتبت شخصیت تھے، کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک یادگار نمبر شائع کر رہے ہیں۔

میں اس کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۱ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شریمتی شیلا کول صاحبہ وزیر تعلیم و سماجی بہبود نئی دہلی

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم صد سالہ تقریبات کمیٹی لکھنو ان کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک یادگار نمبر اجرا کر رہی ہے۔

ہمارے ہندوستانی ادب کی تاریخ میں منشی دیا نرائن نگم بحیثیت ایک عظیم جرنلسٹ سوشل ریفارمر اور معروف معلم کے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ ان کو اردو و فارسی پر عبور تھا اور ان کا طرز بیان و تحریر اپنا خصوصی تھا۔ ان کے ماہانہ رسالہ "زمانہ" کی نثر نگاری علمی و ادبی حلقہ میں مستند مانی جاتی تھی۔

منشی دیا نرائن نگم ذہنی کش مکش کے زمانے میں رہے۔ سر تیج بہادر سپرو، سر عبدالقادر اور سر محمد اقبال کی صحبت نے اُن کے سیاسی رجحانات کو سنجیدگی کی طرف مائل کیا۔ حالانکہ منشی جی میں حب الوطنی کی کمی نہ تھی۔ انھوں نے ہمیشہ ایک متوازن نظریہ قائم رکھا بحیثیت سوشل ریفارمر ان کے خیالات بہت بلند تھے۔ وہ ملی جلی ذات و ملی جلی قومی شادی۔ شادی بیوگان۔ تعلیم نسواں۔ یکجائی تعلیم کے حامی اور رسم پردہ کے خلاف تھے۔

منشی دیا نرائن نگم انیسویں صدی کے ترقی یافتہ دور کی ہستی تھے۔ ان کی علمی و ذہنی عظمت نے ملک کے محبتی جذبہ کے فروغ پر زبردست اثر ڈالا۔ مجھے امید ہے کہ ہم اس جشن کی تنظیم کرنے میں مادر ہند کے ایک عظیم سپوت کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔ اور یہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں کا دھیان منشی جی کی اُن اعلیٰ قدروں کی طرف جن کے لئے منشی دیا نرائن نگم ایسی برگزیدہ ہستیوں نے اپنی زندگی وقف کی، دلائیں گی۔

میں اس جشن کی کامیابی کی تمنا کرتی ہوں۔

۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جناب چندریشور پرشاد نرائن سنگھ صاحب

راجپال اتر پردیش

(ترجمہ)

منشی دیا نرائن نگم جیسے معروف ادیب اور مدیر رسالہ "زمانہ" کانپور جیسی عظیم شخصیت کی صد سالہ تقریبات اور اس موقعہ پر ایک یادگار نمبر نکالنے کی تجویز میں اپنے کوشش پاک کر کے مسرت محسوس کرتا ہوں۔

منشی دیا نرائن نگم کی شخصیت ہمہ گیر تھی وہ نہ صرف ایک مشہور اردو ادیب و نڈر صحافی تھے جن کے قلم میں انتہائی تاثر و قوت تھی بلکہ ایک بڑے سوشل ریفارمر اور متعدد قومی تحریکوں بہ اشمولیت قومی یکجہتی و فرقہ وارانہ مساوات کے علم بردار بھی تھے۔ وہ نہ ہارنے والی ہمت رکھتے تھے اور ارادہ کے پکے تھے جنھوں نے اپنی پالیسی یا طرز تحریر بدلنے کے بجائے تنگدستی کو ترجیح دی۔ وہ ہندوستانی اکیڈمی جو ہندی اور اردو کے طرز تحریر کی ترقی اور ہندی اور اردو انشا پردازوں کی بہبودی کے لیے قائم کی گئی تھی، کے بانیوں میں سے تھے۔

منشی جی کی زندگی اور ان کے کارنامے ادیبوں، صحافیوں اور سماجی فلاح و بہبود کے کارکنوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہیں گے۔

اس قابل تحسین کارکی کامیابی کے لیے میں دست بدعا ہوں

۹ راکتوبر ۱۹۸۱ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جناب ٹی انجیا صاحب۔ وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم کی صد سالہ تقریب تمام ملک میں منائی جا رہی ہے۔ اور اس موقع پر ایک یادگار نمبر بھی جاری کیا جا رہا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم نے اس صدی کے اوائل میں اردو ادب کے لیے جو بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں ان کے لیے وہ عرصہ دراز تک یاد کئے جائیں گے۔ وہ ایک بڑے ادیب اور اردو صحافت کے علم بردار تھے۔

میں اس مادر ہند کی عظیم ہستی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تقریبات کے پروگرام کی کامیابی کا خواہاں ہوں۔

۴ نومبر ۱۹۸۱ء

جناب رام سنگھ صاحب وزیر کارگار و پولیٹیکل پنشن اتر پردیش

(ترجمہ)

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ منشی دیا نرائن نگم کے جشن صد سالہ یوم پیدائش کے موقع پر ایک یادگار نمبر جاری کیا جا رہا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم ایک بڑے ادیب سوشل ریفارمر اور مشہور صحافی تھے ان کی خدمات اردو ادب و قومی یک جہتی کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی۔

میں اس یادگار نمبر کی اشاعت کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۱ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جناب عمار رضوی صاحب وزیر تعمیرات و قومی یکجہتی اترپردیش

(ترجمہ از ہندی)

مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ منشی دیانرائن نگم کی جنم شتابدی کے موقعہ پر اعلیٰ پیمانہ کا ایک خصوصی یادگار نمبر شائع کیا جا رہا ہے۔

اردو کے ماہانہ رسالہ زمانہ کے تیجسوی ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم نایاب قسم کے سنگم تھے۔ اردو ادب کے بڑے ودوان اور پتر کار ہونے کے ساتھ منشی دیانرائن نگم ایک اعلیٰ پیمانہ کے سماج سدھارک اور آزادی کے ایک مضبوط علم بردار تھے۔ فرقہ وارانہ امن و قومی یکجہتی کے لیے انھوں نے خصوصی خدمات انجام دی ہیں۔

اردو کے مشہور ماہانہ رسالہ "زمانہ" کے ایڈیٹری کے فرائض منشی جی نے ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۲ء تک انجام دیئے اور اپنے رسالہ کے ذریعہ مختلف مشہور و معروف ہندو اور مسلمان ادبی ہستیوں کو خدمت کا موقعہ دیا۔ ان کے رسالہ میں اکبر الٰہ آبادی، پریم چند، سوامی رام تیرتھ، لالہ لاجپت رائے، مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، اقبال، شبلی، سرور، حالی، بال مکند گپت، اقبال نرائن گرٹو، شرر، چکبست، جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی جیسے انشا پرداز ہستیوں کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ اقبال کا مشہور قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے پہلے "ہمارا دیس" کے عنوان سے رسالہ "زمانہ" کے ستمبر ۱۹۰۴ء کے شمارہ میں چھپا تھا۔

میں منشی جی کی جنم شتابدی منانے کا سواگت کرتا ہوں۔

۲۴ نومبر ۱۹۸۱ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جناب چودھری نونہال سنگھ صاحب وزیر تعلیمات و تمدّن اتر پردیش

(ترجمہ)

مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ منشی دیانرائن نگم کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک یادگار شمارہ اجرا کیا جا رہا ہے۔

منشی دیانرائن نگم نے جس لگن و جذبے سے کام کیا ہے یقیناً وہ آئندہ نسلوں کے لئے سوسائٹی میں ایک اعلیٰ معیار قائم کرنے میں مشعلِ ہدایت ہوگا۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ یادگار شمارہ منشی جی کی اعلیٰ قدروں کو کامیابی سے پھیلائے گا۔

میں اس یادگار شمارہ کی کامیابی کا خواہاں ہوں

۲۴ ردسمبر ۱۹۸۱ء

اس سے قبل زمانہ کی سلور جوبلی کے موقعہ پر جو پیغامات موصول ہوئے تھے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

سر رابندر ناتھ ٹیگور

"زمانہ" کے جوبلی کے موقعہ پر میں نہایت مسرت کے ساتھ اڈیٹر "زمانہ" کی خدمت میں مبارکباد کا پیام دے رہا ہوں۔ اس قابلِ قدر ادبی رسالہ کے ذریعہ جو کارِ خیر ہو رہا ہے اس کی کامیابی کے لیے میں تہِ دل سے دست بدعا ہوں۔

لالہ لاجپت رائے: میں ایک مدت تک "زمانہ" کو شوق سے پڑھتا رہا ہوں بلکہ گاہ گاہ اس کے لئے مضامین بھی لکھے ہیں۔ میں نے ہمیشہ "زمانہ" کی تحریروں سے حظ اٹھایا ہے اور اس کے مذاق کو پسند کیا ہے۔ اب بھی ملک کو سنجیدہ ادبیات کی بہت ضرورت ہے جو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز

مجھے یہ معلوم کرکے صد درجہ خوشی ہوتی ہے کہ ادب اردو کی بہترین خدمت انجام دینے کے بعد بالآخر رسالہ "زمانہ" اپنا جوبلی نمبر شائع کر رہا ہے۔ میں اس کے مالک، مدیر اور تمام کارکنوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ رسالہ "زمانہ" آئندہ بھی اپنی مفید ادبی خدمات کا سلسلہ جاری رکھے گا۔

اس سے قبل دسمبر ۱۹۲۵ء میں "زمانہ" کے قومی نمبر کے اجرا پر موصولہ شدہ پیغام سے دو درج ذیل ہیں

شریمتی سروجنی نائیڈو صاحبہ

مجھے امید ہے کہ "زمانہ" ان تمام اخلاقی معیاروں کا گنجینہ ہوگا جو ہندوستان کی ملکی و تمدنی عروج کے لئے ضروری ہیں۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے شعر ذیل خاص طور پر بھیجا تھا

نہ چشم دگر نگاہے بر ہے کہ طے نمودم
بسراغ صبح فردا روشش زمانہ دارم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیا نرائن نگم

اپنے معاصرین کی نگاہ میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانہ اور ترقی اردو

سر شیخ عبدالقادر (بیرسٹرایٹ لا)

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

رسالہ زمانہ کا جشن جوبلی، ادب اردو کی ترقی کا جشن ہے۔ پچیس سال ہوئے یہ رسالہ کانپور سے شائع ہوا۔ اور آج اس کے پچیس سال کے کارناموں کی خوشی منائی جا رہی ہے۔ اس عرصے میں کئی رسالے نکلے اور کئی بند ہوئے طرح طرح کے مصائب اہل قلم پر آئے۔ بہت سے صحائف مالی مشکلات سے دب کر رہ گئے۔ مگر آفریں ہے منشی دیانرائن صاحب نگم کی ہمتِ مردانہ پر کہ ان کے عزم و استقلال میں فرق نہ آیا۔ اور انھوں نے تنہا اپنی کوشش سے ایک صدی کے چوتھے حصے تک نہ صرف اپنے لگائے ہوئے پودے کو زندہ رکھا بلکہ اس کی ایسی جانفشانی سے آبیاری کی کہ اس کے سب بہی خواہوں نے اسے بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھا۔ یہ رسالہ بہت سی اور خوبیوں کے علاوہ یہ امتیاز خاص رکھتا ہے کہ جس انداز سے نکلا تھا اسی انداز پر چل رہا ہے، اور اس کی صورت اور شبیہ دونوں اپنی وضع اصلی پر قائم ہیں۔ کئی باتوں میں ترقی ہوئی، بہ حیثیت مجموعی کسی پہلو سے تنزل نہیں ہوا۔ مغربی ممالک میں تو کئی رسالے اور اخبار ایسے ہیں جو ایک صدی سے زیادہ کی قدامت پر ناز کر سکتے ہیں۔ مگر ہندوستان میں ابھی یہ بات بہت کم اخباروں یا رسالوں کو نصیب ہے کہ عرصۂ دراز تک چلیں اور اپنا خاص انداز نباہ سکیں۔ اس لیے زمانہ ہر پہلو سے مبارکباد کا مستحق ہے، اور میں ادب اردو کے خادم کی حیثیت سے زمانہ کی خدمات کا اعتراف کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اردو نثر کا آغاز صحیح معنوں میں انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے ہے۔ گویا جب زمانہ نے جنم لیا تو ادب اردو کے حصہ نثر کی عمر پچاس برس کی تھی۔ گو اس وقت اردو نثر کی اکثر اعلیٰ تصانیف وجود میں آ چکی تھیں اور یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ اردو کی ادبیات کا ذخیرہ ہندوستان کی دیگر مروجہ زبانوں کے مقابلے میں کسی سے کم نہیں مگر اردو کی حالت کچھ متزلزل سی تھی۔ وہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ اور ان کے ملاپ کی بہترین یادگار تھی، محض اس لیے معتوب ہو رہی تھی کہ اس کے حروف فارسی کے حروف ہیں، یا مسلمان اس سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ لکھے پڑھے ہندو جو مدت سے اس زبان کو شمالی ہند کی مشترکہ مادری زبان سمجھتے تھے اور خوشی سے اس کی نظم و نثر پر طبع

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آزمائی کرتے تھے اس سے بیزار ہو رہے تھے۔ ہندی بھاشا اور خاص کر ہندی حروف کے رواج کی تحریک زور سے جاری تھی اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اہل قلم جو اردو میں اچھی مہارت رکھتے تھے اور جو اردو کے ذریعے سے اپنے خیالات بہت خوبی سے ظاہر کر سکتے تھے۔ اس زبان اور اس کے ادب سے کام لیتے ہوئے جھجکتے تھے۔ اس زمانہ میں مجھے یہ خیال آیا کہ اگر ملک میں ایسے ادبی رسالے ہوں جن میں ہندو مسلمان دونوں مضامین لکھیں، اور جھگڑے کی چیزوں سے بچ کر اپنی زبان کی مشترکہ ادبیات کی خدمت کریں تو ان سے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے رسالہ مخزن لاہور سے جاری کیا۔ اور یارانِ نکتہ داں کو صلائے عام دی کہ اس کے لیے مضامین لکھیں۔ جن مشہور انشا پردازوں کے نام ہندو اصحاب میں سے مجھے معلوم تھے ان سے خاص طور پر درخواست کی کہ وہ میرا ہاتھ بٹائیں۔ اور میں اُن احباب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس اہم ملکی اور قومی مقصد کی تکمیل میں مجھے امید سے بڑھ کر مدد دی۔ مگر جو چند گوہر نایاب اس بے غرضانہ سعی میں مجھے حاصل ہوئے اُن میں "زمانہ" خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اور میں اگر یہ کہوں کہ وہ اس سعی کا پہلا ثمر تھا تو بیجا نہ ہوگا۔ اور اب اس کی پختگی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی بجا طور پر دعوے کیا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف پہلا ثمر تھا بلکہ بہترین ثمر ثابت ہوا۔ مخزن کا ایک ورق جس پر چند نوجوان اور ہونہار طلبہ کی تصویریں یکجا چھپی تھیں جو اس وقت بی. اے کی جماعت میں اپنے اپنے کالجوں میں پڑھ رہے تھے۔ اس وقت بھی میری چشم تخیل کے سامنے ہے۔ اور کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ ان طلبہ میں ادب اردو کا وہ سچا خادم اور ملک کا سچا ہمدرد بھی تھا جس کا نام رسالہ زمانہ کے ورقِ اول پر پچیس سال سے لکھا جا رہا ہے۔

دیا نرائن صاحب نگم نے بی. اے پاس کرنے کے بعد سرکاری ملازمت یا وکالت یا کسی نفع بخش تجارت کی طرف رخ نہیں کیا، بلکہ صحافت اور اردو صحافت کی تکلیف دہ زندگی کو اپنے لیے پسند کیا اور آج پچیس سال کی محنت کے بعد وہ مالی اعتبار سے اس سے زیادہ طاقت نہیں رکھتے کہ نہایت سادہ طرز کی درمیانہ زندگی بسر کر سکیں۔ باوجود اس کے کہ اس اثنا میں انھوں نے روزانہ اخبار نکالا اور کتابیں بھی شائع کیں مگر انھوں نے وہ کام کیا جو کئی بڑے بڑے مدعیان حب وطن نہیں کر سکے۔ آج کل ایثار اور قربانی کے لفظ ہر ایک کی زبان پر ہیں اور بہت لوگ بہ بانگ بلند ایثار کے دعوے کرتے ہیں مگر چند روز کا ایثار چند روز کی قربانی اس کے ساتھ واہ واہ اور ہاے ہو ملک کو راہ ترقی میں بہت دور نہیں پہونچا سکتی اگر ملک بڑھے گا اور ترقی کرے گا تو ایسے دھن کے پکے شخصوں کی بدولت جو ایک شغل یا فن کو مستقل عزم سے اختیار کر کے اس کو اس طرح انجام دیں گے جیسے دیا نرائن صاحب نگم نے اردو ادب

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی خدمت کو نباہا ہے

شناورانِ محبت تو سینکڑوں ہیں مگر — جو ڈوب جائے وہ پکا ہے آشنائی کا

وہ فنا فی الادب کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

آؤ ذرا دیکھیں کہ زمانہ کی اس محنت سے کیا کیا نتیجے نکلے۔ کسی مہینے کا پرچہ اٹھا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مضمون نگاروں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ یوں تو جا بجا ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا جاتا ہے مگر زبانی باتوں کے علاوہ عملی کوشش اس اتحاد کے لیے کہاں ہو رہی ہے۔ ادبیات کا چبوترہ ہی وہ چبوترہ ہے جہاں ہندو مسلمان خلوص سے اور بلا تصنع یکجا کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور نگم صاحب کی کوششوں سے اوراق زمانہ پچیس سال سے کم از کم سینکڑوں اہلِ قلم کے اس ملاپ کی شہادت دے رہے ہیں۔ اس تفریق اور ضرب اور تقسیم کے زمانے میں جمع کا حساب صرف ادبی رسالوں ہی میں ملتا ہے، اور اس لیے یہ بہت قابلِ قدر ہے۔ اس رسالہ کے خریداروں میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ گو میرے نزدیک اغلب ہے کہ ہندوؤں کی تعداد کسی قدر زیادہ ہو گی۔ خیر زیادہ ہوں یا برابر۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پچیس سال سے اس رسالے کی بدولت اور بعض اور رسالوں کی بدولت جو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ کوشش سے چلتے رہے ہزاروں بلکہ لاکھوں ہندوؤں نے اردو مضامین نظم و نثر کا لطف اٹھایا اور اُن کی وہ مغائرت جو نہ سوچنے اور نہ سمجھنے کے سبب سے انھیں اردو جیسی لطیف زبان کی دلچسپیوں بلکہ اپنے ملک کے بہترین ورثہ سے محروم کر رہی تھی ہمدردی سے بدل گئی۔ یہ ایک ایسا بڑا کام ہے جس پر زمانہ جس قدر ناز کرے کم ہے اور اس سے نہ صرف زبان اردو ادب کی خدمت ہوئی بلکہ ملک کی عام بہتری کے لیے بھی یہ ایک معقول اور عملی خدمت ہے۔

اس رسالے کی کوششوں کا جو خالص ادبی حصہ ہے اس کا احسان بھی زبان اردو پر مستقل طور پر رہے گا۔ جن ادیبوں سے ہم رسالہ زمانہ کی بدولت روشناس ہوئے ان کی تعداد بہت ہے۔ مگر ایک نامور ادیب جن کا ذکر خاص طور پر کرنا واجب ہے پنڈت برج نرائن چکبست آنجہانی ہیں۔ افسوس کہ وہ ہمیں بے وقت داغ مفارقت دے گئے۔ مگر ان کے گراں بہا تنقیدی مضامین، ان کی دلکش نظمیں، ان کی شگفتہ تحریر نثر ہمارے پاس ہیں اور مدتوں ادب اردو کا مایۂ ناز رہیں گی۔ کاش وہ آج زندہ ہوتے اور جس رسالے سے انھیں ایسی گہری دلچسپی تھی، اس کی جوبلی دیکھتے۔

زمانہ کی خصوصیات میں ایک یہ بھی ہے کہ زمانہ میں سیاسیات کا پہلو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ اور اس کے مضمون نگار سیاسی امور پر بھی وقتاً فوقتاً لکھتے رہے جب تک کہ رسالہ مخزن میرے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہاتھ میں تھا کئی دفعہ نگم صاحب سے میری خط و کتابت اس سیاسی حصے کے متعلق ہوتی رہی۔ نگم صاحب چاہتے تھے کہ مخزن میں بھی کچھ حصہ سیاسیات کے لیے رکھا جائے، اور میں کہتا تھا کہ زمانہ کو بھی سیاسیات سے الگ رکھیں تو بہتر ہے۔ میرا خیال یہ تھا کہ کوئی چیز ایسی نہ ہو جو ادبی اتحاد میں خلل انداز ہو سکے ان کا منشا یہ تھا کہ ادبی خدمت کے ساتھ ساتھ سیاسی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے۔ میں اب تک ادبیات میں رسم احتیاط کا قائل ہوں مگر اس کے ساتھ "زمانہ" کو اس داد کا مستحق سمجھتا ہوں کہ اس کی تحریریں عموماً سنجیدہ اور متین رہی ہیں اور ان کا لہجہ ایسا رہا ہے جو ان لوگوں کو بھی ناگوار نہ ہو جو لکھنے والے کے ہم خیال نہ ہوں اور یہی رنگ ایک غیر جانب دار اور ادبی رسالے کے لیے موزوں ہے۔ گویا "زمانہ" نے سیاسیات میں سبق دینے کی کوشش کی ہے اور جانبدارانہ جنگ سے علیحدہ رہا ہے۔

زمانہ کی گذشتہ جلدوں کے مجموعے میں اردو کے دور جدید کی تازہ ترین ترقی کے نمونے نظم و نثر میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ اگر ان کو اکٹھا کیا جائے تو ادب اردو کا ایک بے مثل لبھانے والا گلدستہ تیار ہو جائے اور میں یہ تحریک پیش کرتا ہوں کہ اڈیٹر صاحب "زمانہ" ایک انتخاب زمانہ شائع کریں۔ تاکہ اردو نظم و نثر کے وہ لازوال ٹکڑے جو وقتاً فوقتاً زیب اوراق زمانہ ہوتے رہے ہیں۔ محفوظ ہو جائیں اور اس جشن جوبلی کی موزوں یادگار ہوں۔

⁂　⁂　⁂

مولانا حسرت موہانی

پیام محبت　　　اقتباس از یادگار نمبر ۱۹۴۳ء

منشی دیانرائن نگم سیاسی، سماجی و ادبی غرضکہ ہر حیثیت سے کم و بیش فقیر کے ہم خیال تھے اور اس ہم خیالی کی ابتدا آج سے چالیس سال قبل ہو چکی تھی وہ اس طرح کہ حسن اتفاق سے ہم دونوں کی سیاسی و ادبی زندگی کا آغاز ایک ہی زمانے میں یعنی ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء سے ہوا راقم نے علی گڑھ کالج سے اور منشی جی نے کانپور سے بی۔ اے کی سند تقریباً ایک ہی زمانہ میں حاصل کی اور گریجویٹ ہونے کے بعد دونوں نے نیشنل کانگریس کی ہمنوائی اختیار کی اگرچہ بعد میں فقیر کا سیاسی رجحان اعتدال پسند جماعت سے گذر کر لوکمانیہ تلک اور اس کے بعد سوشلسٹ بلکہ کمیونسٹ جماعت کی جانب ہو گیا اور منشی جی بدستور اعتدال پسند ہی رہے اور شعر کے معاملات میں ہمیشہ ایک دوسرے کے معاون بلکہ سرگرم عمل رہے حقیر کے قید و بند کے زمانہ میں مرحومہ بیگم حسرت کی زبانی مجھ کو رہائی کے بعد معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ منشی جی نے میری غیبت میں ان کے ساتھ برادرانہ خلوص و ہمدردی کا برتاؤ قائم رکھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو ہندی اور رسالہ زمانہ

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

اردو اور ہندی زبانیں دونوں ایک ہی ہیں ان میں وہی لوگ فرق سمجھتے ہیں جو ان دونوں کی باہمی مناسبت سے واقف نہیں ہیں یا ان دونوں کے میل جول پر غور نہیں کرتے۔

اردو ہندی کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لوگ اس پر غور کر چکے ہیں کہ اردو اور ہندی بلحاظ بول چال کے دونوں ایک ہی ہیں ان میں جدائی بہت ہی تھوڑی ہے البتہ رسم خط کا فرق ایک خاص فرق ہے مگر اس کے لیے ہندو مسلمان کا آپس میں بگاڑ ہونا بہت نامناسب ہے۔ مسلمانوں کو خیال کرنا چاہیئے کہ ہندی رسم خط ہندوستان کا ہے جو ہمارے ہندو پڑوسیوں اور ملکی بھائیوں کا رسم الخط ہے اس واسطے ہمیں بھی اس رسم الخط کی ترقی اور حفاظت میں حصہ لینا چاہیئے۔ ہندو بھائیوں کو یہ خیال کرنا چاہیئے کہ اردو زبان سنسکرت اور برج بھاشا سے نکلی ہے لہذا اردو کی ترقی و حفاظت بھی ایک لحاظ سے ہندی برج بھاشا ہی کی ترقی و حفاظت ہے۔ رہا اردو رسم الخط سو یہ بھی ہندؤں کو اجنبی اور غیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اردو کا رسم الخط اگرچہ عربی و فارسی سے نکلا ہے تاہم ایشیائی رسم الخط ہونے کے اعتبار سے ہندوستان کے ہندؤں کا حریف نہیں ہو سکتا۔

کانپور کا رسالہ زمانہ ان ہندو رسالوں میں ہے جنھوں نے سالہا سال کی عملی محنت سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اردو زبان محض مسلمانوں ہی کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندو قوم بھی اس کو اپنے ملک کی زبان کی طرح عزیز رکھتی ہے۔

مجھے ہندوستان کے اردو رسالوں میں ایسا کوئی بھی رسالہ معلوم نہیں ہے جس کے ہر نمبر میں مشترکہ طور پر ہندو مسلمان مضمون نگاروں نے سالہا سال لگاتار مضمون لکھے ہوں اور رسالہ زمانہ کی یہ خصوصیت اردو زبان کی تاریخ میں سب سے اونچے درجہ پر لکھنی چاہیئے۔

جب نان کوآپریشن کے زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دل اور ایک زبان ہو کر کام کر رہے تھے اس سے سالہا سال پیشتر کانپور کا رسالہ زمانہ ہندو مسلمانوں کا عملی اتحاد اور اردو لٹریچر کی اشاعت سے ثابت کر رہا تھا۔ اور جب ترک موالات کی تحریک کمزور ہوئی اور ہندو مسلمانوں کا ایکا ٹوٹا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور ہر قوم دوسری قوم سے دل برداشتہ ہو گئی۔ اور اعلے طبقوں سے لے کر ادنیٰ اور عوام تک کے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے حریف نظر آنے لگے اُس وقت بھی کانپور کا رسالہ زمانہ ہندو مسلم اتحاد کا لٹریری جھنڈا ہاتھ میں لیے میدان میں کھڑا رہا۔ اور منشی پریم چند جیسے بے تعصب ہندو اپنی قوم کو لٹریری تعصبات سے بچانے کے لیے قلم کی تلوار کھینچ کر میدان عمل میں آ گئے۔

اسی لیے میں یقین کرتا ہوں کہ کانپور کے رسالہ "زمانہ" کا یہ یادگاری نمبر ہر ہندو مسلمان کی ذاتی تقریب مسرت کی یادگار سمجھا جائے گا کیونکہ زمانہ نے بڑی سے بڑی آزمائش کے ایام میں اپنی لٹریری بے تعصبی کو فضا کے زہریلے اثرات سے بچانے میں کامیابی حاصل کی اور ثابت کر دیا کہ اردو زبان نہ ہندوؤں کی زبان ہے نہ مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ ہندوستانی اقوام کی مشترکہ زبان ہے اور اس کی ترقی و حفاظت میں دونوں قومیں شریک ہیں اور دونوں کو شریک ہونا چاہیئے۔ اور رسالہ زمانہ کی جوبلی ہندو مسلمانوں کے مشترکہ لٹریچر کی جوبلی ہے اور ہم سب جب زمانہ کو مبارکباد دینے کے لیے جمع ہوں تو درحقیقت اپنے آپ کو مبارکباد دینے والے ہوں گے۔

حضرت ضیا احمد بدنی

پیامِ محبت — از یادگار نمبر ۱۹۴۳ء

منشی دیا نرائن نگم نہ صرف کانپور کی سماجی و شہری زندگی میں نمایاں حصہ لیا کرتے تھے بلکہ خصوصیت کے ساتھ ہر اس تحریک میں پیش پیش رہتے تھے جس کا مقصد ہندو مسلم اتحاد ہوتا تھا۔ جو دوسرے لیڈر تقریروں کے ذریعے کرتے تھے وہی کام منشی جی نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے اصلاحی مضامین کے ذریعہ انجام دیا کرتے تھے۔

منشی دیا نرائن نگم کو اردو زبان سے والہانہ عشق تھا اردو کی جو شاندار خدمات انہوں نے چالیس سال کے عرصہ میں انجام دیں وہ تاریخ اردو میں ہمیشہ یاد رہیں گی۔

پروفیسر احتشام حسین صاحب

نگم صاحب کا تعلق ایک بھائی اور دوست کا ہوتا تھا ظاہر ہے کہ ہماری عمروں میں بڑا فرق تھا۔ یعنی جب انھوں نے "زمانہ" کو نکالا وہ عمر میرے لئے دس بارہ سال قبل مسیح کے برابر ہے لیکن رسالہ کی خدمت کے سلسلے میں وہ اس فرق کا خیال نہ کرتے تھے اور دوست کی طرح ملتے تھے۔ بیت زبانی گفتگو اور خط دونوں میں بزرگی کا لحاظ رکھتا تھا وہ اپنی گفتگو سے صحبت کو بالکل بے تکلف بنا دیتے تھے یہ نگم صاحب کی شخصیت کا ایک ایسا راز تھا جسے یقیناً میرے علاوہ ان کے اور نہ جانے کتنے دوستوں اور جاننے والوں نے سمجھا ہوگا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیانرائن ایک انسان اور دوست کی حیثیت سے

حق پرست

زمانہ فروری مارچ ۱۹۴۲ء

بھائی سری نارائن جی کے مسلسل اصرار سے مجبور ہو گیا ہوں کہ اس یادگار نمبر کے لیے کچھ لکھوں ورنہ میری کیفیت اس شخص کی سی ہے جس کے آنسو ابھی تھمے نہ ہوں اور اس سے مرقع کھینچنے کے لیے کہا جائے آنسوؤں کے دھندلکے میں کوئی کیسے مرقع کھینچے۔ میں نے تین چار بار کوشش کی، ناکام رہا، کئی کئی صفحے لکھے اور چاک کر دیے، آج کیا میں کامیاب ہو جاؤں گا؟ یہ شردھانجلی ہے جو مجھ کو چڑھانی ہے۔

محترم نگم مرحوم کے دوست احباب کے وسیع حلقے میں نسبتاً حال ہی میں محض ایک اتفاق سے داخل ہو گیا تھا۔ غالباً ۲۶ء کی بات ہے کہ میں کانپور ایک مقتدر عہدہ دار تعلیمات سے اپنے کچھ تعلیمی منصوبوں سے متعلق گفتگو کرنے گیا تھا، مجھ کو اپنے ان منصوبوں میں کامیابی کی کم توقع تھی، خیال صرف یہ تھا کہ اور کچھ نہیں تو تبادلہ خیالات ہی ہو جائے گا اور ایک نئی ملاقات حاصل ہو گی۔ ایک تعارفی خط بھی ساتھ لے لیا تھا، مگر ان بزرگوار سے مل کر جی مکدر ہو گیا۔ اخلاق نہ آداب، روکھے منہ ملے، پھیکی باتیں کیں، رخصت اس طرح کیا گویا بلا ٹالی۔

گرمی کے دن دوپہر کا وقت کانپور سے واپسی کے لیے پورا دن گاڑی کے انتظار میں گزارنا تھا، اجنبی جگہ تھی، کوئی آشنا سا نہ تھا جہاں بات چیت میں وقت کٹ جاتا۔ خیال آیا سالہا سال قبل عنفوان شباب میں مضمون نگاری کی کچھ دھن سمائی تھی اور "زمانہ" کے لیے کچھ لکھا، اڈیٹر صاحب نے میرے مضامین کو خوب بنا سنوار کر شائع کیا تھا اور میری حوصلہ افزائی یہ لکھ کر کی تھی کہ "آپ خوب لکھتے ہیں، مشق جاری رکھیے" مگر روزگار کی الجھن اور زندگی کی جدوجہد نے اس سلسلہ کو قائم نہ رہنے دیا، چلو آج اُن محترم ہی کو تلاش کریں، اس طرح محض دفع الوقت کے لیے تلاش کرتا کرتا منشی جی مرحوم کے دولت خانہ پہ پہنچا، کارڈ بھیجا، بلوانے کی بجائے خود باہر تشریف لائے اور اس گرم جوشی و خلوص سے مصافحہ کیا کہ کچھ حصہ بیشتر اس دوسری جگہ کی سرد مہری اور بدخلقی سے دل جو مرجھایا ہوا سا تھا کھل گیا۔ ہاتھ میں ہاتھ تھامے اندر لے گئے شکایت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی کہ اتنی دور سے آپ نے قدم رنجہ فرمایا، پہلے سے اطلاع بھی نہ دی کہ اسٹیشن پر کوئی پہونچ جاتا کہ اس گرمی میں مکان کی تلاش کی زحمت آپ کو گوارا نہ کرنی پڑتی۔ میں نے پوچھا آپ نے مجھ کو پہچانا بھی؟ فرمایا یہ کیا کچھ کم ہے کہ اتنے دور دراز فاصلے سے آپ میرے یہاں تشریف لائے ہیں۔ میں نے جب سالہا سال قبل کی خط و کتابت اور مضمون نگاری کی یاد دلائی تو فرمایا "پھر تو اور بھی گلہ کی گنجائش پیدا کر دی کہ اتنے طول طویل عرصہ تک آپ نے ہماری خبر نہ لی۔ پھر مختلف عنوانات پر گفتگو رہی اور ایسی دلچسپ اور سرگرم کہ وقت کا خیال ہی نہ رہا۔ اس روز تو کیا دوسرے روز بھی جانے نہ دیا۔ اس پہلی ملاقات ہی میں کچھ ایسا گرویدہ کر لیا کہ بچپن کی صحبتیں ماند پڑ گئیں۔ اس دن کے بعد پھر میری کوئی رخصت ایسی نہ گئی جبکہ میں کسی نہ کسی طرح ان کی خدمت میں کانپور نہ پہونچا ہوں۔ مرحوم سے میرے تعلقات بہت گہرے ہو گئے تھے۔

مرحوم سے میری یہ ملاقات میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے، اگر میں اپنی زندگی کے واقعات قلمبند کروں تو میری مایوسیوں، محرومیوں اور صدموں کے پس منظر پر یہ واقعہ ایسا معلوم ہوگا گویا ایک ایسے گہرے زخم پر مرہم تھا جو عرصہ تک عدم نگہداشت اور بے پروائی کی وجہ سے بگڑتا رہا ہے۔ آج قسمت نے بے رحمی سے اندمال کی یہ صورت بھی فنا کر دی۔

میں سمجھتا ہوں عام طور پر انسان دوستی اور محبت کے لیے ایسی شخصیت کا متلاشی رہتا ہے جس میں مردانہ اخلاق کے جوہر ہوں، جس میں راستی ہو، ہمدردی ہو، صاف باطنی ہو، وسیع النظری ہو اور مصیبت کے وقت بھروسہ بھی کیا جا سکے۔ کم از کم مجھ جیسے زخم خوردہ اور خیالی دنیا میں بسنے والے کو تو ضرور ان چیزوں کی تلاش رہتی ہے۔ منشی جی مرحوم میں یہ سب خوبیاں موجود تھیں، کچھ ایسا ذہن رسا اور ہمدرد ہمہ گیر طبیعت پائی تھی کہ وہ مخاطب کی دقتوں اور الجھنوں کی تہ تک فوراً پہونچ جاتے اور اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بحیثیت مصلاح کار وہ لاثانی تھے۔ تبادلۂ خیالات بلکہ بحث و مباحثہ کے لیے بھی نہایت موزوں طبیعت پائی تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو مخاطب کی جگہ تصور کر کے اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اگر اس میں نقص ہوتا تو بڑی خوبی سے سمجھا سکتے تھے، اور اگر اس کے استدلال میں واقعی اہمیت ہوتی تو وہ اس کو بخوبی محسوس کر سکتے تھے اس قسم کی گفتگو میں کم از کم مجھ کو کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ ان کی حیثیت فریقانہ ہو۔ وہ ہر مسئلہ میں مخاطب کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور اس طرح گتھیوں کو سلجھانے کی صورت پیدا کرتے تھے ظاہر ہے کہ خواہ کیسا ہی مضمون ہو ان سے گفتگو میں تلخی پیدا ہونے کا امکان نہ تھا، اور اس پر طرّہ یہ کہ طبیعت زندہ دلی سے معمور تھی۔ ہنسی دل لگی اور لطف و مذاق کا پہلو ہمیشہ موجود رہتا جو سنجیدہ سے سنجیدہ اور بوجھل سے بوجھل گفتگو کو ہلکا اور روشن کر دیتا تھا کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایک

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بہت خوبصورت منظر تاریکی میں مہیب نظر آرہا تھا اس پر کسی نے ایسی روشنی ڈالی کہ وہ اپنی تمام حسن و خوبی میں جگمگا اٹھا۔

محبت و مروت کے وہ پتلے ضرور تھے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی شخصیت اور آزاد رائے کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، جہاں کسی معاملہ میں اختلاف ہوتا وہ صاف صاف کہہ دیتے۔ کسی کی خاطر اپنی رائے دابتے نہ تھے۔ کمال یہ تھا کہ اس اختلاف یا آزاد رائے سے تلخی پیدا نہ ہوتی رواداری اور آزادی ان کا خاص مسلک تھا۔

یہی لیجیے کہ زبان سے متعلق میرے خیالات سے ابتدا میں انھیں اختلاف تھا، لیکن انھوں نے میرے مضمون کو شائع کر دیا گو خانگی خط میں مجھ پر اپنی رائے ظاہر کر دی۔ لیکن جب میں نے عرض کیا کہ اپنی کم مائگی کی وجہ سے غالباً میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح نہیں کر سکا، آپ کو میرے خیالات کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ تو وہ صبر سے میری باتوں کو سننے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اور بعد کے مضامین کی دل کھول کر داد دی، اور جا بجا میرے بیانات کی تائید میں فٹ نوٹ دیئے۔ اس کے باوجود یہ نہ تھا کہ وہ بالکل میرے ہم خیال ہو گئے ہوں، ایک ملاقات میں انھوں نے فرمایا کہ بھئی آپ تو دو اور دو چار کہتے ہو۔ آپ سے کوئی کیا اختلاف کرے لیکن میں اس وقت تک آپ کا ہم مسلک نہ ہو سکا۔ ممکن ہے اس کی تہہ میں زندگی بھر کا شغف اور دلبستگی ہو، وابستگیوں کے اثرات ہوں۔ لیکن صورت حال یہ ہے۔ ایک صاحب نے اردو اور ہندی سے متعلق ہندی کی تائید میں انھیں کچھ سخت تحریر لکھی تھی، اس کا بھی انھوں نے کشادہ پیشانی ہی سے جواب دیا کہ میں نے زندگی بھر اردو کی خدمت کی ہے، قدرتاً مجھ کو اس سے پریم ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مجھ کو ہندی سے اختلاف یا نفرت ہو۔

عام طور پر لوگ کم جانتے ہیں کہ ان کا اثر بڑے بڑے مقتدر انگریز عہدہ داروں پر بھی تھا، جو ہمیشہ انھیں وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ گورنمنٹ کی پالیسی پر برابر آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کرتے تھے۔ غالباً بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ انھیں "رائے صاحب" کا خطاب حاصل تھا۔ لیکن اس کو انھوں نے کبھی اپنا طرۂ امتیاز نہ سمجھا، نہ کبھی اپنے نام کے ساتھ استعمال کیا۔ ان کی پبلک سرگرمیاں ہمہ گیر تھیں۔ میونسپلٹی سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر جگہ کمیٹیوں میں ان کی مانگ تھی۔ اور وہ کشادہ پیشانی سے ہر ایک میں حصہ لیتے تھے۔

روزانہ ڈاک کا ایک انبار رہتا تھا، جس کا وہ دوست احباب سے بات چیت کرتے ایک طرح ہنستے کھیلتے تصفیہ کر ڈالتے۔ اس پر دو دو رسالوں کی ادارت، ترجموں کی تصحیح اور کاپی کی صحت بھی خود کرتے۔

ان علمی مذاق اور مصروفیتوں کے باوجود وہ ہر وقت ہر شخص کے لیے میسر تھے۔ ادنیٰ سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ادنیٰ آدمی کی ان تک رسائی تھی، محلہ کا ٹانگہ والا ہو یا کنجڑہ، دوکاندار ہو یا مزدور، جب تک ان کے سامنے اپنا دکھڑا نہ رو لیتے چین نصیب نہ ہوتا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ بچے، جوانوں کے ساتھ رنگین مزاج رعنا، غریبوں کے ساتھ غریب، امیروں کے ساتھ خوددار تھے۔ اتنا ضرور تھا کہ بوڑھوں کی صحبت میں کبھی کبھی ان پر بڑھاپا نہ جھلکا، حالانکہ عمر اب غالباً ساٹھ سے اوپر ہو چکی تھی۔

بیوی کے انتقال نے مگر غضب ڈھایا، اس انتقال کے بعد کی دیوالی پر میں مرحوم کے ساتھ ہی تھا۔ بڑی رات تک ہم دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے مرحومہ کی تصویریں مجھ کو دکھلائیں اور نہ جانے کب کب کے تذکرے کیے۔ غم و رنج سے دونوں کے دل لبریز تھے، میری بہت عزیز ہمشیرہ کا انھیں دنوں ناگپور میں انتقال ہوا تھا۔

کچھ ہی دنوں بعد میری رفیق زندگی نے بھی مجھ کو دائمی مفارقت دی، میں نے سوچا تھا کہ وظیفہ لے لوں اور زندگی کے کاروبار کا رخ بدل دوں، منشی جی سے اس بارے میں بڑی تفصیلی خط و کتابت رہی ہے۔ انھیں کے مشورہ سے میں ابھی طوق غلامی اپنے گلے میں ڈالے ہوا ہوں کہ پہلے بچوں کے فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں۔

لیکن اب، میں پھر تنہا ہوں۔ کوئی نہیں جس سے دل کی داستان کہہ سکوں۔

۞ ۞ ۞ ۞

حضرت روش صدیقی

پیام محبت — اقتباس از یادگار نمبر ۱۹۴۴ء

اردو زبان ہندوستانی تمدن کی ایک مشترکہ دولت ہے "زمانہ" اس دولت بیدار کی حفاظت و توسیع میں ہمیشہ سرگرم رہا ہے۔ ایوان اردو منشی دیا نرائن نگم کی ان قابل احترام اور لائق تحسین خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جو انھوں نے اردو کی اشاعت و حفاظت کے سلسلے میں انجام دیں۔ کچھ عرصہ سے ہمارے ملک میں ہنگامہ دوستی کی ایک ایسی لہر طوفانی رفتار کے ساتھ دوڑ رہی ہے جس نے اردو ہندی کے جھگڑے کو ایک بھیانک شکل دے کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اس طوفانی لہر نے محبت و آشتی، صلح پسندی و رواداری کے ساحل کو جگہ جگہ سے شکستہ کر دیا ہے۔ بہت سے بہی خواہان وطن اس لہر کے زور و شور میں بہ نکلے، یگانوں نے شیوہ بیگانگی کا برملا اظہار کیا مگر اس طوفان و تلاطم میں بھی بہت سے محبان وطن نہ صرف خود وقار و متانت کے ساتھ اس ہنگامہ خیزی و تفرقہ پرستی سے بیزار رہے بلکہ دوسروں کے لیے بھی ان کی شخصیت ایک عمدہ مثال قائم کرتی رہی۔ محترم منشی صاحب بھی اسی کاروان محبت و آشتی میں نمایاں طور پر شامل تھے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نگاہِ خلوص میں

زمانہ، فروری، مارچ ۱۹۴۳ء

جوش ملیح آبادی

نہ پوچھ، ذوقِ سفر کو میرے، کہ اکثر اس نے، ہم آب و گِل میں
کبھی بیابانِ غم میں پہونچا، کبھی شبستانِ جم کو دیکھا

کبھی برہمن کا روپ بھر کر، کبھی حقِ آگاہ شیخ بن کر
ضیائے شمعِ حرم کو جانچا، فروغِ بیت الصنم کو دیکھا

کبھی تفکّر کی روشنی میں، فلک کو کھولا، زمیں کو پلٹا
کبھی صحافت کے آئینے میں عرب کو پرکھا عجم کو دیکھا

کبھی لیا درسِ زندگانی، کبھی سُنی موت کی کہانی
کبھی کتابِ وجود کھولی، کبھی نصابِ عدم کو دیکھا

کبھی حوادث کے عقدہ ہائے فساد انگیز پر نظر کی
کبھی زمانے کی کاکلوں کے جنون خیز پیچ و خم کو دیکھا

کبھی دماغِ گرہ کشا نے اساسِ علم و عمل کو تولا
کبھی نگاہِ کرشمہ بیں نے بُطونِ دیر و حرم کو دیکھا

کبھی جنوں خیز جھٹپٹے میں ترنّمِ آہِ پرفغاں کی
کبھی طلوعِ سحر کی رَو میں تبسمِ چشمِ نم کو دیکھا

کبھی طرب میں نگہ اٹھا کر، کبھی تفکّر میں سر جھکا کر
فلک کی رفعت نظر میں تولی زمیں کے جاہ و حشم کو دیکھا

کبھی تمدن کے فرشِ گل پر ٹھہر کے وحشت کی لگاوٹ
کبھی معیشت کے راستے سے پلٹ کے ناز و نعم کو دیکھا

کبھی یمِ بے کراں کے اندر ملا فقط اک حقیر قطرہ
کبھی ہر اک قطرۂ تنک میں خروشِ صد موجِ یم کو دیکھا

کبھی کلاہِ شہنشہی میں نظر پڑا اک کاسۂ گدائی
کبھی سرِ کاسۂ گدائی، شکوہِ طبل و علم کو دیکھا

کبھی لگاتار ارتقا کی تلاشِ پیہم کے سلسلے میں
سُراغِ جہل و جنوں کو پایا، بنائے سیف و قلم کو دیکھا

کبھی عداوت کے حاملوں کی ہر اک ادا پر نگاہ ڈالی
کبھی محبت کے رہروؤں کے ہر ایک نقشِ قدم کو دیکھا

خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے کہ اس پراگندہ زندگی میں
خیالِ ہر خیر و شر میں ڈوبا، مآلِ ہر بیش و کم کو دیکھا

مگر مجھے یہ بڑی خوشی ہے کہ اس تماشائے نو بہ نو میں
مری نگاہِ خلوص میں نے دیا نرائن نگم کو دیکھا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پیام محبت

چند پیام و چند اقتباسات یادگار نمبر زمانہ فروری مارچ ۱۹۴۳ء درج ذیل ہیں :۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ پی۔ سی

آج تک شاید ہی زمانہ کا کوئی نمبر ہوگا جو میں نے ذوق و شوق سے نہ پڑھا ہو۔ منشی دیانرائن نگم فدائے اردو تھے اور ان اصحاب کو جو اردو کی ترقی و عروج کے خواہاں ہیں اس کے اعتراف کے سوا چارہ نہیں کہ منشی صاحب نے اردو کی بیش بہا خدمت کی ہے۔ پرچہ کا معیار ہمیشہ بلند رہا ہے

وہ اچھے دوست، شیریں گفتار، اور سنجیدہ متفکر تھے۔ میں ان کے اعلیٰ دماغی اوصاف کا ہی نہیں بلکہ ان کے خوش اخلاقی کا بھی گرویدہ تھا۔

حضرت جگر مرادآبادی

منشی دیانرائن نگم میرے بہت ہی دیرینہ اور مخلص دوستوں میں سے تھے۔ وہ نہایت درجہ روشن خیال، بلند نظر اور وسیع القلب انسان تھے۔ وہ نہ صرف ادیب کامل تھے بلکہ ادب و شعر کے دیوانہ بھی، جہاں کہیں انھیں ادبی حسن نظر آجاتا تھا وہ تمام تر محو تاثرات ہو جاتے تھے۔ ان کا خلوص اور ان کی محبت محدود نہ تھی۔ اختلافِ عقائد کے باوجود احباب کے لئے وہ ایک عاشقِ بیتاب تھے۔ وطن اور اہل وطن کا درد رکھتے تھے اور روح کی گہرائیوں میں شدید گداز۔ اردو ادب کی خدمت انھوں نے جس خلوص و ایثار سے کی وہ انھیں کا حصہ تھا۔

پنڈت امرناتھ جھا وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی

پہلی ملاقات میں منشی دیانرائن نگم کے حسنِ اخلاق و زندہ دلی نے مجھے مسحور کر دیا۔ اس وقت سے آخر دم تک وہ مجھ سے نہایت شفقت و مہربانی سے پیش آتے رہے۔ بیسویں صدی کے اردو لٹریچر کی کوئی تاریخ اس بیش بہا علمی و ادبی خزانہ کو نظرانداز نہیں کر سکتی جو زمانہ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ حیدرآباد

زبان اردو کا کوئی شیدائی ان بیش بہا خدمات کو جو منشی دیانرائن نگم نے اپنی زندگی میں انجام دیں فراموش نہیں کر سکتا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ڈاکٹر ٹر ایم حفیظ اسید پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ،

زمانہ کی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں بڑی حد تک چالیس برسوں کے درمیانی عرصہ میں واقع ہونے والے تمام ادبی علمی اور لسانی تغیرات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ زمانہ نے ہر حیات پرور رجحان اور زندگی بخش ادبی اور علمی تحریک کو لبیک کہا اور اسکی نشوونما میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔
منشی جی کا اعلیٰ دماغ جو ایک فطری صحافتی قابلیت کا حامل تھا اس حقیقت کو صاف طور پر محسوس کرتا تھا کہ صحافت قومی اور ملی زندگی صحیح ترجمان اور اس کا آئینہ ہے اس لئے اسے ہر قسم کی رجعت پسندی تنگ نظری، جمود و عصبیت سے نجات دلاکر اسے قومی اور ملی حیات کو تر و تازہ کرنے اور ترقی پسند سماجی طاقتوں کو آگے بڑھانے میں مدد کرنی چاہئے۔

جناب جعفر علی خاں صاحب اثر

مجھے یہ بھی علم ہے کہ اردو کی خدمت میں منشی دیا نرائن نگم کی سرگرمی بعض لوگوں کو سخت گراں گزری تھی۔ منشی جی سے وعدے کئے گئے اور لالچ دیا گیا کہ اگر زمانہ کی جگہ ہندی کا رسالہ نکالا جائے تو نقصان کی نہ صرف تلافی ہو بلکہ فائدہ متصور ہے مگر ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی۔ میر نے غالباً ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے ؎ برسے اگر تلوار سر وں پر منھ موڑیں زنہار نہیں
سیدھے جانے والے اُدھر کے کس کے پھیرے پھرتے ہیں

جناب خواجہ محمد شفیع صاحب اردو مجلس دہلی

زمانہ میں ایسی ہستیاں نادر الوجود ہیں، ہمہ تن خُلق و خدمت، مجسم علم و ادب۔ یہ زمانہ کی خوش بختی تھی کہ ایسے صاحب قلم نصیب ہو گئے۔
بہترین انشا پرداز، نہایت بلند پایہ ادیب، انتہائی نکتہ سنج و نکتہ رس، اور پھر مشرقی تہذیب کا مکمل نمونہ دیکھکر بیاختہ منھ سے نکلتا تھا ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جناب ششیور پرشاد صاحب منوّر لکھنوی

ہر طرح سے مکمل ہر خدمت ادب تھی — قائل نہیں جو ان کا ہے کون ادیب ایسا
بزم ادب میں اب تک مجھ کو نظر نہ آیا — دل کا امیر ایسا پھر بھی غریب ایسا

جناب طالب چکوالی صاحب

گمنامی کی تاریکی سے کتنوں ہی کو تو نے نکالا ہے — ترکیب سکون فطرت کو سانچے میں ادب کے ڈھالا ہے
محبوب "زمانہ" تھا تیرا، اس کی خاطر کیا کچھ نہ کیا — رنگین روشن امیدوں پہ مستقبل کا بلیدان کیا

جناب فیاض الدین احمد خاں صاحب فیاض

ادب کا خادم خاموش وہ بانی "زمانہ" کا — دلوں پر نقش جس کا اب کبھی احساں ہوتا جاتا ہے
ادیب شُستہ ذوق و با محبت بے ریا تھا وہ — قلم جس کا بیاں لکھنے میں گریاں ہوتا جاتا ہے

جناب بابو کرشن گوپال مغموم صاحب

وہ سلاست وہ روانی کا مرقع اس کی نثر — کلک گوہر بار کے وہ دلنشیں نقش و نگار
اس کی وہ طرزِ نگارش دل پسند و دلنشیں — اس کا اسلوب بیاں شستہ متین و باوقار

جناب سید محمد عباس صاحب

رواں ز حسنِ ادب شد بہ بارگاہ کرشن — ادیب و عاقل و خوش فکر و صاحبِ ادراک
بکار وردِ دلِ دیگراں مسیحا بود — مگر ز دردِ دلِ خویش زود گشت ہلاک

جناب فاروق محشر بدایونی صاحب

اس کو اللہ نے بخشی تھی وسیع النظری — منھ سے ہر بات نکلتی تھی محبت سے بھری
اس کے اندازِ تکلم میں تھی وہ جادو اثری — اس کے جذبات کی دنیا تھی تعصب سے بری
پاک دل، پاک زباں، پاک خیالات تھا وہ
زود رس، زود خرد، زود کمالات تھا وہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیانرائن نگم

اپنے مضامین کے آئینہ میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

عرض حال

اقتباس زمانہ، جنوری و جولائی ۱۹۰۴ء و اپریل ۱۹۳۷ء

جنوری ۱۹۰۴ء

زمانہ کی ایڈیٹری میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے وہ ناظرین پر سرورق کے ملاحظہ سے ظاہر ہو گئی ہو گی۔ یہ تبدیلی بڑے پس و پیش کے بعد منظور کی گئی ہے۔ اپنی کم مائگی، بے علمی کا یقین مانع تھا کہ ایسا اہم کام اپنے ذمہ لیا جائے مگر شوق اکتساب اور جوش خدمت ملکی اور خیال اصلاح رسالہ ہذا نے بالآخر فتح پائی اور نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ کی تربیت کم سے کم کچھ دنوں کے لیے اپنے سر لے لی گئی۔

بعد صلاح و مشورے کے یہ طے پایا کہ زمانہ محض شاعری و انشا پردازی کے ہاتھ گرد نہ کیا جائے زمانہ میں وسیع ترقی زبان کا خیال لیے ہوئے۔ اصلاح، خیالات، درستی مذاق، توسیع معلومات، ترقی اتحاد وغیرہ کا زیادہ خصوصیت سے التزام کیا جائے۔

جولائی ۱۹۰۴ء

اس عرصہ میں رسالہ نے جو حیثیت پیدا کر لی ہے وہ بہر صورت لائق ہے۔ ہم نے اس رسالہ کی روش اردو کے تمام موجودہ پرچوں سے جدا رکھنی چاہی تھی۔ شکر ہے کہ ہم اپنے اس ارادہ کو نبھا سکے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جس طرح ہم نے ہندو مسلمان یا اور دیگر قوموں میں کبھی فرق نہیں سمجھا اسی طرح ان سب قوموں کے معززین اور عمائد منتخب اور مقتدر اصحاب نے یکساں فراخ حوصلگی اور بلند نظری کے ساتھ ہماری حوصلہ افزائی فرمائی ہم یہاں پر ان عنایت آمیز الفاظ کو جو ہمارے لیے بہترین انعام کے بجائے ہیں نقل کرنا اصولاً نہیں پسند کرتے۔

ہم ملک کے روبرو ایک جامع رسالہ پیش کیا چاہتے ہیں جو محض ہماری علمی ضرورتوں کو پورا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ عملی باتوں کا بھی لحاظ رکھے جو رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ قدم بقدم چلے اور اہل ملک کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرے اور انھیں ایک نیک اور دور اندیش ناصح اور صلاح کار کی طرح ہر معاملہ میں مشورہ دے۔ خطروں سے متنبہ کرے اور دنیا کے فریبوں سے بچائے۔ واقعات عالم اور ان کے مصنوعی پہلو سے آگاہ کرے۔ باہمی میل جول اور قومی اخوت اتحاد کے اصولوں کو محبت اور صداقت کے ساتھ ذہن نشین کرے اور حالات اور واقعات زمانہ کو ناصح مشفق کے دل مورخ دور اندیش کی آنکھ اور فلسفی نکتہ رس کے دماغ سے دیکھ کر اور غور کر کے ان کے بہترین معنی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور اندرونی مطالب کی تلقین کرے اور روزمرہ غانہ جنگیوں کے شور وغل میں حل طلب معاملات اور مسائل پر کسی ایک فریق یا جماعت کا طرفدار بن کر نہیں بلکہ تمام ملک اور سب قوموں کا پنچ اور منصف ہو کر اہل ملک کو اتفاق اور اتحاد کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرے اور اپنے پاک فرائض ادا کرنے میں ضمیر اور اپنے خدا کی خوشنودی کے سوا اور کسی گروہ یا فرقہ کی ناراضی کا خوف نہ کرے ساتھ اس کے حتی الوسع رنج پہونچانے غلط فہمی پیدا کرنے اور دوسروں کی تضحیک یا تحقیر سے ہمیشہ قطعاً پرہیز کرے کیونکہ گو ہم اصول کے معاملہ میں دوعملی اور ہر فریق کو خواہ مخواہ خوش رکھنے اور اس طرح سستی ہر دلعزیزی حاصل کرنے کی کوشش کے سخت خلاف ہیں تاہم ہم سب پر سب کے خیالات اور اعتقدات کا پاس اور احترام واجب سمجھتے ہیں اور ملک کے پرچوں کو اس ذمہ داری اور فرض لازمی سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ ہم ذاتیات پر بحث کرنے اور ایک دوسرے پر رد و قدح کو جس میں کہ ملک کے پریس کا ایک حصہ اس ناعاقبت اندیشی کے ساتھ مصروف ہے۔ انسان اور خدا دونوں کے روبرو ایک گناہ عظیم سمجھتے ہیں اور ان سے بچے رہنے کی کوشش کو ہم سب پر یکساں واجب اور لازم سمجھتے ہیں۔

اپریل ۱۹۳۷ء

اخبار نویسی کا پیشہ ایک مقدس اور عظیم القدر پیشہ ہے۔ جو لوگ روپیہ پیدا کرنا چاہتے ہیں انھیں اس طرف متوجہ نہ ہونا چاہیے۔ البتہ ملکی خدمت کی اس معزز پیشے میں کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا میدان نہایت وسیع ہے، اور ہمت و استقلال اور دیانت سے کام کرنے والوں کو ضمیر کی خوشنودی اور قلب کا اطمینان حاصل ہونے کے علاوہ دنیا میں بھی وقعت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ جب ہی ممکن ہوگا جب ہم آرام طلبی کی زندگی کو خیرباد کہہ کر خودداری، ایثار اور مستقل مزاجی سے راہ راست پر چلتے رہیں۔ جو صاحب اس پیشے کی طرف یہ سمجھ کر رجوع ہوں کہ تھوڑی سی محنت میں انھیں ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے گی، تھوڑی سی کوشش میں وہ آسانی سے قومی لیڈر بن جائیں گے انھیں جلد یا دیر میں مایوسی سے سامنا ہوگا۔

دوسروں سے مالی امداد کی امید بھی فضول ہے۔ کسی زمانہ میں بعض اخبارات دیسی ریاستوں سے حصول زر کی امید رکھتے تھے۔ اب بعض اصحاب کو سیاسی اقتدار کے دلدادہ لیڈروں اور دیگر رہنماؤں سے نفع اٹھانے کی فکر رہتی ہے۔ حال میں صوبہ کے ایک مقتدر رہنما نے مجھ سے شکایت کی کہ ان سے کئی اردو اخبار نویس پریس وغیرہ کے بہانے سے مالی امداد کے طالب ہوئے۔ ان باتوں سے اپنی عزت کھونے کے سوائے اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ الٹا جماعت کے عز و وقار میں فرق آتا ہے۔ اس لیے جو صاحب اخبار نویسی کے پیشہ کو اختیار کریں وہ یہ سمجھ کر اس میں داخل ہوں کہ ابھی کم از کم ایک پشت تک اور اس پیشہ میں بمشکل بسر اوقات ہو سکے گی۔ ہاں قومی خدمت کے دلدادہ اخبار نویسوں کی خدمت مقبول عام ہوگی اور انھیں اطمینان قلب اور روحانی مسرت بھی حاصل ہوگی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مطالعۂ رامائن

زمانہ اکتوبر و نومبر ۱۹۰۷ء

زمانہ کے ایک گذشتہ نمبر میں رامائن کے اخلاقی پہلو پر بحث کرتے ہوئے یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی تھی کہ اس کی روحانی دلکشی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس میں "انسانی تقدس اور دلی پاکیزگی"۔ "ظاہری خوبی اور" "باطنی نیکی کی" "انتہائی حدیں کھینچ دی گئی ہیں۔ اصل قصہ ایک بے نظیر قصہ ہے جس میں فرائض دنیوی کے بہترین معیار کے مکمل نمونے پیش کیے گئے ہیں رامائن کا معیار سرشت انسانی کی تکمیل اور ترقی کی انتہائی منزل ہے۔ اس پر لطف یہ کہ سارے قصے میں انسانی حتی الامکان واقتدار نظر انداز نہیں ہوا۔ پھر بھی تمام قصے میں گناہ کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ افراد قصہ میں چاہے جس کے قول و فعل کو جانچیے۔ کہیں گناہ کا شائبہ تک نظر نہ آئے گا۔ شروع سے آخر تک آپ کو صرف بہترین قسم کے انسانوں سے سابقہ رہے گا۔ مختلف طبقے کے آدمی ملیں گے مگر جہاں تک اصل قصہ کا تعلق ہے سب اپنے اپنے درجے اور حیثیت میں گناہ سے پاک اور معصیت سے بری۔ بظاہر خراب سے خراب شخص بھی اپنے اصول اور دھرم پر ثابت قدم اور ایک مسلمہ ضابطۂ اخلاق کا پابند ہے جس کی بدولت کسی پر نکتہ چینی کی گنجائش نہیں رہتی۔ راجہ دسرتھ اور رانی کیکئی پر رقیق القلب حضرات بہت کچھ معترض ہوتے ہیں کہ سری رام چندر جی کی ناحق جلاوطنی انھیں کی کمزوری اور فتنہ پردازی سے ہوئی۔ مگر یہ الزامات مضمون مذکور میں کافی غور اور بحث کے بعد بالکل بے بنیاد ثابت ہو چکے ہیں۔ اب ہم اس مضمون میں چند دیگر افراد قصہ کے طریق عمل پر غور کر کے دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اس معیار کے مطابق اترتے ہیں یا نہیں اور کسی طرح قابل ملامت ہو سکتے ہیں یا کل یا تو نہیں بالکل بری الذمہ ہیں۔

جلاوطنی کے متعلق کیکئی جی کے بعد بادی النظر میں سب سے پہلا قصوروار ان کی پیش خدمت منتھرا کا معلوم ہوتا ہے۔ جس نے کہ اس تمام فتنہ و فساد کی آگ لگائی تھی۔ اسی نے شہر میں جشن تخت نشینی کی عظیم الشان تیاریاں دیکھ کر رانی کے کان بھرے تھے۔ اسی نے رشک و حسد کے جذبات ابھارے تھے۔ اسی نے کیکئی کو اس مخالفت پر آمادہ کر کے ان کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مقصد برآری کی تدبیر بتلائی تھی۔ اور راجہ کے پرانے عہد کی یاد دلائی تھی۔ غرض تمام طوفان اسی کا اٹھایا ہوا تھا۔ مگر یاد رکھیے کہ منتھرا رانی کی خاص نوکر تھی نہ کہ راجہ دسرتھ کی۔ راجپوتی محلات کے اندرونی انتظام کا جن لوگوں کو پورا حال معلوم ہے وہ جانتے ہیں کہ رانیاں اپنے خانگی انتظامات میں بالکل آزاد اور خود مختار ہوتی ہیں اور اسی سبب سے کثرت ازدواج پر بھی ان کی شان اور توقیر میں فرق نہیں آنے پاتا۔ غرض اپنے آقا کی خیر خواہی منتھرا کا فرض مقدم تھا۔ اور اسے اس نے اپنی عقل اور امکان کے بموجب انجام دینے کی کوشش کی۔ رانی کیکئی کو ترغیب دیتے وقت اس کو اپنے ذاتی نفع کا خیال یا کسی انعام و اکرام کا لالچ نہ تھا۔ اس قسم کا خیال اس تحریک اور کوشش کی تہ میں کبھی اور کسی وقت چھپا نہیں رہا۔ منتھرا کی صرف ایک ہی غرض اور غایت تھی۔ یعنی اس کی مالکہ کو عروج اور انکے بیٹے کو راج نصیب ہو۔ اس کی چھوٹی عقل کہتی تھی کہ دوسری رانیوں کے راج کنور گدی پائیں گے تو بھرت جی کو ان کا تابع اور مطیع ہو کر رہنا ہوگا پھر اس کی رانی کی بھی وہ وقعت کیسے باقی رہے گی جس پر آج انھیں اس قدر ناز ہے۔ اسنے جو کچھ کیا اپنی عقل کے بموجب حق نمک ادا کیا۔ ایک بات اور قابل لحاظ ہے کہ منتھرا کو رام چندر جی کی جان جوکھم مدنظر نہ تھی۔ انھیں آزار پہونچانے کا اسے چنداں خیال نہ تھا۔ بلکہ صرف بھرت جی کی تخت نشینی کی فکر میں تھی۔ اس کے متعلق تمام کارروائیوں میں اس کی نیت پاک رہی اسی سے منتھرا پر ہم ذرا دیر کے لیے بھی کوئی الزام قائم نہیں کر سکتے ہیں۔

اب راون کو لیجیے جس سے بن باس میں رام چندر جی کو ایسی سخت جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کرنا پڑی۔ بظاہر اسباب یہ سب سے بڑا جابر اور گنہگار معلوم ہوتا ہے کیونکہ سیتا جی کے قید کرنے کا عذاب اس کی گردن پر ہے۔ مگر اس میں بھی کیا اس نے جادۂ حق سے باہر قدم رکھا؟ اس کی حقیقی بہن زار و قطار روتی ہوئی اس کے سامنے آتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے ایک راجکمار نے جن سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی اس کی ناک کاٹ لی جس سے اب وہ ہمیشہ کے لیے دنیا میں منھ دکھلانے کے قابل نہیں رہی۔ اب فرمائیے کہ بادشاہ درکنار ایک معمولی آدمی بھی ایسی بات پر خاموش رہ سکتا ہے؟ راون نے جائز غصے کی حالت میں انتقام لینے کی قسم کھالی۔ ظاہر ہے کہ اس ارادے کے وقت وہ دنیا کے بہترین جذبات سے متاثر تھا۔ ایک اعلیٰ درجہ کا غصہ اس کے دل و دماغ پر قبضہ کیے ہوئے تھا۔ سیتا جی کو اٹھا لیا اور اپنے طلائی محل میں نظر بند کر دیا۔ مگر ان کے ساتھ دو بدو کبھی کسی گستاخی کا مرتکب نہیں ہوا۔ تمام زمانہ قید اور قید کے تمام مصائب پر سیتا جی کو یہ ایک بڑے اطمینان کی صورت تھی کہ ان کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ساتھ گستاخانہ جبر و ظلم نہ ہوگا۔ ورنہ ان کی زندگی ناممکن ہو جاتی اور انھیں اپنی آبرو بچانے کے لیے خودکشی کے سوا اور کوئی تدبیر باقی نہ رہتی۔ مگر اس کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اور یہ راون کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ جس کا ہمیشہ جب تک کہ روئے زمین پر رام و راون کی لڑائی کا تذکرہ باقی رہے گا نیکی کے ساتھ ذکر ہوتا رہے گا۔ سچ پوچھئے تو راون عجیب مجموعۂ صفات تھا۔ کیسے اصول کی اور سچی لڑائی لڑتا تھا کہ دلوں میں کدورت نام کو نہ تھی ایک دفعہ رام چندر جی کو ایک مذہبی رسم ادا کرنے کی ضرورت پڑی جس کی اعانت کے لیے راون ہی سب سے موزوں شخص تھا۔ اس کی بلند نظری اور روشن خیالی دیکھیے کہ باوجود جنگ رام چندر جی کی نوید پر فوراً آن موجود ہوا۔ اور کل رسوم بطریق مناسب ادا کر کے لوٹ آیا۔ ایک یہ وقت ہے کہ آپس میں بھائی بھائی عناد باہمی اور مخالفت دلی کا نمونہ بنے ہوئے ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے محو کرنے پر تلے ہوئے ہیں آہ زمانے نے کیسا پلٹا کھایا ہے۔

راون کی ہمت اور شجاعت کی بھی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ کیسی بہادری سے لڑتا ہے اور کس استقلال سے اپنے ارادے اور حوصلے پر آخر دم تک قائم رہتا ہے۔ خاندان کے سب سورمیر میدان جنگ میں کام آ چکے ہیں۔ فوج کے بڑے بڑے سورما سردار اور نبرد آزما سپہ سالار تہ تیغ ہو چکے ہیں۔ عزیز و اقارب یار و مددگار اب کوئی تسلی دینے کو موجود نہیں ہے۔ تمام عالم سیاہ و تاریک نظر آتا ہے۔ میدان جنگ لاشوں سے پٹا ہوا ہے اور ہر طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ مگر وہ بات کا دھنی جوانمرد اور اولوالعزم بہادر ہمت نہیں ہارتا کیونکہ اس نے اس کارِ عظیم کو اپنے بل اور قوت پر اٹھایا ہے نہ کہ دوسروں کے بھروسے پر۔ رانی سمجھاتی ہے "کہ جنگ سے باز آؤ۔ اس میں بجز نقصان اور تباہی کے کیا ہاتھ لگا سیتا جی کو واپس کر کے صلح کا پیغام بھیجو۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ اپنا دم ہے تو اس کے ساتھ سب کچھ پھر مہیا ہو جائے گا۔ ایک ناروا بات پر ضد کا نتیجہ اچھا نہیں۔ اور جان بوجھ کر موت کے منھ میں ہاتھ دینے سے کیا فائدہ۔ اور نہ سہی تو بقائے نسل ہی کے خیال سے صلح کر لو۔ آخری فقرہ ایسا نہ تھا کہ کسی اور وقت میں راون یا اس کے عہد کے کسی شخص پر اثر کیے بغیر رہتا۔ مگر وہ کہتا ہے کہ اب صرف سیتا جی کا معاملہ نہیں رہا۔ اب جنگ نے دوسری اور زیادہ اہم صورت اختیار کر لی ہے۔ تھوڑے دنوں پہلے جو ایک خانگی جھگڑا تھا وہی اب ایک ملکی مناقشہ ہو گیا ہے۔ اس وقت ملک کی آزادی معرض خطر میں ہے۔ شکست کے معنی اب ملک پر غیروں کے اقتدار کے ہوجائیں گے۔ اور یہ راون کے جیتے جی کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی ایک آخری کوشش باقی ہے ملکی آزادی پر وہ اپنی جان قربان کر دے گا۔ اپنی جان اور ملکی عزت۔ وہ اپنی زندگی تک قائم اور برقرار رکھے گا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھائی بیٹوں کا سر کٹوا کر موت کے ڈر سے صلح کر لینا نامردی ہے۔ دوسرے دل پر آفت نازل کر کے اپنی جان بچانے کی فکر کرنا سخت بے غیرتی ہے۔ ملکی حمیت سے اسے اپنی جان عزیز نہیں ہے اور نہ اس کے لیے وہ کوئی خلاف شان صلح کر سکتا ہے۔ غرض بیوی کی منت و سماجت بیکار جاتی ہے۔ اور وہ کمال خندہ پیشانی اور مستعدی سے مردانہ وار اپنی آخری جنگ کے لیے تیار ہوتا ہے۔ عام خیالات کے بموجب طرح طرح کی بدشگونیوں کا سامنا ہوتا ہے۔ بچی کھچی فوج میں سب کا دل بیٹھا جاتا ہے۔ مگر وہ اپنی بات اور اپنے ملک کے لیے سر بکف ہے۔ اور ایک لحظ کے لیے بھی پس و پیش کو راہ نہیں دیتا ہے۔ اور کسی طور پر ہراس و مایوسی کا شکار نہیں ہوتا ہے اور آخر کار اپنے خاندانی ننگ و ناموس اپنی ذاتی شان و شوکت اور ملکی عزت و حمیت کے خاطر داد شجاعت دے کر اپنی جان دے دیتا ہے۔ آج کے دن رام لیلاؤں میں "راون کی چھبے پکارنے والے اس کے اعلیٰ جوہروں کو اکثر بھول جاتے ہیں اور اپنی ناواقفیت اور نادانی میں اسے ہمہ تن عیب اور گناہ مجسم سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر چشم بصیرت سے دیکھنے والے اس کی شرافت اور شجاعت حب الوطنی اور بلند حوصلگی کے قائل ہو کر اس بڑی غلطی کے لیے جس کا اسے ایسا بھاری خمیازہ اٹھانا پڑا دل سے افسوس کرتے ہیں۔ ایک عصمت کی دیوی کی توہین کا دل میں خیال لانا بھی ایک ایسا گناہ کبیرہ ہے کہ جس کی تلافی دنیا میں کسی طرح ممکن نہیں۔ جس کی پاداش میں دنیا کی بڑی سی بڑی طاقتیں بھی نیست و نابود ہو کر رہیں گی۔ راون دراصل اس معاملے میں حق بجانب نہ تھا۔ گو ہم اسے صاف طور پر کسی جرم کا ملزم نہیں قرار دے سکتے۔ غرض یہی وجہ ہے کہ اسے بالآخر شکست فاش کا منھ دیکھنا پڑا۔ لچھمن جی کی ایک جائز سزا کی مخالفت میں وہ رامچندر جی سے ناحق جنگ اور سیتا جی کی ناروا دل آزاری کر بیٹھا۔ جو کسی طرح جائز نہ تھی۔ علم و فضل میں راون اپنے وقت کا یگانہ روزگار تھا۔ اس پر بھی لازمہ بشریت سے غلطی کھا ہی گیا۔ تاہم جہاں تک رامائن کے قصے کا تعلق ہے اس کا دامن ایک سفید چادر کی طرح داغ معصیت سے بالکل پاک و صاف اور بے لوث ہی رہا۔ اثنائے جنگ میں اس سے ایک واقعہ بھی خلاف آئین جنگ یا دستور شرافت سرزد نہیں ہوا۔ ہنومان جی کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ بیجا نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ ایک خفیہ جاسوس کی حیثیت سے لنکا میں گرفتار کیے گئے تھے اور اسے ان کی سزا کا پورا حق حاصل تھا۔

ممکن ہے کہ اس تمام فتنہ و فساد کے اصل سبب سے متعلق کسی کو کوئی شک ہو اور لکشمن جی کا سوپ نکھا کی ناک کاٹنا فی زمانہ ایک سخت اور بیجا بات سمجھی جائے مگر یاد رہے کہ اس کے لیے انھیں بے ضرورت اور بے موقع بہت زیادہ اشتعال کا موقع

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیا گیا تھا۔ سروپ نکھا جذبات نفسانی سے مغلوب ہو کر آپ سے بہ کمال بے غیرتی پیش آئی تھی۔ اور مکرر سہ کرر سمجھانے اور دھمکانے پر بھی اپنے بیہودہ خیالات اور لغو حرکات سے باز نہ آئی تھی۔ لچھمن جی عملی نیکی اور روحانی پاکیزگی کی زندہ مثال تھے۔ ایک بدمعاش عورت کی بے حیائی کی تاب نہ لا سکے اور ایک تنبیہ کو اس کے اعمال بد کی سزا دیئے بغیر نہ رہے۔ آخر آپ شاہزادے تھے۔ اخلاقی مجرموں کی بیخ کنی آپ کا مورونی فرض اور اس وقت کے رسم ورواج کے مطابق آپ کا مقدم کام تھا۔ اور آپ بذات خود جلاوطن بھی نہیں کیے گئے تھے بلکہ محض بہ تقاضائے محبت رام چندر جی کے ساتھ ہوئے تھے۔ پھر آپ حقوق سے فائدہ اٹھانے میں کیوں پس وپیش کرتے۔

٭ ٭ ٭

سوشل ریفارم اور اصلاح تمدن کی تحریک کو ہندوستان میں جاری ہوئے تقریباً دو پشتیں ہو چکیں۔ یوں تو ہندوؤں میں تقریباً ہر قرن اور ہر زمانے میں بڑے بڑے ریفارمر پیدا ہوتے رہے ہیں۔ لیکن برطانوی سلطنت کے قائم ہونے اور انگریزی تعلیم جاری ہونے کے بعد ملک کے سیاسی و تمدنی حالات و ضروریات میں جو کمی کسی کی بدولت رونما ہوئی اور اس کی بدولت جو مسائل اہل ملک کیلئے پیدا ہو گئے ان کے حل کرنے کے لیے راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند، جسٹس رانا ڈے وغیرہ نے اپنے اپنے وقت میں جو کوششیں کیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس انقلاب حکومت کے ساتھ مشرق و مغرب کی تہذیبوں میں جو تصادم ہوا اس کی ٹکر سے اتنی مدت کے بعد ابھی تک ہم کو سکون و قرار نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ یہاں پر یہ یاد دلانا بیجا نہ ہوگا کہ کسی قوم کو جب تک اس کی قوت عمل میں کافی انحطاط اور کمی اور اس کے عام اخلاق و معاشرت میں افسوسناک تنزل نہیں ہوتا محکوم بننے یا پست حالت میں رہنے کی لعنت نصیب نہیں ہوتی۔ اور ہندو تو اپنے عروج کے زمانے میں بھی دنیوی ترقی کے بنیادی اصولوں سے بہت کافی غفلت برت چکے ہیں مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حالات تبدیل ہونے پر وہ اپنی ہستی قائم رکھنے کی ضروری فکر ہمیشہ کرتے رہے ہیں لیکن اتحاد باہمی یا قومی تنظیم یا سیاسی دانشمندی کے اصولوں پر کاربند ہونے پر انھوں نے ہمیشہ لاپرواہی برتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ایک ناقابل انکار واقعہ ہے کہ متواتر بیرونی حملوں اور غیر ملکی تہذیب و تمدن کی مسلسل یورشوں کے باوجود اس عظیم الشان ملک میں ابھی تک ہندوؤں کی تعداد غالب ہے، اور بقول شاعر؎

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری

دسمبر ۱۹۳۳ء

از انشائے نگم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مسلم خیالات میں ایک اہم تبدیلی

زمانہ مارچ ۱۹۱۳ء

اسلامی سلطنتوں پر آج کل مصیبت کی جو گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں اُن کا اثر نزدیک و دور تمام عالم کے مسلمانوں میں نمایاں ہے۔ مذہب اسلام قیدِ زمان و مکان سے ہمیشہ آزاد رہا ہے مسلمانوں کی اخوت اُن کے جمہور پسند مذہب کا ایک جزو اور ضروری جزو ہے۔ اسلام میں حب الوطنی کا درجہ مذہب پرستی سے ہمیشہ دوسرے درجے پر رہا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہندی مسلمانوں نے کبھی صدیوں تک رہنے سہنے کے باوجود ہندوستان کو اُس معنے میں اپنا وطن اور اپنا دیس نہیں سمجھا جس میں ہندو ہمیشہ سمجھتے آئے ہیں۔

تعلقات وطن پرستی پر ہمیشہ انھوں نے اپنے عالمگیر مذہب کے حقوق کو ترجیح دی ہے یہ تو پیروان اسلام کی ایک عام دماغی حالت ہے۔ اب اس کے بعد بیس برس ادھر مسلمانان ہند کے تعلیم و تربیت پر نگاہ ڈالو تو ہندوؤں کی پولٹیکل تحریکوں سے ان کے علیحدگی کے اسباب صاف نظر آنے لگتے ہیں۔

انگریزی تعلیم میں وہ ہندو بھائیوں سے پیچھے اور بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ شاہی وقت کا خمار اُن کے طبیعتوں پر باقی تھا۔ سلطنت اودھ وغیرہ کی عیش پرستیوں نے قومی معاشرت کو بگاڑ دیا تھا۔ اور لوگ طبعاً کارزار ہستی کی جد و جہد سے گھبرانے اور آسانی کی زندگی کو محنت و مشقت پر ترجیح دینے لگے تھے۔ نئے حکمرانوں نے ترقی و کامیابی کے جو موقع دیئے ان سے انھوں نے کچھ تو اپنی سستی اور تن آسانی سے اور کچھ تعصب و تنگ خیالی اور کوتہ اندیشی سے فائدہ اٹھانے میں دیر اور بہت دیر کی۔ غدر کے بعد عرصہ تک وہ خصوصیت سے بدگمانی کے شکار رہے۔ مگر مسلمان کیا جیتے جاگتے انسانوں کی کوئی جماعت ہمیشہ تک عضو معطل ہو کر نہیں رہ سکتی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ انگریزی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ سے وہ ترقی کی دوڑ میں ہمسایہ قوموں سے کتنے پیچھے رہے جاتے ہیں۔ انھیں محسوس ہوا کہ اس قدر پیچھے رہ جانے پر اب حکام وقت کی رضاجوئی کا خیال ہر وقت پیش نظر رکھنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے دوسری طرف حکام بھی نکتہ خیال سے مسلمانوں کے تالیف قلوب کی فکر میں تھے۔ ملکی حالت کا پورا اندازہ انھیں مل چکا تھا۔ جہانبانی اور حکمرانی کے اصولوں میں وہ پہلے ہی سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ماہر کامل تھے چند ہی برس میں وہ ہمارے تمام کمزوریوں کے اصلی راز یعنی نفاق باہمی سے واقف ہوگئے۔ غرض اگر مسلمانوں کو ایک سچے لیڈر اور فدائے قوم کی ضرورت تھی تاکہ ان کی حالت کے اصلاح میں ان کو مدد دے تو گورنمنٹ کو بھی ایک خیر خواہ اور مصلحت اندیش مدبر درکار تھا۔ جو مقتضائے وقت کا خود ہی اندازہ کرے جو قوم کی حالت اور گورنمنٹ کی ضرورت کو محسوس کرکے دونوں کے منشاء دلی کو پورا کرے۔ جب کوئی اہم کام درپیش ہوا ہے پردۂ غیب سے کوئی نہ کوئی مرد نکل ہی آیا ہے اور اس وقت بھی مسلمانوں میں سرسید احمد خاں جیسا پاک نفس بیدار مغز لیڈر پیدا ہوگیا جس نے مسلمانوں کو نہ صرف اعلیٰ انگریزی تعلیم کے جانب رجوع کیا بلکہ حکام ملک کا بھی انھیں منظور نظر بنا دیا۔ اس وقت سرسید کے تمام خدمات کا مشرح ذکر اور ان کے نتائج کا ریویو ہمارے مضمون کے دائرہ سے باہر ہے کیونکہ ہم اُن حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں جنپر ہماری رائے میں سرسید کی پالیسی مبنی تھی اور جن کے بدولت وہ قوم میں ایسی مقبول اور اپنے حصول مدعا میں اس قدر کامیاب ہوگئی۔ اکثر اہل ملک سرسید کو تنگ خیال تصور کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔ اکثر لوگ ان کی دور اندیشی اور بالغ نظری پر بھی شک کرتے ہیں اس لیے کہ اُس نے کانگریس کے اعلیٰ مقاصد سے اختلاف کیا اکثر برادران قوم اسے خوشامد پسند اور زمانہ ساز قرار دیتے ہیں کیونکہ اپنی قوم کے لیے اس نے گورنمنٹ کی تائید اور حکام کی تقلید ہی ضروری خیال کی۔ مگر یہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ ہندوؤں سے اس کے ذاتی تعلقات ہمیشہ اچھے رہے۔ سرکاری ملازمت کے زمانہ میں بھی وہ بیجا تعصب کے لیے مشہور نہ تھا۔ اپنے کالج کو اصولاً اس نے ہندوؤں پر بند نہیں کیا۔ ہندوؤں سے امداد لینے میں بھی اس کو کوئی پس و پیش نہیں ہوا اور ہندو رؤسا کی اس نے کالج میں عزت کی۔ ملازمین میں بھی ہندو مسلمان میں اس نے کوئی فرق نہیں برتا۔ سرسید کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی میں بھی شک بیجا ہوگا۔ کانگریس کے وجود کے قبل وہ خود کانگریس کی بڑے بڑے اصولوں کی پر زور تائید کرچکا تھا۔ وہ بابو سریندر ناتھ بنرجی کے ابتدائی ملکی کوششوں میں شریک ہوچکا تھا بعض ملکی مسائل پر خود اس کی تقریریں پڑھو تو یہ خیال بالکل دور ہوجاتا ہے کہ سرسید ملکی ضرورتوں سے واقف نہ تھا۔ خوشامد کا الزام بھی ایسا ہی بیجا ہے کیونکہ تمام عمر اس نے کسی ذاتی معاملہ کے متعلق کسی حاکم کی خوشامد نہیں کی۔

ایک دفعہ اس نے لفٹنٹ گورنر صوبہ جات متحدہ سے ملنا اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ انھوں نے صوبہ کے تعلیمی حالات کے متعلق اس کے ایک ایسے واقعاتی بیان کی تردید کردی جس کا وہ چشم دید شاہد تھا اور جس کا اس نے اپنے دورہ انگلستان کے زمانہ میں اعادہ کیا تھا۔ انگلستان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے واپسی پر جب سر سید لفٹننٹ گورنر سے ایک عرصہ تک نہ ملے تو ان کے پرائیوٹ سکریٹری نے حضور صوبہ کی طرف سے ایک خط لکھ کر اس کا سبب دریافت کر کے اشتیاق ملاقات ظاہر کیا۔ مگر سر سید نے اس کا جواب یہ دیا کہ حضور نے میرے بیان کو غلط اور دروغ سمجھا اس لیے میرا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا بالکل فضول اور عبث ہے جو شخص ایسے الفاظ کہنے کی ہمت رکھ سکے خوشامد اس کے خمیر میں نہیں ہو سکتی۔ سر سید کے تمام کارناموں کو غائر نظر سے دیکھو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ خوشامد اس کے مزاج میں نہ تھی مذہبی مسائل میں اس کے خیالات بالکل ریڈیکل تھے۔ قرآن کی اس نے جو تفسیر لکھی ہے اُس سے اس اندرونی جذبات کا صاف پتہ ملتا ہے۔ کیا کوئی خوشامد پسند شخص اپنے قوم کے مذہبی جذبات سے بے پرواہ ہو کر تمام مسلمانوں کے مخالفت سے بے اثر رہ کر۔ اپنے بادیان دین اور حاملان مذہب کے کفر کے فتووں کو نظر انداز کر کے۔ ایسے دلیرانہ نتائج پر پہونچ سکتا۔ اور پہونچ کر قائم رہ سکتا ہے۔ ہم نے ان غلط خیالات کی تردید اس تفصیل کے ساتھ محض اس لیے کی ہے کہ اکثر اوقات ان کی وجہ سے ہم لوگ ملکی حالت پر غلط قیاسات قائم کر لیتے ہیں جن سے ہم نہ صرف ملکی تحریکوں کی اندرونی اہمیت سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں بلکہ اپنے پولٹیکل مشکلات بھی کامیابی سے حل نہیں کر سکتے۔ صحیح تشخیص کیئے بغیر ملکی امراض کا اصلی معالجہ نہیں ہو سکتا۔ کسی زبردست سے زبردست لیڈر کو خام کار تنگ خیال اور زمانہ ساز کہہ دینا آسان ہے۔ کسی قوم کو متعصب اور خوشامد پسند سمجھ لینا سہل ہے۔ اور اس سے سطحی نظر سے دیکھنے والوں کی فوری تسلی بھی ہو جاتی ہے مگر صورت حال آنکھوں سے ہمیشہ چھپی رہتی اور ملکی مسائل کی عقدہ کشائی دور ہوتی جاتی ہے۔

بہر حال سر سید ایک یگانہ روزگار مدبر اور سچا فدائے قوم تھا۔ اس کی نظر لمبی تھی مگر مدبری کی بیڑیاں اُس کے پاؤں میں پڑی تھیں وہ فلسفی اور ادیب تھا۔ مگر اس سے بھی سوا وہ ایک تجربہ کار مدبر اور باعمل ریفارمر تھا۔ وہ وقت کی ضرورت نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ وہ اپنے برادران ملت کی پستی سے چشم پوشی نہ کر سکتا تھا۔ قوم کو جس حالت میں اس نے پایا اس کا صحیح علاج اس کو تعلیم اور صرف تعلیم میں ملا۔ اور تعلیم ہی کے اشاعت پر اس نے اپنا سارا زور ختم کر دیا۔ تعلیم ہی کے سروسامان مہیا کرنے میں اس نے اپنی زندگی تمام کر دی اسی کا ہو رہا اور اس کے سامنے تمام منصوبے اس نے بالائے طاق رکھ دیئے۔ اس کے سامنے اس نے کل امور ملتوی کر دیئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ فیصلہ نظر بحالات درست نہ تھا۔ گو اس پر عمل اس سے بدرجہا بہتر طریقے سے ہو سکتا تھا۔ گو اس کا عمل درآمد نقیض باہمی پیدا کیے بغیر ہو سکتا تھا۔ مگر ایک پرجوش لیڈر جو سر تا پا ایک ہی خیال میں محو ہو جاتا ہے افراط و تفریط سے کیسے بچ سکتا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور سر سید سے بھی قومی جوشش میں کانگریس وغیرہ سے علانیہ مخالفت کی زبردست غلطی سرزد ہو گئی۔ ان کو وقت نہ تھا۔ خود نہ شریک ہونے قوم کو ضرورت نہ تھی۔ وہ اس میں شرکت کی اسے صلاح نہ دیتے۔ مگر اس تحریک کا مضحکہ اڑانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے اعلیٰ ترین اصولوں کی مخالفت اور ایسی بیجا سرگرمی سے مخالفت کی کیا حاجت تھی۔ خصوصاً جبکہ انھیں اصولوں کی وہ خود کسی زمانے میں حمایت کر چکے تھے۔ ممکن ہے کہ ایک انسٹیٹیوشن کی ذمہ داری کا بوجھ اس کے لیے سرکاری مراعات کی خواہش یا حکام وقت کے رویہ کے تقلید کی ضرورت نے انھیں مجبور کر دیا ہو۔ ممکن ہے کہ راجہ شیو پرشاد اور منشی نولکشور کے طرز عمل نے سر سید کے دل و دماغ پر اثر ڈالا ہو۔ جو کچھ ہو سر سید ہی سے ہندو مسلمان کے پولٹیکل نفاق کی بنیاد پڑی۔ حکام نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور قوم نے کبھی بدیہی ترقی سے متاثر ہو کر سر سید کے ہر قول و ہر عمل کو شاہراہ ترقی کا ایک سنگ نشان سمجھا۔ اور جانشینان سر سید نے کورانہ تقلید میں قوم کو بھی مات کر دیا۔ یہ اصحاب یہ بھول گئے کہ سر سید انسان تھے اور کوئی انسانی پروگرام مستقبل کی تمام تغیر و تبدل پر حاوی نہیں ہو سکتا ہے اور نہ کوئی خاکہ گرد و پیش کے حالات سے قطع نظر کچھ کام آ سکتا ہے۔ جس طرح بچپن کے کپڑے جوانی میں کام نہیں آ سکتے اسی طرح زمانہ بے عملی کا دستور العمل ملکی خیالات کے نشو و نما پانے اور تعلیمی ترقی حاصل کرنے کے بعد بیکار بلکہ مضر ہو جاتا ہے مگر لیڈران علیگڈھ جواب تمام مسلمانان ہند کے مسلمہ پیشوا ہو گئے ہیں۔ اپنی آنکھ بند کیے ہوئے۔ سر سید کے نقش قدم پر نظر جمائے خاموش ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ نواب محسن الملک نے محض حکام کی خوشامد ہی مناسب سمجھی۔ نواب وقار الملک بیشک ایک آزاد خیال اور دلیر لیڈر ہیں ان کا دل و زبان بھی ایک ہے۔ وہ سیاسی امور میں بھی اہل الرائے ہیں۔ آزادی سے غور اور بیباکی سے اظہار خیالات کر سکتے ہیں لیکن مذہبی رنگ ان کی طبیعت پر غلبہ پائے ہوئے ہے۔ علی گڈھ کالج میں ان کا دور مذہبی سرگرمی کا زمانہ رہا۔ حکام میں وہ اپنے راست خیالی اور آزاد پسندی کی وجہ سے ایسے مقبول نہیں ہوئے جیسے کہ پیشرو نواب محسن الملک تھے۔

آزاد خیالی اور صاف گوئی میں وہ سر سید سے بہتر ہیں مگر پولٹیکل خیالات میں ان کا خیال اتنا اونچا اور اتنا دور نہیں جا سکتا۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ مسلم لیگ کے بانی ہونے کی حیثیت سے ہندو مسلمانوں کے پولٹیکل اتفاق کی کوئی صورت ہی اُن کے ذہن میں نہیں آ سکتی۔ وہ ایک دفعہ صاف کہہ چکے ہیں کہ سب اغراض متحد ہونے اور کل پروگرام ایک ہو جانے پر بھی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ رہ کر اپنی پولٹیکل جدوجہد جاری کرنا چاہیئے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہر شخص ایک حد تک جا سکتا ہے اور اس کے آگے نہیں۔ نواب وقار الملک صاحب اپنے تمام قابل عزت اوصاف کے باوجود ہندو مسلمانوں کے پولٹیکل اتفاق کے امکان کا خیال ہی دل میں نہیں لا سکتے۔ ان کے علاوہ جو رہنمایان علیگڈھ ہیں وہ یا تو کالج کے کاموں میں اس قدر منہمک ہیں کہ دوسرے مسائل سوچنے کا ان کو وقت ہی نہیں ملتا یا حکام سے ایسے وابستہ ہیں کہ اپنی آزادانہ رائے رکھتے ہی نہیں اور انچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم کے مصداق ہیں۔ ان سب صاحبوں کے دماغ خیالات جدید کے اثرات سے بالکل محفوظ ہیں ان کے دلوں پر ان کا عکس تک نہیں پڑتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو حکام سے سوا قوم کے خیالات تنگ دائرہ محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی وقار کے کمی سے بھی گھبراتے ہیں اور کسی ایسی تحریک میں جس سے ان کے رسوخ اثر یا دباؤ میں سر مو فرق آئے قطعاً کوئی مدد نہیں دے سکتے۔ مگر قوم ان کی کب پابند رہ سکتی ہے اور تعلیم کی ترقی اپنا اثر کیے بغیر کب مان سکتی ہے۔ تصنع دائمی قائم نہیں رہ سکتا۔ ملمع کی چمک پائدار نہیں ہوتی۔ تمام ملک میں پولٹیکل خیالات کے نشو و نما نے مسلمانوں کے دماغ کو بھی منور کر دیا۔ کانگریس اور اس کے رہنماؤں کی ملکی خدمتوں نے ملکی ترقی کی شاہراہ تیار کر دی ہے۔ اس کے اعلیٰ اصولوں نے جب حکام وقت تک کو قائل کر دیا تو مسلمان بھائی کا انھیں تسلیم کر لینا کیا تعجب کی بات ہے۔ خدا کی مصلحت میں کس کو دخل ہے برائی سے بھلائی پیدا کر دیتا ہے۔

ایران کی بربادی۔ ترکی کی مصیبت نے ہندی مسلمانوں پر قوموں کے عروج و زوال کا راز ظاہر کر دیا وہ اب ملکی اتفاق کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ تعلیم نے ان کے حوصلے بھی بڑھا دیئے ہیں اور اب وہ دوسری قوموں کے ساتھ ملک کے انتہائی ترقی دینے میں اپنا حق ادا کرنے کے لیے مستعد نظر آرہے ہیں۔ گذشتہ کرسمس میں مسلمان بھائیوں کے جو قومی جلسے لکھنؤ میں ہوئے ان سب میں نئی اسپرٹ پورے طور پر نمایاں رہی قوم نے صاف طور پر جتا دیا کہ وہ کارزار ہستی میں مردانہ وار جد و جہد کے لیے تیار ہے۔ اب وہ محض اپنے قوت بازو سے اپنا جائز حق لینا چاہتی ہے۔ اب وہ کسی رعایت کے بل پر جینا پسند نہیں کرتی۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں آنریبل مسٹر آفتاب احمد کی اس تجویز کا رد ہونا کہ گورنمنٹ قومی تعلیم کے لیے بڑے بڑے عطیے دینے والے اصحاب کی خطاب وغیرہ سے قدر دانی فرمائے نہایت پر معنی ہے۔ مفت جبری تعلیم کے متعلق اس وقت پریسیڈنٹ جلسہ نے اختلاف رائے کیا تھا مگر اس سے تمام ہال میں ایک جوش سا پھیل گیا اور ہر طرف سے ہی آوازیں آنے لگیں کہ یہ آپ کی ذاتی رائے ہے۔ یہ صرف آپ ہی کا خیال ہے۔ جلسے کو اس سے واسطہ نہیں۔ گورنمنٹ سے طلب امداد کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

متعلق بھی حاضرین کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ غرض پرانے پرانے لوگوں کا جنھوں نے شروع سے آج تک کانفرنس کے کُل جلسے دیکھے ہیں۔ بیان ہے کہ خودداری اور حب الوطنی کی ایسی زبردست لہر پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ کے جوش و خروش کا عالم ہی نرالا تھا۔ انتظامی اختیارات گورنمنٹ کے سپرد کرنے کے سب مخالف تھے۔ بعض تقریروں میں یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ایسی یونیورسٹی کو ہمیں لات مار دینا چاہیئے۔ لیڈروں کو جمہور اسلام سے وعدہ کرنا پڑا کہ وہ گورنمنٹ سے مسلم یونیورسٹی کے متعلق گفتگو کرتے وقت قوم کے عام خیالات کا پورا لحاظ رکھیں گے اور اس میں کسی خوشامد یا خودغرضی کا دخل نہ ہونے دیں گے۔ مسلم لیگ کا جلسہ بھی نہایت اہم تھا آخرکار مسلمانوں نے بھی سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری کو اپنا معیار قائم کر لیا۔ یہ ہی کانگریس کا مقصد و مدعا ہے۔ اب دونوں جماعتوں میں اصولاً کیا فرق رہا۔ اس اہم جلسے کی مفصل کارروائی اخبارات میں درج ہو چکی ہے۔ سب تقریریں بہت آزادی سے ہوئیں۔ ایک نامور اہل الرائے نے تو دولت مند رہنمایان قوم کی طرف سے اشارہ کر کے صاف کہہ دیا کہ اس وقت قوم کے بے ریا خدمت کی ضرورت ہے۔ ہم کو بے غرض

رہنما درکار ہیں جو صفائی اور سچائی سے ملکی ضروریات کی حکام وقت سے وکالت کریں اب وہ زمانہ گیا جب خود پسند خود پرست اور خودغرض لیڈروں کا دور دورہ تھا۔ جب تمام قوم کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ جس راستے پر چاہتے تھے قوم کو ڈال دیتے تھے۔ اب قوم بجائے خود سوچنے سمجھنے لگی ہے۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اب وہ طفل تسلیوں سے نہ مانے گی۔ اب اصل اور نقل میں اُسے فرق معلوم ہو گیا۔ اب جو لیڈر ذاتی اغراض کے بنا پر اُسے دھوکا دینے کی جرأت کریں گے انھیں وہ اس طرح اپنے درمیان سے نکال دیگی جیسے دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینکدی جاتی ہے۔ لیڈر سب سنتے اور سر دھنتے رہے مگر کیا وہ اپنے فرائض ادا کریں گے؟ اس وقت قوم کا نہیں بلکہ لیڈروں کی آزمائش کا وقت ہے قوم تو بیدار ہو چکی۔ اب برسوں کی گہری نیند سوئے ہوئے لیڈروں کے جاگنے کا وقت آ گیا ہے۔ کیا یہ اس عہد جدید کے پیام امید کو گھر گھر جا کر سنائیں گے؟ یا اپنے غفلت ہی میں مست رہ کر قوم کو دھوکہ دیتے اور خود دھوکا کھاتے رہیں گے مسلمان بھائیوں سے ہم صرف یہ کہیں گے کہ نئی اسپرٹ سے موثر ہوئے ہیں تو اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔ ملکی خدمت کی اہمیت سمجھیں اور قومی ضروریات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر جو فیصلہ کریں اس پر ہمت و استقلال سے قائم رہیں اور ملک کی ترقی کے لیے برادران وطن کے دوش بدوش ہو کر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جدوجہد کریں۔ نمائشی لیڈروں کو چھوڑ کر روشن خیال رہنماؤں کی بھی ان میں کمی نہیں ہے سر آغا خاں۔ آنریبل مسٹر مظہر الحق۔ ڈاکٹر اقبال۔ شمس العلما مولانا شبلی۔ نواب وقار الملک کے ہوتے ہوئے ان کے درمیان قحط الرجال کی شکایت نہیں ہو سکتی یہ وہ لوگ ہیں جن پر اعتماد کر کے مسلمان دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ پھر کیا جرأت اور ہمت اور سچائی کے ساتھ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی ان کا فرض نہیں۔ حالات موافق ہیں قوم تیار ہے آئینی جدوجہد کا سامان موجود ہے۔ خاکہ کھینچا ہوا۔ اور منزل مقصود بھی اب صاف اور واضح ہے۔ اب صرف ایک قدم اور اٹھانے کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جب کانگریس اور لیگ کا نصب العین ایک ہے تو پھر ان کے درمیان دوئی کا پردہ کیوں باقی رہے۔ بہتر ہو دونوں یک جان دو قالب ہو گئے مگر اس سے بھی بہتر ہوا اور ملک کے نصیب جاگ اٹھیں اگر دونوں تحریکیں یک جان و یک قالب ہو جائیں فقط

ع تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

⁂ ⁂ ⁂

کانگریس کے صدارت کا سہرا بھارت ماتا (مادر ہند) کے بہترین فرزندوں ہی کے سر پہ بندھا ہے۔ اب تک اس جلیل القدر قومی عہدے کے لیے صرف انھیں بزرگوں کا انتخاب ہوا ہے جو کیا بلحاظ علم و فضل اور کیا باعتبار حق خدمت اور قومی محبت ملک کے چشم و چراغ ہیں۔ انھیں اصحاب کی کوشش اور رہنمائی کی بدولت اب تک کانگریس پروگرام کو اہل ملک کے مشترکہ خیالات اور عام خواہشات کے مطابق ہونے کا بجا دعویٰ رہا ہے۔ اس ملکی تحریک کی تاریخ میں ہر سال نئی قسم کی ضرورتیں، اور ذمہ داریاں پیش آتی رہی ہیں ہر دفعہ نئی مشکلات اور نئے خدشوں کا سامنا رہا ہے۔ مگر تائید غیبی کہیے یا کانگریس کی خوش نصیبی سمجھیے کہ اس کے صدارت اور رہبری کی اہم اور نازک خدمت صرف انھیں منتخب بیدار مغز اور بااثر محبان ملک کے سپرد ہوئی ہے جو وقت اور موقع کے لحاظ سے اس اعزاز اور اعتماد کے بہترین طور پر مستحق تھے۔

جنوری سنہ ۱۹۰۸ء

دیا نرائن نگم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیہاتوں کی تنظیم

(از مانہ دسمبر ۱۹۲۵ء)

ہم لوگ بحث مباحثوں میں بڑے مشاق اور لکچر بازیوں میں خوب طاق ہو گئے ہیں چھوٹے چھوٹے معاملے میں لمبی لمبی تقریریں کرنا۔ بال کی کھال نکالنا ہمارا شیوہ ہو گیا ہے۔ ہماری قومی تحریکیں خواہ وہ سیاسی ہوں یا تمدنی زیادہ تر زبانی داخلے ہیں کانگریس ہو یا سوشل کانفرنس ہندو سبھا ہو یا مسلم لیگ ملکی حقوق کا سوال ہو یا اچھوت اودھار کا کام۔ سب میں ہمارا جوش عارضی ہوتا ہے اور عموماً تقریر بازیوں تک محدود رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے کاروباری جلسوں میں کبھی بے حد طوالت ہوتی ہے۔ تجارتی کمپنیوں اور بنکوں کی انتظامی کمیٹیوں میں کبھی اکثر بات بات پر بحث مباحثوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے یونیورسٹی کورٹ کے جلسوں میں عموماً ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا لطف رہتا ہے۔

سال بھر میں ملک میں جس قدر کانفرنسیں۔ جلسے اور کمیٹیاں ہوتی ہیں ان کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور قومی ضروریات کا کوئی پہلو باقی نہیں ہے جس پر باقاعدہ جدوجہد شروع نہ کر دی گئی ہو۔ لیکن ہر جگہ قول و عمل کا فرق نمایاں ہے۔ تعلیم یافتہ جماعت کو عوام الناس سے واقعی جیسا چاہیئے ربط نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ جماعت اپنے غریب جاہل دور افتادہ اور پسماندہ بھائیوں کے حالات سے واقف تو ضرور ہے لیکن ان کو عوام ملک سے کوئی خاص مس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری جدوجہد سطحی ہے۔ ہماری تقریروں اور دعووں میں عوام الناس کی مہر تصدیق نہیں ہے۔ اور ہماری سیاسی تحریکات کی بنیاد کھوکھلی ہے۔ ہم نے اب تک عوام کی وکالت کا حق تو ادا کیا ہے لیکن ان کی واقعی خدمت کو بھولے رہے ہیں۔ ہمارا روئے سخن یا تو گورنمنٹ کی طرف رہتا ہے یا ملک کے اخبارات کی جانب تحریک نان کوآپریشن نے پہلی مرتبہ عوام الناس کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور ملک کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایکبار ہلا دیا مگر سچ پوچھیئے تو اس سے بھی عوام میں بے چینی تو پیدا کی لیکن ان کی راحت قلب یا سکون خاطر یا اصلاح و بہبود کا کوئی انتظام نہ کیا۔ گورنمنٹ سے قطع تعلق کر کے اس نے عوام الناس سے ناطہ جوڑا۔ لباس اور وضع میں بھی اس کے حامیوں نے ہمارے افلاک زدہ اہل ملک کی نمایندگی کرنے کی کوشش کی جس سے عوام کو پہلے دفعہ یہ محسوس ہوا کہ ہمارے تعلیم یافتہ محسن ہم سے علیحدہ اور ہم سے بالاتر جماعت نہیں ہیں۔ جیل جانے کی آمادگی سے عوام نان کوآپریٹر اصحاب کو اپنا دوردرس اور جفاکش

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

محب وطن بھی سمجھنے لگے۔ لیکن اس میں زیادہ تر دھوکے ہی میں رہے۔ اکثر اصحاب جو اس تحریک کے اہل نہ تھے۔ ذاتی شہرت و عروج کے لحاظ سے اس میں شریک ہو گئے۔ بعضوں نے اس کو وقت کی راگنی سمجھ کر اس کی ہم آہنگی کی۔ غرض ہمارے شامتِ اعمال سے ایک سچے محبِ وطن کے ساتھ صدہا گندم نما جو فروش اصحاب ہو گئے۔ ترکِ تعلیم کے مشورہ کا ایسا مضر اثر ہوا کہ صدہا خام کار دنا تجربہ کار نوجوانوں نے نان کو آپریشن کی حمایت بطور پیشہ اختیار کر لی۔ کھدر سے وہی فائدہ اٹھایا گیا جو ملک کے پیشہ ور سادھو اپنے جوگیانہ لباس سے روزمرہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ انھیں کثیر التعداد نااہل اصحاب کی وجہ سے ہماری پبلک لائف میں اس قدر تلخی اور بدمزگی پیدا ہو گئی ہے۔ مگر سنجیدہ تحریکوں میں نوگیری کی بھرتی سے کبھی تقویت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اب عوام حقیقت حال سے واقف ہو رہے ہیں اور ان میں نام نہاد نان کو آپریٹر اصحاب یا سوراجسٹ حضرات سے کبھی بداعتقادی ہو رہی ہے عام چند دن کا جو استعمال بیجا ہوا۔ اسمبلی اور کونسلوں میں جن ترکیبوں سے ووٹ حاصل کیے گئے ان کی وجہ سے عوام میں بدظنی پھیل رہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو عوام کی تنظیم۔ عوام کی تعلیم عوام کی اصلاح و بہبود کے لیے ہم نے کیا خدمت کی ہے شہروں اور دیہاتوں میں اب بھی وہی بُعد ہے۔ ووٹ یا چندہ مانگنے کے سوا ہمارے محبانِ وطن اور کب دیہاتوں کا دورہ کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی لالہ لاجپت رائے اور دو ایک اصحاب کے علاوہ دیگر رہنمایان ملک عوام الناس کا ذکر زبان پر تو لاتے ہیں لیکن دل میں واقعی کب انکا دھیان رکھتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے صاحب نے حال میں ایک سلسلہ مضامین لکھ کر دیہاتوں کی تنظیم کی طرف اہل ملک کی توجہ مبذول کی ہے۔ بقول ان کے اگر ہم اپنے ملک کو غلامی سے آزاد کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو سمجھ لینا چاہیے کہ آزادی آسمان سے ٹپک نہ پڑے گی" اس کے لیے مسلسل اور باقاعدہ کام کرنا ہوگا اس کے لیے ادنے طبقے کو تیار کرنا ہوگا۔ عوام الناس میں سیاسی جذبہ پیدا کرنا ہوگا ان کی زندگی بہتر بنانا ہوگی۔ ان کی روزمرہ کی کشمکش کو دور کرنا ہوگا اور ان سے ربط پیدا کرنا پڑے گا۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حکمراں ہمارے مطالبات منظور کرنے پر مجبور ہوں تو ہم کو یہ انتظام کرنا چاہیے کہ ہماری آواز صدا بہ صحرا نہ سمجھی جا سکی بلکہ اس کی گونج دور افتادہ دیہاتوں میں سن پڑے۔

ہندوستان کی اصل آبادی دیہاتوں میں سیدھی سادی زندگی بسر کر رہی ہے تعلیم سے وہ بے بہرہ پیٹ بھر روٹی تو اس کو کھانے کو ملتی نہیں ہے۔ ملکی ترقی کا اسے کیا حوصلہ ہو سکتا ہے۔ روزمرہ تردداتہی سے اسے فرصت نہیں ہے۔ بڑے بڑے مسائل سے کیا دلچسپی ہو۔ زمینداروں ساہوکاروں پولیس اور تحصیل کے اہلکاروں ہی سے اس کو نجات نہیں غیر ملکی حکومت کے اہم مسائل کی طرف اسے کیا رجحان ہو۔ تعلیم یافتہ محبان وطن کو اس سے اب بھی کچھ زیادہ واسطہ نہیں ہے۔ بنگال میں دیہاتوں کی تنظیم کے لیے مسٹر داس نے کچھ فنڈ اکٹھا کیا تھا۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب اسپنرس ایسوسی ایشن کے ذریعہ مہاتما جی اہل دیہات کی خدمت کرنا چاہتے ہیں مگر اس کا اثر محدود ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک ......

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی خدمت کا مرکز شہروں سے ہٹا کر دیہاتوں میں قائم کیا جائے ہمارے سوراجی بھائی "عدم تعاون" "جوابی تعاون" "اور" "باعزت تعاون" پر لڑ رہے ہیں۔ کونسلوں کو زہر قاتل قرار دے کر اب پھر اسی کو شیرِ مادر سمجھ رہے ہیں اس کے لیے ہمارے لبرل مدبران ہی کیا کم موزوں تھے؟ حقیقت تو یہی ہے کہ نام خواہ آپ کچھ رکھیں کونسلوں میں پروگرام وہی ہوگا جس پر لبرل اصحاب عرصۂ دراز سے عمل پیرا ہیں۔ ملک کی حقیقی خدمت کرنے کے لیے ہمارے احباب کو کونسل میں جانے کی خواہ مخواہ ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے عیسائی مشنریوں کی طرح ہم کو زندگیاں وقف کرنا ہوں گی۔ شہروں کے عالیشان گھروں کو چھوڑ کر دیہات کی جھونپڑیوں میں رہنا ہوگا۔ دیہاتی بھائیوں کی شادی غمی میں شریک ہونا ہوگا۔ ان کے ساتھ رہ کر ان کی روزمرہ ہر وقت امداد و رہنمائی کرنا ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کام اہم اور مشکل ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ مسئلہ نہایت وسیع ہے تین لاکھ دیہاتوں کی تنظیم کا سوال کوئی معمولی سوال نہیں ہے لیکن اب وقت ہے کہ اس ضروری کام کی طرف ہمارے محبانِ وطن متوجہ ہوں۔ اگر آئندہ دس سال کے اندر ہم ایک لاکھ مواضعات کی بھی تنظیم کر سکیں تو ملکی ترقی کے راستے خود بخود کشادہ ہو جائیں گی پنڈت موتی لال صاحب کے ملکی مطالبات کے پس پشت عوام کی طاقت کا ذکر فرماتے ہیں۔ مگر محض سول نافرمانی کی بیکار دھمکیوں سے یہ طاقت حاصل نہ ہوگی۔ اس کے لیے سالہا سال صبر و سکون اور استقلال کے ساتھ کام کرنا ہوگا اس کے لیے ہم کو سرمایہ اور کارکن دونوں کثیر مقدار میں درکار ہونگے۔ مسٹر گوکھلے آنجہانی نے انجمن خادمان ہند قائم کر کے ملک پر احسان عظیم کیا تھا۔ اس انجمن نے اچھے اچھے ممبران کونسل پیدا کیے ہیں اب ضرورت ہے کہ دیہاتی بھائیوں کی امداد و اصلاح تعلیم و ترقی کے لیے ایک "سیوک منڈل" قائم کیا جائے۔

اب ضرورت ہے کہ لالہ لاجپت رائے کے خاکے کے بموجب دیہاتوں کی تنظیم کا کام ہاتھ میں لیا جائے۔ ہمارے سوراجی بھائی آپس میں لڑ رہے ہیں اور جب انھیں خانگی تنازعوں سے فرصت تھی تو لبرل اور دیگر طبقوں کو بدنام و پریشان کرنے میں وقت صرف ہوتا تھا۔ واقعات سے انکار فضول ہے ہر شخص ہر کام کے لائق نہیں ہوتا۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

اس میں رشک و رقابت فضول ہے۔ ملکی خدمت کے ذرایع اور وسائل اس قدر وسیع ہیں کہ ہر طبقہ اور ہر خیال کے بہی خواہ ملک اور ہر فرزند مادرِ ہند کے لیے اس میں بخوبی گنجائش ہے۔ پھر کیوں نہ تقسیم کار کے اصول پر عملدرآمد کیا جائے بمقتضائے وقت کے خیال کام کی اہمیت کے لحاظ اور ملک کی عظمت کے نام پر نان کوآپریٹر۔ سوراجی اور لبرل کی تفریق کم سے کم برائے چندے عملی حیثیت سے قطعی اٹھا دی جائے۔ سوراج حاصل ہونے پر [illegible] ابھی ان کا وجود

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بالکل قبل از وقت ہے۔ کیوں نہ ہم ملکی ضروریات اور ہر شخص کی ذاتی قابلیت کی بنیاد پر اپنے کارکنوں کی جماعت بندی کریں؟ جو لوگ دیہاتوں میں کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں وہ دیہاتوں کی تنظیم اپنے ہاتھ میں لیں۔ جو لوگ صرف شہروں میں رہ کر خدمت انجام دے سکیں ان سے شہروں کی خدمت لی جائے جو لوگ کونسلوں کے قائل ہوں اور اس میں اعتقاد رکھتے ہوں ان کو بلا تخصیص لبرل و سواراج کونسلوں میں ملکی جد و جہد جاری رکھنے کی خدمت سپرد کی جائے۔ ایک دوسرے کو گرانے اور ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے بجائے سب کے لیاقت کے موافق کام لیا جائے کانگریس اس وقت صرف ایک پارٹی کے ہاتھ میں ہو گئی ہے اس ذلت سے اس کو نکالا جائے۔ اور اس کو صحیح قائم مقام ملک بنایا جائے جس میں ہر پارٹی کے لیے پوری گنجائش ہو۔ فرضی اختلافات اور خیالی تفرقات کو نظر انداز کر کے واقعات اور موجودہ حالات سے واسطہ رکھا جائے۔ تحریک نان کوآپریشن کے حامیان دیہاتوں میں کام کریں۔ لبرل جوابی تعاون کے قائل سواراجی اصحاب کونسلوں میں کام کریں۔ کانگریس کے اجلاس میں ہر سال دونوں ایک دوسرے کو امداد دینے اور ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے جمع ہوں جس پر اس قدر زور نہ دیا جائے۔ بلکہ کام سے واسطہ رکھا جائے۔ چرخے کے ساتھ ساتھ اگر کوئی اور گھریلو صنعت و حرفت ہو سکے تو اس کو بھی ترقی دی جائے۔ بہر حال کام کا دستور العمل وسیع النظری سے بنایا جائے اور اس میں تعصبات و توہمات کو دخل نہ دیا جائے۔ لالہ لاجپت رائے نے جو خاکہ تیار کیا ہے وہ بہت کچھ عملدرآمد کے قابل ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ملک کی خدمت کرنے کا جو حوصلہ پیدا ہو چلا ہے ان کی بہت بڑی تعداد اس وقت بیکاری کا بھی شکار ہے۔ کیا ان سے معمولی معاوضے پر دیہاتوں کی تنظیم کے سلسلے میں خدمت نہیں لی جا سکتی ہے؟

کیا ہمارے محبان وطن اس اہم مسئلہ پر اپنی پوری توجہ سے غور کریں گے۔ قومی زندگی کے شیرازہ بندی کے لیے اس توجہ فرمائی کی اشد ضرورت ہے۔

٭ ٭ ٭

تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی کچھ کم اہم نہیں ہے، آنے والے دور میں کوئی قوم جو عورتوں کے لیے تعلیم و ترقی کے پورے ذرائع بہم نہیں پہونچائے گی ترقی کے میدان میں نظر نہیں آئے گی۔ اس بارے میں ہم کو اپنی معاشرت میں اہم تبدیلی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نئے آئین میں عورتوں کو بھی مردوں کے برابر حقوق ملنے والے ہیں۔ ہندوستان کی موجودہ تنزلی کا ایک بہت بڑا سبب یہ ہے کہ ملک کی نصف آبادی ہمارے مشاغل و ضروریات میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹا سکتی ہے۔

دیا نرائن نگم دسمبر ۱۹۳۲

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندوستانی زبان کی ترقی

(زمانہ دسمبر ۱۹۲۵ء)

ہمارے تمام ملکی مسائل کی طرح دیسی زبانوں کی ترقی کا مسئلہ بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے اور اس میں بھی واقعات سے انکار یا چشم پوشی فضول ہے۔ اس وقت تک تمام ملک کی کوئی ایک زبان نہیں ہے یہ ضرور ہے کہ ہندوستانی زبان جس کو حامیان بھاشا۔ ہندی اور قدردانِ اردو کہتے ہیں کم و بیش ملک کے ایک بڑے وسیع حصے میں سمجھی جاتی ہے۔ لیکن کانگریس یا اس قبیل کے دیگر مشترکہ جلسوں میں جہاں ہر حصۂ ملک کے قائم مقام جمع ہوتے ہیں اگر کسی عام فہم زبان میں باقاعدہ تقریر کی جا سکتی ہے۔ تو وہ انگریزی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ایک عرصہ تک یہی کیفیت رہے گی۔ اور کیا عجب ہے کہ ہمیں انگریزی کو وہ جگہ دینی پڑی جو دول یورپ کو سیاسی حیثیت سے فرانسیسی زبان کو دینا پڑی ہے۔ یورپ میں اسپرانٹو کو عوام کی مشترکہ زبان بنانے کی بھی کوشش ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اس کوشش کی تقلید یا اس کا تتبع ہندوستان میں کسی وقت کیا جائے۔ مگر یہ مسئلہ اس وقت عملی سیاسیات سے خارج ہے بہرحال میری رائے میں ہندی اردو زبانوں کی باہمی کشمکش عبث ہے بنگالی، گجراتی، تامل، مرہٹی، پنجابی وغیرہ زبانوں میں جو ترقی ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے امید نہیں ہے کہ ملک میں کسی ایک زبان کا تنہا دور دورہ ہو۔ درحقیقت بالائی ہند یا ہندوستان خاص میں بھی ہندی اردو کی رقابت فضول تضیع اوقات ہے۔ ہندی رسم الخط کی برتری کا میں قائل ہوں۔ اردو حروف غیر ملکی اور مقابلتہً ناقص ہیں۔ مگر ہندو مسلمانوں کے قومی جذبات دونوں رسم الخط کو فنا نہیں ہونے دیں گے مجھے معلوم ہے کہ ہندی حروف بعض صوبوں میں مقبول ہو رہے ہیں اور بعض دیسی زبانیں ہندی میں لکھی جانے لگی ہیں لیکن اردو زبان کے قدرشناسان سے فارسی رسم الخط کے ترک توقع رکھنا عملی سیاست نہیں ہے۔ اردو زبان میں جس قدر فارسی اور عربی الفاظ داخل ہو گئے ہیں ان کی وجہ سے اسکے طرز تحریر کی تبدیلی مشکل بھی ہے۔ اس لیے اردو، ہندی کے حامیوں کی رقیبانہ جنگ و جدل نہ صرف بیکار بلکہ دونوں زبانوں کی ترقی میں سنگ راہ ہے۔ اور اس سے ہندو مسلمانوں میں خواہ مخواہ ان کی ایک ذریعہ مخالفت پیدا ہو گئی ہے۔

دونوں زبانوں میں بہت کچھ مماثلت ہے بول چال میں بھی دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو بہت ہی خفیف اور قابل نظر انداز ہے۔ مگر دونوں کو ملانے یا دو کے بجائے صرف ایک زبان کو باقی رکھنے کے خیال اور کوشش کا نتیجہ برعکس ہو رہا ہے۔ ایک طرف اردو میں نا مانوس عربی فارسی لفظوں ترکیبوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

محاوروں کی بھرتی ہو رہی ہے۔ دوسرے طرف ہندی بھاشا میں زیادتی کے ساتھ سنسکرت کے ادق الفاظ داخل کیے جا رہے ہیں۔ تحریری زبان عوام کے لیے روز بروز مشکل ہوتی جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ دونوں زبانوں کے توسیع ترقی میں ہرج واقع ہوگا۔ اردو ہندی لٹریچر عوام الناس کے لیے روز بروز مشکل ہونا جائیگا اردو میں شکریہ کی جگہ "شکر" معافی یا معذرت کی جگہ "اعتذار" اور اسی طرح صدہا بلکہ ہزارہا مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں، کا استعمال ترقی پر ہے ہندی کو بھی روزمرہ دقیق بنایا جا رہا ہے۔ ان کوششوں کے باقاعدہ تدارک کی ضرورت ہے۔ دونوں زبانوں میں قدرتاً جس قدر اتحاد ہے اس کو باقی رکھنا ہمارا الکی فرض ہے۔ ہر زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو وہ سلیس اور عام فہم ہو۔ سائینٹفک اور اصطلاحی الفاظ کے ترجموں میں بھی ہم کو اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ خواہ مخواہ غیر مانوس عربی، فارسی اصطلاحات کی بھرتی نہ ہو ہم کو انگریزی اصطلاحات سے بھی نان کوآپریشن کی حاجت نہیں ہے اسکول۔ اسٹول۔ اسٹیشن وغیرہ جو الفاظ اردو ہندی میں داخل ہوگئے ہیں۔ ان کے بجائے اب دوسرے لفظوں کی تلاش فضول ہے۔ آکسیجن یا ہائیڈروجن کی طرح جو الفاظ اب بھی آسانی سے جذب کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی جگہ پر ان سے زیادہ غیر مانوس عربی الفاظ رائج کرنے کا خیال خام ہے۔ ہم کو زبان کی توسیع و ترقی کے مسئلہ کو علمی حسن تدبیر کے لحاظ سے حل کرنا چاہیئے۔ ہمارے ذرائع و وسائل محدود ہیں۔ ہم کو انھیں فضول کوششوں میں رائیگاں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اردو ہندی دونوں کی توسیع و ترقی میں ابھی اس قدر کام کرنا باقی ہے کہ ہم کو نہ تو آپس میں لڑنے کا وقت ہے اور نہ اس کی حاجت ناممکن الحصول تکمیل اور خیالی تحریکوں میں بھی پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مسلم واقعات کو تسلیم کر کے ہم کو اپنے کام میں مصروف ہونا چاہیئے۔ اور اس میں ہر ممکن ذریعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

اس میدان میں گورنمنٹ و عوام دونوں کی مشترکہ کوشش کی ضرورت ہے۔ سچ پوچھئے تو ابھی تک نہ تو اہل ملک اور نہ گورنمنٹ نے اس جانب پوری کوشش کی ہے۔ حکومت نے اب تک اپنا کام امن و امان کے ساتھ چلانے ہی تک اپنی توجہ محدود رکھی ہے۔ ہمارے علمی دماغی ترقی یا قومی بہبودی کی جیسی چاہیئے کوشش نہیں کی گئی ہے۔ تعلیم بھی جس قدر ہم کو دی گئی ہے وہ زیادہ تر سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی ضروریات کے خیال سے۔ اب کچھ دنوں سے دیسی زبانوں میں اعلیٰ ترین تعلیم دینے کا خیال پیدا ہو رہا ہے۔

اس مد میں سب سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی نے قدم بڑھایا ہے۔ گورنمنٹ نظام نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اردو کورس کی تیاری کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے اور دو تین سال میں بہت سی ضروری کتابوں کا اردو میں ترجمہ ہوگیا ہے۔

کلکتہ۔ الہ آباد۔ لکھنؤ وغیرہ کی یونیورسٹیوں نے دیسی زبانوں کو اپنے نصاب تعلیم میں جگہ دی ہے اور بنگالی اردو ہندی کے اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

صوبہ آگرہ اودھ کے بورڈ آف ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن نے بھی اپنے امتحانات کے لیے دیسی زبانوں کے استعمال کی اجازت دیدی ہے۔ یہ سب کچھ تو ہو رہا ہے لیکن اگر ہم چاہتے ہیں کہ دس پندرہ سال کے اندر ہمارے نوجوان ہندوستانی زبان ہی میں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کر سکیں تو ہم کو صوبے کی زبانوں کو انتہائی ترقی کی پوری کوشش کرنا ہوگی ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن ترقی اردو اپنے اپنے طور پر مفید کام کر رہی ہیں مگر اس سے بہت زیادہ وسیع پیمانہ پر ادبی ترقی کی جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے کیوں نہ صوبہ کی گورنمنٹ اور اہل ملک دونوں اپنے اپنے طور پر دیسی زبانوں کی ترقی و تکمیل کے کام کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ کیوں نہ صوبہ آگرہ اودھ میں ہمارے قانونی کونسل کے ممبران گورنمنٹ کی امداد سے ایک ہندوستانی اکیڈمی قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اور اردو ہندی کی ادبی ترقی کو اپنے ذمہ لیں۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ محبانِ وطن کو ہندی اردو کے باہمی رقابت میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور دونوں میں سے ہم کسی کی ترقی سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اس لیے اس ہندوستانی اکیڈمی کے ذمہ دونوں زبانوں کی توسیع و تکمیل کی خدمت ضرور ہونا چاہیئے۔ ملک و صوبہ کے قابل انشا پردازوں و سرپرستوں کو اس اکیڈمی کی سرپرستی و نگرانی میں ادبی خدمت کا پورا موقعہ دیا جائے۔ ہر مضمون پر معقول معاوضہ دیکر کتابیں تصنیف کرائی جائیں دیگر زبانوں کے قابل قدر سرمایہ کو اردو ہندی میں منتقل کیا جائے بچوں کے لیے لٹریچر تیار کرایا جائے۔ لغات انسائیکلوپیڈیا یا فرہنگ اصطلاحات۔ ہر شعبہ کی فہرست کتب وغیرہ کی ترتیب و تدوین کی جائے۔ غرض ہر صیغہ اور ہر صنف میں ادبی ترقی کا سامان مہیا کیا جائے۔ مناسب معاوضے دیئے جائیں انعامات مقرر ہوں معقول تنخواہ دار عملہ رکھا جائے تاکہ قابل و تعلیم یافتہ حضرات ادبی ترقی میں مصروف ہو سکیں۔ ادبی خدمت بھی پیشہ کی حیثیت سے اختیار کی جا سکے اور دیسی زبانوں کے ترقی کا بڑے پیمانہ پر بندوبست شروع ہو جائے۔

پنجاب کی قانونی کونسل میں راجہ نریندر ناتھ صاحب نے لوکل گورنمنٹ سے اس غرض کے لیے کئی لاکھ روپے کے عطیے کی تحریک کی ہے۔ بہار گورنمنٹ نے دیسی زبانوں کی ترقی کے مسئلہ پر غور کرنے کے واسطے سر علی امام صاحب کے زیر صدارت ایک کمیٹی قائم کی ہے۔ پنجاب گورنمنٹ ہر سال اردو۔ ہندی پنجابی زبان کی بہترین مطبوعات کیلئے بیش قدر انعامات دیتی ہے صوبہ آگرہ و اودھ میں بھی کسی وقت اس قسم کے انعامات دیئے جاتے تھے مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کو تصنیف و تالیف کے سلسلے میں گورنمنٹ نے کئی انعامات دیئے تھے۔ لیکن اب عرصہ دراز سے ہماری لوکل گورنمنٹ دیسی زبانوں کی ترقی سے بے نیاز ہے حالانکہ صنعت و حرفت کی ترقی اور شہروں کی اصلاح کی طرح یہ مسئلہ بھی نہایت اہم ہے اور اس پر گورنمنٹ اور محبانِ وطن دونوں کی فوری توجہ ہونا چاہیئے۔ پنڈت گیا نرائن اپادھیا۔ ایم۔ ایل۔ سی وکیل بنارس نے کونسل میں گورنمنٹ سے اس غرض کے لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ عطیہ دینے کی تحریک کا نوٹس دیا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ضرورت ہے کہ ہمارے دیگر ممبران کونسل اس تحریک کی پرزور تائید کریں ۔

بہتر ہے کہ ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ کی سرپرستی میں جو حسن اتفاق سے خود بھی ایک زبردست عالم فاضل اور بڑے علم دوست افسر ہے صوبہ کے نامی گرامی اصحاب کی جن کو دیسی زبانوں کی ترقی سے دلچسپی ہو ایک کانفرنس منعقد کی جائے اور اس کانفرنس میں مجوزہ بالا ہندوستانی اکیڈمی کے قیام کے متعلق مشورہ کیا جائے صاحب وزیر تعلیمات اس کے صدر رہیں اور تعلیمی بجٹ سے اس کی معقول مالی امداد فرمائیں محبان وطن سے بھی مالی اعانت کی درخواست کی جائے ۔ ہمارے صوبہ میں مہاراجہ صاحب بنارس اور نواب صاحب رام پور بیگم صاحبہ بھوپال کی علمی فیاضیاں ہمیشہ سے مشہور ہیں ۔ مہاراجہ صاحب محمود آباد راجہ رام پال سنگھ صاحب وغیرہ روسار ہر مفید ملک تحریکات کی امداد فرماتے رہتے ہیں ۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے فیاض طبع روسار ہندوستانی اکیڈمی کی بھی امداد نہ فرمائیں ۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے لکھنؤ یونی ورسٹی کے کنوکیشن میں بجا طور پر اردو کی ترقی کی طرف اہل صوبہ کی توجہ مبذول فرمائی ہے بابو شیو پرشاد گپتا رئیس بنارس ہندی کے لیے ہزار ہا روپے ماہوار صرف کرتے رہتے ہیں ۔ اور بھی اصحاب ہیں جو ہندی اردو کے شیدائی ہیں اور ان کی ترقی میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں ۔ پھر کیوں نہ ان سب کی ایک باضابطہ کانفرنس طلب کی جائے ۔ کیوں نہ ایک باقاعدہ کمیٹی ہندوستانی اکیڈمی کو چلانے اور کامیاب بنانے کے لیے مرتب کی جائے ۔ رہنمایانِ صوبہ ۔ افسران گورنمنٹ خصوصاً صاحب وزیر تعلیمات صوبہ سے میری استدعا ہے کہ وہ اس ضروری قومی خدمت کی طرف متوجہ ہوں ۔

اس اکیڈمی کے قائم ہونے پر بھی خالص غیر سرکاری علمی انجمنوں کی ضرورت باقی رہے گی علمی ترقی کی جد و جہد کے سلسلے میں بہت سی ضروریات بھی ہیں جو اکیڈمی کے قائم ہونے کے بعد بھی ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن ترقی اردو کے لیے پوری کرنے کو باقی رہ جائیں گی ۔

اردو اور ہندی دونوں میں بعض مستحقین کو جنھوں نے اپنی زندگیاں ملک کی ادبی خدمت میں صرف کر دی ہیں لیکن اب بے یار و مددگار ہیں پنشن دینے کی ضرورت ہے اس سے نوجوان کارکنوں کی بھی حوصلہ افزائی ہو گی ۔

روسار ملک و والیان ریاست کی امداد سے مستحق اہل قلم کی امداد و سرپرستی کا انتظام ہونا چاہیئے ۔ اعلیٰ حضرت نظام بعض انشاپردازوں کی قدر دانی فرما رہے ہیں لیکن بہت سے مستحقین اب بھی محروم ہیں ۔ اور رہیں گے ۔ اگر کوئی اکیڈمی یا کوئی انجمن ان اصحاب کی سرپرستی اپنے ذمے لے سکے تو ہمارے سرمایہ ادب میں غیر معمولی ترقی کا خود بخود سامان ہو جائے ۔

ملک میں اچھے پبلیشرز کی قائم ہیں تجھی بغیر سرکاری انجمنیں بابت کچھ مدد دے سکتی ہیں سرکاری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

صیغہ صنعت و حرفت سے نئے پریسوں کو قرضہ جات دلانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ سررشتہ تعلیم کو ہر اسکول میں اردو ہندی لائبریری کے قائمی پر زور دینا چاہیئے۔ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کے لیے مضمون نویسی کے مقابلے قائم ہونا چاہیئے۔ ہر مدرسہ میں خوشخطی اور زود نویسی دونوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بھی انعامات مقرر ہونا چاہیئے۔ انعامی کتابوں میں اردو ہندی کتابیں بھی مناسب تعداد میں شامل کی جائیں۔ ہر اسکول کے لیے منتخب اردو ہندی کے ادبی رسالوں کی خریداری لازمی قرار دی جائے۔

اردو چھپائی میں ٹائپ کے رواج دینے کی اشد ضرورت ہے۔ سرسید مرحوم نے اس کے متعلق کچھ کوشش کی تھی۔ ان کے وقت میں بعض کتابیں ٹائپ میں شائع بھی ہوئیں۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی گزٹ اب بھی ٹائپ ہی میں چھپتا ہے۔ مولانا محمد علی نے بھی اپنے روزنامہ ہمدرد کو پہلے ٹائپ میں جاری کیا تھا۔ مگر اب وہ بھی لیتھو میں چھپ رہا ہے۔ منشی نشن نرائن بھارگو مرحوم مالک مطبع نولکشور نے ایک مرتبہ راقم الحروف سے اپنے مطبع میں اردو ٹائپ جاری کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ لیکن ان کی بے وقت وفات نے اس ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے نہ دیا۔ اب اس کا رواج اعلیٰ حضرت نظام دکن ہی کے شاہانہ امداد سے ممکن ہے۔ ٹائپ کے رواج کے بغیر اردو کی قرار واقعی ترقی ممکن نہیں ہے۔

ہندوستانی اکیڈمی۔ اور اگر اکیڈمی سے ممکن نہ ہو تو ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن اردو قابل قدر اردو ہندی کتابوں کے فروخت کا بھی بندوبست کر سکتی ہیں۔ ابھی اگر کوئی مصنف مر کھپ کر کوئی کتاب چھپواتا ہے تو اس کے فروخت کرنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ ایک یا دو کتابوں کے لیے نہ اشتہارات ہی کافی دیئے جا سکتے ہیں اور نہ کوئی شخص نجی طور پر فروخت کا معقول انتظام کر سکتا ہے۔ ناگری سبھا اور انجمن اردو ہر عمدہ تصنیف و تالیف و ترجمہ وغیرہ کو کچھ منافع دے کر مصنفین و مولفین سے خرید لیا کریں بہت سی کتابوں کے فروخت کا یکجائی بندوبست نسبتاً آسان ہے ایک کاروباری صیغہ کھولا جا سکتا ہے جس کے تحت ہر جگہ ایجنسیاں قائم کی جا سکتی ہیں موجودہ کتب فروشوں سے بھی معاملہ کیا جا سکتا ہے۔

جس طرح مادی ترقی کے متعلق وقتاً فوقتاً تحقیقاتیں اور پیمائشیں ہوتی رہتی ہیں اسی طرح انجمن ترقی اردو اور ناگری پرچارنی سبھا کو بھی اہل ملک یا اہل صوبہ کے علمی مذاق کی باقاعدہ تحقیقات کرنا چاہیئے۔ اگر مکمل طور پر نہیں تو بہت بڑی حد تک اس بات کی جانچ ہو سکتی ہے کہ صوبہ میں کتنے اصحاب دیسی زبانوں کی مختلف کتابوں کی خریداری کر سکتے ہیں۔ ایک فہرست ایسے صاحبوں کی بنائی جا سکتی ہے جنکو تاریخی کتب سے دلچسپی ہے۔ ایک فہرست افسانوں کے شائقین کی مرتب ہو سکتی ہے۔ ایک دوسری فہرست شعر و سخن کے قدردانوں کی بنا لی جائے۔ غرض اس طرح مختلف شعبوں کے قدر شناسوں کی تعداد کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور مختلف شعبوں کے قدردانوں سے نئے مطبوعات کی خریداری کی تحریک ہو سکتی ہے اس انتظام میں پہلے ضرور کچھ مشکلات اور محنت کرنا ہوگی لیکن اشاعت کتب میں اس سے غیر معمولی مدد ملے گی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اسی طرح اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کو حامیان اردو ہندی اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ ہندی اردو میں مشاعرے اور کومی سمیلن بہ کثرت ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں بھی بہت کچھ اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے اور باقاعدہ جد و جہد کا بہت ہی خاطر خواہ نتیجہ نکل سکتا ہے۔

کیا آنریبل وزیر تعلیم صوبہ و دیگر بہی خواہان ملک اور حامیان اُردو ہندی ہندوستانی زبان کی ترقی کے اہم مسئلہ پر توجہ فرمائیں گے؟ حکام و رہنمایان ملک دونوں کا اخلاقی فرض ہے کہ ہماری دماغی ترقی کی انتہائی فکر کریں۔

⁂

محض کانفرنسیں منعقد کرنے اور ردوکد و غور و فکر کے بعد چند رزولیوشن پاس کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ یہ کانفرنسیں کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہوں، ریزولوشن کیسے ہی عمدہ کیوں نہ ہوں جب تک ہم لوگ فرداً فرداً اپنی ذاتی ذمہ داریاں محسوس نہ کریں گے، جب تک ہم میں ہر شخص قومی فلاح و بہبودی کی خاطر کچھ نہ کچھ قربانی پر تیار نہ ہوگا، جب تک ہر رکن قوم باہمی صلاح و مشورہ کی وقعت قائم رکھنے کا تہیہ نہ کرے گا، جب تک ہر شخص قومی رہنماؤں اور قومی جلسوں کا احترام کرنے کا پختہ ارادہ نہ کرلے گا، جب تک ہر ممبر مقتضائے وقت کے بموجب ذاتی حیثیت سے اصلاح کے کام کو آگے بڑھانے پر مستعد نہ ہو جائے گا، اس وقت تک ہرگز ہرگز بہی خواہان ملک اور خیر خواہان قوم کا اصل مقصد و مدعا حاصل نہ ہوگا۔

دسمبر ۱۹۲۳ء دیانرائن نگم

پورا وقار اور اثر حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی اخبارات کو بھی اپنی حالت درست کرنا پڑے گی۔ رفاہ عام کے مقصد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دینا ہوگا۔ عام بہبودی کا خیال مقدم رکھنا ہوگا۔ فرقہ وارانہ نقطہ خیال کو معدوم کرنا ہوگا اور اخبارات کو صوبہ کے مفاد کا سچا محافظ اور رائے عامہ کا صحیح ترجمان بنانا ہوگا۔ اس لیے ہماری تحریروں اور ہمارے خیالات میں ان تمام ذمہ داریوں کا اثر نمایاں ہونا چاہیے۔ جو ایک خوددار اور خود مختار قوم کے اخبارات کے لیے لازمی ہیں۔

ابھی تک اردو ہندی پریس پر فرقہ وارانہ ذہنیت غالب ہے، مگر اب اس تنگ نظری کا کوئی موقعہ باقی نہیں رہا۔ اس لیے ہم اخبار نویسوں کو تعصب و تنگ دلی کی پالیسی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا چاہیے۔

اپریل ۱۹۱۰ء دیانرائن نگم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندوستانی اکیڈمی

(از زمانہ فروری ۱۹۲۷ء)

ہندوستانی اکیڈمی قائم کر کے گورنمنٹ صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ نے اردو ہندی علم ادب کی توسیع و ترقی کے لیے ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے ہندوستان کے مادی ترقی کے تو بہت سے سامان مہیا کیے ہیں لیکن ملک کی اخلاقی اور ذہنی ترقی کے لیے ایک عرصہ دراز کے بعد یہ پہلا قدم اٹھایا گیا ہے ہندوستانی لٹریچر کی ترقی کا بندوبست کر کے ہز ایکسیلنسی سر ولیم میرس گورنر اور رائے راجیشور بالی صاحب وزیر تعلیم صوبہ متحدہ نے ملک کی آئندہ نسلوں پر جو احسان عظیم کیا ہے اس کا اندازہ ابھی نہیں کیا جا سکتا ہے، قاعدہ سے کام ہوا تو عنقریب ہی اس کا مفید اثر عام طور پر محسوس ہونے لگے گا۔

ناظرین زمانہ کو یاد ہوگا کہ دسمبر ۱۹۲۵ء کے قومی نمبر زمانہ میں ہندوستانی اکیڈمی کی قائمی کے متعلق ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ سے اپیل کی گئی تھی اور اس کا ایک مختصر خاکہ بھی پیش کیا گیا تھا شکر ہے کہ سر ولیم میرس کی علم پروری اور ادب نوازی کے بدولت یہ خاکہ خفیف تبدیلیوں کے بعد امر واقعہ ہو گیا ہے اس طرح گورنمنٹ نے تو اپنا حق ادا کر دیا ہے اب دیکھنا ہے کہ عہدہ داران و اراکین اکیڈمی اپنے فرائض سے کس طرح سبکدوش ہوتے ہیں۔ دنیا کے قریب قریب ہر مہذب ملک میں حکومت وقت کے سرپرستی میں اس قسم کی علمی انجمنیں علوم و فنون کی ترقی میں غیر معمولی حصہ لے رہی ہیں، قبل اس کے کہ ان انجمنوں میں سے بعض کا حال بیان کیا جائے۔ ہندوستانی اکیڈمی کی نام کی موزونیت پر چند سطریں لکھنا بیجا نہ ہوگا۔ تمام ملک میں جس خطہ کا اصلی نام ہندوستان ہے وہ درحقیقت ہمارے صوبہ متحدہ ہی کا ایک حصہ ہے جس میں کسی وقت دہلی کا شہر و صوبہ بھی شامل تھا لیکن سلطنت برطانیہ نے اپنا عمل دخل ہوتے ہی اس کو اس حصہ ملک سے نکال لیا ہے۔ تاہم عرف عام میں دہلی ہندوستان خاص ہی کا ایک جز و شمار ہوتا ہے اور جو زبان اس خطہ رائج ہے اس کو ہندوستانی کہتے ہیں۔

تحریر میں ہندوستانی زبان نے دو صورتیں اختیار کیں۔ ایک ہندی دوسری اردو۔ لیکن دونوں کی اصل ایک ہے۔ ہاں کچھ عرصہ سے ان دونوں کے بولنے والوں میں ایک قسم کی ناچاقی پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دونوں زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہو رہی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی مزید نفع نہ بھی پہونچے تب بھی ہندوستانی اکیڈمی اس لحاظ سے ایک مبارک تحریک ہے کہ اس کی بدولت دونوں زبانوں کے انشا پردازوں کے لیے ایک مشترکہ پلیٹ فارم مہیا ہو گیا ہے جس سے آیندہ قومی اتحاد کے لیے بڑی بڑی امیدیں قائم ہو گئی ہیں۔ دونوں زبانوں کی توسیع و ترقی کی گنجائش ہے۔ اور دونوں کے ترقی کی ضرورت ہے دونوں ایک دوسرے کے لیے مفید اور ایک دوسرے کے قریب ہو سکتی ہیں۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تحت میں کم سے کم ان دونوں میں رشک و عناد کے جذبات فنا ہو جانا چاہیئے۔

ہندوستانی اکیڈمی کا حقیقی منشا جاننے کے لیے اس کے دوسرے جزو کی تشریح بھی ضروری ہے۔ اکیڈمی یونانی زبان کا لفظ ہے اور قدیم یونانی ہیرو اکیڈمس کے باغیچہ کا نام ہے جو مشہور و معروف پایۂ تخت اتھینز کے شمال مغرب جانب دریا کے کنارے واقع تھا۔ اپنے مالک کے اثر و رسوخ کے بدولت یہ باغ نہ صرف متعدد حملہ آوروں کے پامالی سے محفوظ رہا بلکہ اکثر مشاہیر نے اس کی ترقی و آراستگی میں بھی حصہ لیا۔ مثلاً اگر اکیڈمس کے کسی مہربان نے اس کی چار دیواری بنوادی تو اس کے دوسرے معزز قدردان نے اس کی روشیں درست کرادیں۔ اور کسی تیسرے صاحب نے اس میں فوارے لگا دیئے۔ بہرحال شروع ہی سے معززین کو اس باغ سے ایک خاص دلچسپی پیدا ہو گئی اور غالباً اس سے متاثر ہو کر اس کے مالک نے اس کو عوام الناس کے تفریح طبع کے لیے وقف کر دیا۔ علمائے وقت اس آراستہ و پیراستہ باغ میں آتے اور اپنے علمی مباحث کا سلسلہ جاری رکھتے۔ رفتہ رفتہ یہ باغ افلاطون جیسے یکتائے زمانہ فلسفی کا تفریح گاہ بن گیا۔ حسن اتفاق کہیے یا اس باغ کی خوش نصیبی کہ اس کے قریب ہی اس نامور فلسفی کی ذاتی جائداد بھی واقع تھی، بہرحال افلاطون نے اپنے سنہ وفات یعنی ۳۴۸؁ قبل مسیح تک مسلسل پچاس سال "اکیڈمی" میں اپنے شاگردوں کو تعلیم دی، جنھوں نے استاد کے بعد بھی اس کو اپنا درس گاہ بنائے رکھا اس طرح نو صدیوں تک مسلسل اس باغ میں تحصیل علم کا مشغلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ ۵۲۹؁ میں شاہ جسٹینین نے دیگر مدارس کے ساتھ اس کو بھی عوام کے لیے بند کر دیا۔ لیکن گو اس چمنستان علم و فضل میں علمی مشاغل و مباحث کی ممانعت ہو گئی تاہم اس کے تعلیمات کا اثر مدتوں تک قائم رہا۔ اور لفظ اکیڈمی ایک خاص معنی میں مستعمل ہونے لگا چنانچہ مشہور و معروف سسرو نے بھی اپنے باغ کا نام اکیڈمی رکھ کر اپنے علم دوست احباب کو فلسفیانہ بحث و مباحثہ کے لیے مدعو کرنے کا سلسلہ شروع کیا یونان میں کتنے نامور فلسفیوں نے افلاطون کے اکیڈمی کی شاندار روایتیں قائم رکھیں۔ ان سب کا بیان ایک طولانی داستان ہے بہرحال ان عظیم الشان اور مسلسل روایات کی بدولت علمی دنیا میں لفظ اکیڈمی کو ایک خاص وقعت و اہمیت حاصل ہو گئی، جدید دنیائے ادب نے بھی اس لفظ کو قبول عام کی سند عطا کی ہے۔ اور زمانہ حال کی اصطلاح میں اکیڈمی سے مراد ایک ایسی انجمن یا جماعت ہے جس کا مقصد منشا انفرادی طور پر نیز مجموعی حیثیت سے خلوص و بے لوثی کے ساتھ بلا کسی خیال ذاتی منفعت کے علم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ادب و سائنس و فنون لطیفہ وغیرہ کی توسیع و ترقی ایک سچی اکیڈمی کے ممبران کے لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ذاتی منفعت کے خیال سے خالی الذہن ہو کر علوم و فنون کی خدمت کر سکیں، اور علمی تکمیل و ترقی ہی کو اپنی کوششوں اور کاوشوں کا بہترین انعام تصور کریں۔ مدیر انسائیکلوپیڈیا برطانیکا پہلی اکیڈمی کو درحقیقت دنیا کی پہلی یونیورسٹی قرار دیتا ہے اور یہ اسکندریہ کا مشہور و معروف عجائب خانہ تھا جہاں تیسری صدی قبل یونان کے علما و فضلا یکجا ہو کر علمی مشاغل میں مصروف ہوتے تھے۔ اسی کی بدولت اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کی بنیاد پڑی۔ اس کے بعد مختلف ملکوں میں مختلف اکیڈمیاں قائم ہوئیں۔ زمانہ حال میں یوروپ کی علمی ترقی کا بیشتر حصہ انھیں اکیڈمیوں کے حسن کوشش کا نتیجہ ہے۔ آسٹریا، بلجیم ڈینمارک۔ جرمنی۔ فرانس۔ ہنگری۔ اٹلی۔ پرتگال۔ روس۔ برطانیہ عظمیٰ۔ آئرلینڈ و امریکہ سبھی ملکوں میں علم و ادب و سائنس و فنون لطیفہ وغیرہ کی کے لیے شاہی اکیڈمیاں قائم ہیں۔ بعض ممالک میں مختلف شعبہ جات کے لیے مختلف اکیڈمیاں قائم کی گئی ہیں اور اب ہمارے صوبہ میں بھی انھیں روایات کی تقلید کی گئی ہے۔

ہندوستانی اکیڈمی کو بھی انھیں انجمنوں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا۔ ان کے شاندار روایات کے لحاظ سے علمی ترقی کے ساتھ ہی اصلاح زبان و تہذیب کا بھی اسے ایک بلند تر معیار ملک کے افراد کے سامنے پیش کرنا ہوگا جس کی واقعی ملک کو اشد ضرورت ہے۔

اس وقت اردو ہندی دونوں میں عجب بے ہنگامی برپا ہے، ایک طرف بعض محسنان اردو عربی فارسی کے ادق محاوروں اور غیر مانوس ترکیبوں کو اردو میں داخل کرنا ضروری سمجھ رہے ہیں تو دوسری طرف پرجوش حامیان ہندی عام فہم روزمرہ بھاشا میں قدیم سنسکرت کے مشکل الفاظ اور دقیق استعاروں کی بھرمار کر رہے ہیں۔ تحریر و تقریر میں زمین و آسمان کا فرق ہو رہا ہے۔ اور دونوں زبانوں کے اکثر انشاپرداز ملکی ضروریات اور واقعات کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے سے قطعی الگ راستے اختیار کر رہے ہیں اس بارے میں اصلاح و مفاہمت باہمی کی ضرورت ظاہر ہے۔ اور ہندوستانی اکیڈمی ایک صاف سلیس شستہ اور عام ہندوستانی زبان کے ترقی کے لیے بہت کچھ کر سکتی ہے یوں تو اردو و ہندی کی متعدد لغات موجود ہیں اور ناگری پرچارنی سبھا اور انجمن اردو کی بدولت بہت کچھ کام ہو گیا ہے تاہم زمانہ حال کی ضروریات کے لحاظ سے ہندوستانی اکیڈمی ایک مشترکہ اردو، ہندی لغات کی طباعت کا انتظام کر سکتی ہے جس میں زبان کی سلاست کا خیال بھی پورے طور پر رکھا جا سکتا ہے، اردو و ہندی کے مشترکہ الفاظ کی تعداد میں اضافہ کی بہت گنجائش ہے اور ہندوستانی اکیڈمی کے علماء پر اس کے متعلق خاص فرائض عائد ہیں۔

آج کل بعض احباب اپنے اپنے "اختراعات فائقہ" سے ہندوستانی علم ادب کو زیر بار احسان کر رہے ہیں "ادب عالیہ" "ادب لطیف" "انشائے جلیل" کے آڑ میں جو طوفان بے تمیزی برپا ہے، اس کا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تدارک بھی ہندوستانی اکیڈمی کا ایک خاص فرض ہونا چاہئیے۔

اردو، ہندی دونوں میں بیہودہ کتابوں اور لغو افسانوں کی غیر معمولی کثرت ہے۔ جن میں نہ زبان ہی کا کوئی لحاظ ہے اور نہ فن انشا کا کوئی پاس، اور نہ اخلاق عامہ، اور نہ تہذیب و متانت ہی کا کوئی خیال ہندوستانی اکیڈمی کے بدولت تھوڑے ہی عرصے میں ہندوستانی لٹریچر کا ایک معیار قائم ہونا چاہئیے۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ زمانہ میں دنیا کی کوئی طاقت پوچ گویوں اور لغو نگاروں کو روک نہیں سکتی ہے لیکن ہندوستانی اکیڈمی کے بدولت پبلک کے روبرو ایک معیار تو پیش ہو جائیگا اور جو تصانیف اکیڈمی کی مہر تصدیق کے ساتھ شائع ہوں گی وہ مذاق سلیم کی درستی میں نمایاں حصّہ لے سکتی ہیں۔

بعض اصحاب اردو، ہندی کو ترقی دینے کے یہ معنی سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف شاعری اور افسانہ نگاری کو ترقی دی جائے۔ چنانچہ اردو، ہندی شعراء کی تعداد لاانتہا ہو گئی ہے مگر شاعری کی حالت دیکھئے تو ناگفتہ بہ۔ ذرحقیقت ہمارے شعراء کے کلام میں عموماً جذبات ہی دیکھنے میں آتے ہیں اور نہ روحانیت ہی کا شائبہ نظر آتا ہے۔ اور نہ طرز ادا میں کوئی جدت ہوتی ہے۔ نثر کی حالت اس سے بھی بدتر ہے۔ زیادہ تر قصے کہانیاں ناول افسانے ایسے لکھے جاتے ہیں جو دماغ کو منور اور دل کو مسرور کرنے کی بجائے طبیعت کو منغض و خیالات کو پراگندہ کر دیتے ہیں اور یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ادنیٰ ترین سازشوں کی جگہ ہے جہاں مکر و فریب اور بوالہوسی کے سوا اگر کسی چیز کی گنجائش ہے تو وہ جھوٹ، سانی ہے، اس حالت کی اصلاح بھی ہو جائے تب بھی شاعری و افسانہ نگاری کی ترقی سے محض تفریح طبع کا سامان مہیا ہوگا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہندی ادب کو ایسا مکمل بنایا جائے کہ سائنس و طبعیات کے تمام مسائل اس میں ادا ہو سکیں۔ ہر علم و فن کی اصطلاحات موجود ہوں اور ہر جذبات و خیالات کے اظہار کے لیے صحیح مناسب و موزوں الفاظ میسر ہوں لغات کی توسیع ہو اور تحریر و تقریر میں صحت کا ایک صحیح معیار قائم ہو جائے۔ بہر حال اس بارے میں ایسی کوشش ہونا چاہئیے کہ ہندوستانی اکیڈمی رفتہ رفتہ علم ادب کی قومی پارلیمنٹ سمجھی جانے لگے۔

فرنچ اکیڈمی کے ادبی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے میتھیو آرنالڈ لکھتے ہیں کہ ادبی دنیا میں اس کا درجہ ایک اعلیٰ ترین عدالت کے بمنزلہ ہے، مہذب طبقہ اور تعلیم یافتہ جماعت کے خیالات و جذبات کا وہ ایک مستند مرکز ہے۔ اور لب و لہجہ طرز بیان اور ذوق سلیم کے باب میں اس کی رائیں واجب التعظیم اور واجب التعمیل احکام کا درجہ رکھتی ہیں۔

یہ درجہ محض حکومت کے رزولیشن سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ گورنمنٹ کام کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کر سکتی ہے۔ مگر کام کا اصلی دارومدار کام کرنے والوں پر ہوگا۔ جب تک سوگھمی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے باقاعدہ کام نہ کیا جائیگا۔ خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو جوش و محنت سے کام کرنے پر کہیں برسوں میں جا کر کوئی نتیجہ نکل سکے گا۔ اس لحاظ سے اکیڈمی کے اولین عہدہ داروں اور ارکین پر غیر معمولی ذمہ داریاں ہیں۔ ہم کو بھروسہ ہے کہ ان بزرگوں نے جنھیں اس اکیڈمی کی قسمت سپرد کی گئی ہے۔ سوچ سمجھ کر ہی اس اہم خدمت کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ افسران اکیڈمی خصوصاً محترم صدر اردو ادب کے شیدائیوں میں ہیں انگریزی زبان میں اعلیٰ ترین دستگاہ کے ساتھ دیسی زبان کے وہ ہمیشہ سے باخبر نکتہ چیں و قدرشناس رہے ہیں۔ ملک کی علمی ضروریات اور موجودہ ادب کے نقائص و خامیوں کا انھیں پورا احساس ہے۔ اگر وہ اپنے قیمتی وقت کا تھوڑا سا حصہ بھی اکیڈمی کو دے سکے تو چند ہی سال کے عرصے میں ہندوستانی زبان کا غیر معمولی نشوونما ہو جائے گا۔ اور ہندوستانی اکیڈمی ملک کے ذہنی و دماغی ترقی کا معیار بلند کرنے میں ایک نمایاں خدمت انجام دے سکے گی۔

٭ ٭ ٭

آپ اس کو فلک کجرفتار کی شرارت سمجھیے یا گردش روزگار کا کرشمہ کہیے اب وہ وقت باقی نہیں رہا جب محض شکوہ و شکایت یا مرثیہ خوانی سے کام چل جاتا تھا۔ آج دنیا جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اس میں گلہ یا شکوہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس وقت دنیا میں بخت نارسا کی شکایتوں کا کوئی سننے والا نہیں رہا، اب یہ بیکاروں کا شغل رہ گیا ہے۔ اگر آپ کو اپنی ہستی قائم رکھنا ہے تو یاد رکھیے آپ کی ہستی ترقی کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہے اور اس کے لیے آپ کو اتفاق و یکجہتی کے ساتھ اپنے تئیں موجودہ حالات کے مطابق بنانا ہوگا، اور میدان عمل میں باقاعدہ قدم آگے بڑھانا پڑے گا۔ خوب سمجھ لیجیے کہ گذشتہ پندرہ سال کے اندر دنیا کی حالت بالکل بدل چکی ہے لیکن آپ ابھی تک پچاس ساٹھ سال پہلے کے مقرر کردہ راستوں پر چل رہے ہیں اور پرانے ریزہ و لوشنوں کو دہرا رہے ہیں، حالانکہ کیفیت یہ ہے:۔

یاران تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کاروان رہے

دیانرائن نگم

دسمبر ۱۹۲۷ء

یادِ رفتگان

(ایک نظر باز گشت)

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

چوتھائی صدی کا زمانہ، قومی زندگی یا ملکی ترقی کے لیے کوئی بڑی مدت نہ ہو لیکن۔ ایک اردو رسالہ اور ایک معمولی شخص کی زندگی کا بہت بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ فروری ۱۹۰۳ء میں جب رسالہ زمانہ کا پہلا پرچہ قیصری پریس بریلی سے شائع ہوا تھا تو ملک کی سرد مہری اور اردو کی عام بے قدری دیکھتے ہوئے کس کو اس کی جوبلی دیکھنے کی امید ہو سکتی تھی، مگر شکر کا مقام ہے کہ آج اس کی عمر کے پچیس سال پورے ہو گئے اور اس نمبر کی اشاعت سے اس کا چھبیسواں سال شروع ہوتا ہے۔ پچیس سال کس محنت و جانکاہی سے بسر ہوئے۔ اس عرصے میں دنیا کے کیسے کیسے نشیب و فراز دیکھنے میں آئے۔ ملکی خیالات نے کہاں سے کہاں تک ترقی کی۔ قومی زندگی میں کیا کیا انقلاب رونما ہوئے؟ اس وقت ان اہم سوالات کے مفصل جواب دینے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن آج جب خدا کی عنایت اور بندگان خدا کی اعانت سے زمانہ کا جوبلی نمبر شائع ہو رہا ہے تو ان بزرگوں اور مہربانوں کے احسانات کا سرسری ذکر نہ کرنا بھی کفرانِ نعمت ہو گا جن کی امداد سرپرستی کے بغیر اس ناچیز کا ادبی خدمت کا سلسلہ کسی طرح اتنے دنوں قائم نہ رہ سکتا تھا۔ مگر آج رسالہ کے چھبیسویں سالگرہ کے دن ان احباب زمانہ کی بے اختیار یاد آ رہی ہے جن کی مالی سرپرستی اور قلمی اعانت کے بغیر یہ ادبی تحریک سر سبز و بار آور ہونا درکنار زندہ ہی نہ رہ سکتی تھی۔ افسوس اس وقت ہمارے اکثر ہمدرد و معاون ہماری خوشی میں شریک ہونے اور ہماری محنتوں کی داد دینے کو دنیا میں موجود نہیں ہیں، ہماری بزم ادب ان کے بغیر سونی ہو رہی ہے لیکن دل کی بستی میں ان کی لطف و عنایت کی یادگار ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کے اخلاص و محبت کے نقش زمانہ کے صفحات سے کبھی محو نہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہو سکتے ہیں، اور جب تک جسم و جان کا ارتباط باہمی قائم ہے، ان محبانِ قدیم کی یاد تازہ رہے گی۔

مشیت ایزدی میں نہ کسی کو دخل اور نہ مصلحت خداوندی میں چون و چرا کی گنجائش ہے لیکن ناظرین زمانہ معاف فرمائیں اگر اس مسرت انگیز موقعہ پر ہماری خوشی اس خیال سے کسی قدر مکدر و نامکمل ہے کہ زمانہ کے نامور بانی آج کے جشن میں حصہ لینے کے لیے ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں جس ادبی خدمت کی بنیاد رکھنے کا فخر موصوف کو حاصل ہے اسے کھلتا پھولتا تو انھوں نے دیکھ لیا۔ لیکن آج ہم کو مبارک باد دینے اور ہماری مبارکباد لینے کے لیے وہ دارِ فانی میں باقی نہیں ہیں۔

سچی حب الوطنی کو ان کی ذات گرامی پر ہمیشہ فخر کرنے کا موقعہ رہے گا۔ منشی راج بہادر صاحب ریاست رام پور کے ایک ہر دلعزیز و بے لوث افسر تھے۔ انتہائی دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے علاوہ، وہ ریاست میں کسی سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ ریاست رام پور کے وہ سچے بہی خواہ تھے لیکن یہ خیر خواہی ان کے لیے فرض کے بمنزلہ تھی۔ اس لیے اس کے اعلان کی نہ انھوں نے کبھی کوئی ضرورت ہی محسوس کی اور نہ اس سے کسی وقت کوئی خاص فائدہ اٹھایا۔ اپنی دیانت داری کا یہی صلہ وہ کافی سمجھتے تھے کہ تمام عمر اپنے آقائے نامدار کے معتمد علیہ رہے۔ عزت سے زندگی بسر کی اور عزت ہی کے ساتھ اس دارِ فانی سے رحلت گزائے عالم جاودانی ہو گئے۔

موصوف بریلی کے ایک قدیم کایستھ خاندان کے نامور رکن تھے۔ عرصہ تک پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ کے اہلکار رہنے کے بعد آپ کی خدمات ریاست رام پور میں منتقل ہو گئی تھیں، جہاں آپ نے ۳۵ سال تک ریاست کی خدمت انجام دی۔

رفاہِ عام کے کاموں سے آپ کو شروع ہی سے شوق تھا۔ چنانچہ بریلی کا مشہور یتیم خانہ آپ ہی کا قائم کردہ ہے، جب تک اس کی عمارت تیار نہیں ہوئی آپ نے یتیموں کے لیے اپنا گھر خالی کر دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے، لیکن اس سے ان کی دلی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے۔ منشی راج بہادر کا خاصہ تھا کہ جس کام کو شروع کرتے تہ دل سے کرتے۔ ان کی آنکھ میں مروت اور دل میں درد تھا۔ وہ دولت مند نہ تھے۔ لیکن خلوص اور نیک نیتی کی بدولت ان کے ہاتھ میں جس‌ اور ان کے روپیہ میں برکت تھی۔ انکی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صرف کام سے غرض رکھتے تھے نام سے نہیں۔

ان کی سب سے بڑی لیاقت یہ تھی کہ دوسروں کو بھی وہ اپنے نیک جذبات سے متاثر کر کے ان سے حسب مرضی کام لے سکتے تھے۔ ان کی بے لوثی کا اس سے زیادہ ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ کئی سال تک وہ زمانہ پر ہزار ہا روپیہ صرف کرتے رہے لیکن کسی پر اپنا نام تک ظاہر نہ ہونے دیا۔ واقعی موصوف زندگی بھر "نیکی کن و بدریا انداز" کے اصول پر کاربند رہے۔ زمانہ جاری کر کے چھبیس برس بعد تک وہ زندہ رہے لیکن کبھی انھوں نے اپنا نام نامی ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی۔ البتہ خاص احباب واقف تھے، لیکن ان کو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی آپ کے جذبات کا احترام کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ بابو گنگا پرشاد ورما آنجہانی نے اپنے معزز اخبار ہندوستانی مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا کہ "ہم رسالہ زمانہ کے مالک کی جس کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے ملکی جوش کی تعریف کریں گے کہ وہ نقصان کثیر سے رسالہ چلا رہے ہیں" بعض دوراندیش زرپرست اصحاب نے انھیں اس کام میں اپنا روپیہ برباد کرنے سے منع بھی کیا لیکن وہ اپنی دھن کے پکے تھے جو کام کرتے تھے کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر کرتے تھے۔ اس کے لیے خود بھی ایثار کے لیے تیار رہتے اور دوسروں کو بھی ایثار کے واسطے آمادہ کر دیتے تھے۔ منشی راج بہادر کو رفاہ عام کے کاموں کا دلی شوق تھا۔ وہ ملک کی قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کے کوشاں تھے، اسی لیے اصلاح تمدن کے زبردست حامی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سیاسی ترقی کے خواہشمند اور علمی ترقی کے دلدادہ تھے۔ اور ہر مد میں قومی کارکنوں کی تعداد میں اضافہ ہونا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس کے لیے کوئی موقعہ اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیتے بابو شیو برت لال صاحب ورمن آج ایک کامیاب مصنف ہیں۔ جن کی صدہا کتابیں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہیں۔ درحقیقت کثرت تصانیف کے لحاظ سے زمانہ حال کے اردو مصنفین میں بابو شیو برت لال ورمن اور خواجہ حسن نظامی ہی ایسے اصحاب ہیں جنھوں نے ہر طرف مضامین کے انبار لگا دیے ہیں۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ بابو شیو برت لال صاحب کو سرکاری ملازمت سے ہٹا کر تصنیف و تالیف کے راستے میں منشی راج بہادر بانی زمانہ ہی نے ڈالا تھا۔ آپ ہی کی متواتر و مسلسل کوششوں سے نامور محب وطن بابو گنگا پرشاد ورما نے اپنا مشہور و معروف انگریزی اخبار ایڈوکیٹ جاری کیا تھا۔ آپ ہی کی بزرگانہ حوصلہ افزائیوں نے ناچیز ایڈیٹر زمانہ کے دل میں ملک کی ادبی خدمت کا چسکا پیدا کر دیا۔ اور اس کی زندگی اسی کام کے لیے وقف ہو گئی۔

بہرحال منشی راج بہادر کی ذات گرامی پر اس رسالے کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ دنیا میں کوئی شخص نہ ہمیشہ رہا ہے اور نہ رہے گا لیکن منشی راج بہادر کے اخلاص و حب الوطنی کی یاد عرصہ تک دلوں میں باقی رہے گی۔

پچیس سال کی پرانی جلدیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں اور ہمارا دل احسان مندی اور شکر گذاری کے جذبات سے لبریز ہو جاتا ہے۔ کن کن عنایت فرماؤں کا ان مختصر صفحات میں ذکر کیا جائے۔ عہد حاضرہ کے سبھی انشا پردازان اردو نے ہماری اعانت فرمائی ہے۔ بقول "بالمکند گپتا ایڈیٹر بھارت متر" کتنے ہی بوڑھے اہل قلم جو بیس بیس سال سے لکھنا چھوڑ بیٹھے تھے' زمانہ کے اجراء کے بعد اس میں لکھنے لگے" ان میں سب سے پہلا قابل ذکر نام ہمارے صوبہ کے زندہ جاوید شاعر و فلسفی 'اکبر' کا ہے۔ جن کی شاعری کا طلسم سکوت سالہا سال کے بعد اسی ناچیز رسالہ کی مسلسل کوششوں سے ٹوٹا تھا۔ جناب اکبر قدیم اودھ پنچ کے مشہور مضمون نگاروں میں تھے۔ علی گڑھ کی تحریک و فلسفہ پر انھیں کے انداز میں ظریفانہ تنقیدیں کیا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کرتے تھے۔ مگر جب اردو شاعری قدیم و جدید طرز کی کشمکش میں پھنس گئی تو آپ دم بخود ہو رہے صحت بھی اچھی نہ رہتی تھی۔ جو کچھ کہتے اپنے ہی دل کی خوشی کے لیے کہتے، کلام کی اشاعت کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا۔ اور مزاج میں یک گونہ بے پروائی دخل پا گئی تھی۔ لیکن ہمارے مسلسل اصرار سے مجبور ہو کر آخر آپ نے جنوری ۱۹۰۳ء سے زمانہ کے لیے اپنی نظمیں عنایت فرمانا شروع کیں، چنانچہ آپ نے زمانہ سلسلہ جدید کے پہلے ہی نمبر میں اپنی شاعرانہ مشکلات کا نہایت پر لطف پیرایہ میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبر — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں — خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ اُدھر — زیادہ حد سے دیے پاؤں سب نے ہیں پھیلا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک — اُدھر ہے وحی ولایت کے ڈاک کا تھیلا

اکبر مرحوم سرکاری ملازمت کے زمانہ میں کان پور رہ چکے تھے اور ایڈیٹر زمانہ کے بزرگوں کے عنایت فرما تھے۔ جس کی وجہ سے وہ اس پر ہمیشہ خاص طور پر مہربان رہے، اور ان کا بہترین کلام زمانہ ہی میں شائع ہوا ہے۔ آہ اب ایسے وضعدار اور عالی خیال بزرگ کہاں دیکھنے کو نصیب ہوں گے ادنیٰ ادنیٰ امور کا بھی لحاظ فرماتے تھے۔ نجی خط و کتابت میں ذرا ذرا سی بات کی داد دیتے تھے۔ ۱۹۰۴ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ ایسے قابل اور وسیع المشرب نوجوان کی در حقیقت ملک کو ضرورت ہے خدا کامیاب کرے۔ اس قدر انگریزی پڑھ کر شاذ ہی ایسی طبیعت رہ جاتی ہے.....

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ آپ کا خط پڑھ کر پہلی ہی جو بات ذہن میں آئی وہ یہ تھی۔ "عزیز از جان" یہ اردو آپ کو کس طرح آ گئی۔ آپ کہیں گے بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ جی ہاں، یہ ایک بات ہے اور بڑی بات ہے۔

۱۹۱۰ء میں آپ نے اولن مل کی لوئی منگوائی تھی۔ حسن اتفاق سے انھیں دنوں کلیات اکبر کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ اور اس کا ریویو زمانہ میں شائع ہوا تھا۔ اس پر آپ نے لکھا: "خدا خوش رکھے آپ داد بھی دیتے ہیں، اور خلعت بھی۔ لوئی اوڑھ کر آپ کا ریویو پڑھتا ہوں، اور تھینکس دیتا ہوں،... .... ایسے لائق سخن شناس کم ہوتے ہیں۔ میں نہ ہوں گا۔ لیکن آپ میری یاد کو بہت دن زندہ رکھیں گے۔"

۱۹۱۱ء میں ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:-

عزیزم سلمہ۔ اول تو آپ کے بزرگوں سے مجھ سے مراسم تھے، دوسرے آپ میرے بہت ابتدائی پبلشروں میں ہیں "میرے قیمتی تحائف (۱) جو مجھے آپ کی سلامت روی ان وجوہ سے آپ کو یاد رکھتا ہوں اور نیاز زمانہ لکھا تھا۔ ورنہ میں اب بہت کچھ معذور ہوں اور معذور ہوتا جاتا ہوں۔ نہ نشاط طبع ہے نہ حرص فردا....

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۲۰ نومبر ۱۹۱۴ء کے ایک نوازش نامہ کی عبارت ملاحظہ ہو۔

میرے محترم عنایت فرما۔ بیماری ناتوانی اور تردداتنے نکما کر دیا ہے۔ حکم کو ٹال نہ سکا۔ مشکل سے کچھ اشعار نقل کرکے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ قدر افزائے اکبر کو خدا خوش رکھے"۔

کیا اس محبت کو یادوں سے کبھی محو ہو سکتی ہے؟۔

⁂

اس صوبہ کے نامور اخبار نویس بابو گنگا پرشاد ورما کا نام اوپر آ چکا ہے۔ آپ بھی زمانہ کے اولیں معاونین میں تھے۔ ہمعصر بھارت متر نے لکھا تھا کہ کتنے ہی مشہور مصنف اور کتنے ہی نامی اخباروں کے ایڈیٹر زمانہ کے لیے مضامین لکھتے ہیں۔ ایڈیٹروں کو اپنے اپنے اخباروں ہی سے فرصت نہیں پھر ان سے مضامین لکھانا زمانہ کی بہادری ہے۔ خیر جو کچھ ہو ورما صاحب کے پاس ہندوستانی ایڈوکیٹ کی ایڈیٹری اور دیگر پبلک مصروفیتوں کی وجہ سے مشکل کوئی وقت بچتا تھا۔ تاہم ستمبر ۱۹۲۴ء میں آپ نے پولٹیکل تعلیم کی ضرورت پر ایک خاص مضمون لکھ کر زمانہ کو عنایت فرمایا۔ اور اس کے بعد بھی کئی بیش بہا مضامین لکھے۔ صوبہ متحدہ میں پولٹیکل اخبار نویسی کی بنیاد ورما صاحب ہی کی بدولت قائم ہوئی آپ کی وجہ سے اس کا معیار اور اس کی شان بہت بڑھ گئی آپ کی بے لوث نیک نیتی اور فرض تناسی ضرب المثل تھی۔۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی موت پر بھی آپ نے اخبار کا دفتر بند نہ کیا۔ جس محنت و جانفشانی سے آپ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے تھے۔ جس خلوص و محبت کے ساتھ اہل وطن کی خدمت کرتے تھے۔ اس کا احسان ہمیشہ ہماری گردنوں پر رہے گا۔ آپ کا اردو خط آسانی سے پڑھا نہ جا سکتا تھا۔ اس لیے آپ زمانہ کے لیے جو مضامین بھیجتے ہمیشہ اپنے اخبار کے کاتب سے صاف کرا کر بھیجتے تھے۔ اور قریب قریب ہر خط میں یہ لکھ کر حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ کہ میں آپ کی محنت کی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں"۔ خدا کرے آپ اردو داں اصحاب کے لیے فروعات سے پاک، ایک اعلیٰ درجہ کا میگزین بہم پہونچانے میں کامیاب ہوں"۔

زمانہ کو سوامی رام تیرتھ جی مہاراج کے کئی خاص مضامین شائع کرنے کا اعزاز ورما صاحب ہی کے توسط سے نصیب ہوا تھا۔ ورما صاحب کو رسالہ سے سچی محبت تھی اور وہ دل سے اس کی ترقی چاہتے تھے، چنانچہ اکثر خطوط میں کفایت شعاری کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ گو اس وقت اس مشورہ پر عمل نہ ہو سکا لیکن زندگی کے تلخ تجربات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ مشورے فضول تھے۔ ہمارے صوبہ کے نامور سوشل ریفارمر رائے بہادر لالہ بیجناتھ صاحب جج نے بھی اصلاح تمدن کے متعلق کئی قابل قدر مضامین زمانہ کے لیے تحریر فرمائے جن کا سلسلہ آنجہانی صاحب کی آخر عمر تک قائم رہا۔ آپ نے عمر بھی اچھی پائی لیکن سوامی جی کو زیادہ مہلت نہ ملی۔ ان کی بے وقت وفات سے جہاں ملک کے روحانی مفاد کو زبردست صدمہ پہنچا وہاں زمانہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا بھی نقصان عظیم ہوا۔ سوامی جی کو بھی اس پرچہ سے خاص محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ مئی ۱۹۰۵ء کے زمانہ کی رسید دیتے ہوئے آپ نے حوصلہ افزائی کے راہ سے لکھا کہ مہراج آپ کا مہربانی نامہ اور زمانہ ملا۔ یہ میگزین حقیقت میں ہر ایک پہلو سے بہت عمدہ ہے۔ اور ضرورت زمانہ کو بہت کچھ پورا کرتا ہے۔ تھوڑے دنوں میں رام کے قلم سے بھی ایک مضمون آپ تک پہونچ رہے گا۔ اوم آنند'

آپ کا رام

اس کے بعد سوامی جی کے کئی بیش بہا مضامین زمانہ میں شائع ہوئے اور ملک میں ان کی خوب قدر ہوئی۔ ان مضامین میں سوامی جی نے واقعی روحانیت کا دریا بہا دیا ہے۔ مولانا شرر مرحوم نے ان کے متعلق ایک مفصل نوٹ اپنے رسالہ دلگداز میں شائع فرمایا تھا۔ جب اس کا شکریہ ادا کیا گیا۔ تو آپ نے ایک نجی خط میں لکھا کہ "واقعی ان مضامین کی پوری تعریف نہیں ہو سکتی ہے۔ میں نے دلگداز میں جو کچھ کہا وہ اس سے بہت زیادہ کے مستحق ہیں"۔

سوامی جی مہاراج آخر دم تک زمانہ کی قلمی سرپرستی فرماتے رہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ آخری فیض جو دنیا کو ان کی ذات قدسی صفات سے پہونچا۔ زمانہ ہی کی معرفت پہونچا یا مضمون "خود ستی یا تمسک عروج" جو زمانہ مئی ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ آپ کے مقدس زندگی کا آخری کام تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی آپ کو پیغام وصل آپہونچا۔

مولانا شرر مرحوم زمانہ کے لیے زیادہ نہ لکھ سکے" تاہم آپ نے دو ایک خاص مضامین عطا فرما کر رسالہ کو مرہون منت فرمایا ہے۔ اسی طرح مولانا شبلی نے بھی ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۴ء میں کئی غزلیں اور ایک خاص نظم عطا فرما کر اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نجی ملاقاتوں اور خطوط میں بھی اکثر زمانہ کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی زمانہ کے ایک خط میں لکھا کہ "زمانہ" کا نیا پرچہ سابق سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ بے شبہہ وہ ہونہار ہے ......"

مضامین کے تقاضے کا جواب آپ نے ایک بار لطیفہ کی صورت میں دیا۔ ملاحظہ ہو۔

"مکرمی۔ مشہور ہے کہ متھرا میں ایک چوبے جی کو صرفی لڈو کی شرح سے کسی نے بہت سے لڈو کھلا دیے۔ یہاں تک کہ پیٹ تن گیا۔ اور سانس اندر سما نہیں سکتا تھا وہ زمین پر پڑے کروٹیں بدل رہے تھے۔ کہ کوئی وید صاحب آگئے۔ انھوں نے ایک دوا دی کہ اس کو کھا لیجیے تو کھانا ہضم ہو جائے گا۔ چوبے جی نے کہا مہراج! پیٹ میں اتنی جگہ ہوتی تو میں اس قدر لڈو ہی کیوں نہ کھاتا۔ بعینہ یہی میرا حال ہے۔ اتنی فرصت ہوتی تو الندوہ میں ہی کیوں نہ لکھتا۔ ... مخزن اور اردوئے معلیٰ میں مدت ہوئی جو کچھ چھپا وہ ایک زیتا بہن کتاب کی عبارت تھی۔ شبلی لکھنؤ ندوہ ۵ جولائی ۱۹۰۵ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لیکن اس کے بعد جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے زمانہ آپ کے کلام سے محروم نہیں رہا۔

شمس العلما مولانا حالی مرحوم و مغفور نے بھی سرسید کی لائف پر ایک مضمون زمانہ میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا تھا۔ لیکن زمانہ کی اس سے کہیں زیادہ خاطر آپ کو مدنظر رہتی تھی۔ جیساکہ آپ کے نوازش نامہ مورخہ ۸ اپریل ۱۹۰۶ء کے اقتباس ذیل سے واضح ہوگا:

"...... جو لکچر سرسید مرحوم کے برسی کے موقعہ پر دیا گیا تھا وہ ان کی لائف (موسومہ بہ حیات جاوید) کا خلاصہ ہے مگر بالکل نامکمل اور ادھورا۔ میں آج اتوار کے سبب اس کو روانہ نہیں کرسکا۔ انشاء اللہ کل ضرور روانہ کردوں گا..... میرے دوست مولوی عبدالحق صاحب نے اکبر کی برسی کے موقعہ پر اس کی لائف اور اس کی پالیسی پر لکچر دیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب تک اکبر پر کسی صاحب نے ایسا عمدہ مضمون نہیں لکھا۔ میں نے سکریٹری انجمن سے زمانہ کے لیے اس کو مانگ لیا ہے، وہ بھی عنقریب ہی آپ کی خدمت میں بھیجدوں گا۔"

آخر یہ قابل قدر مضمون مولانا حالی کی عنایت و توجہ سے زمانہ کے قومی نمبر ۱۹۰۶ء میں جو شہنشاہ اکبر اعظم کی صدسالہ برسی کے یادگار میں شائع ہوا تھا ہدیۂ ناظرین ہوا۔

زمانہ پر مولانا حالی کی مزید عنایات کا حال معلوم کرنا ہو تو ذیل کی سطریں ملاحظہ فرمائیے۔ جو ایک اور خط سے ماخوذ ہیں فرماتے ہیں:

زمانہ کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان منتخب رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو لٹریچر کو ناشائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری آرزو دلی ہے کہ زمانہ نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی و تہذیب میں بھی روز افزوں ترقی کرے اور جو صلح کل مسلک اس نے اختیار کیا ہے اس سے سرمو تجاوز نہ کرے۔

زمانہ کی خوش نصیبی سے تمام بزرگان قوم و رہنمایان ملک کی امداد شامل حال رہی ہے۔

آنریبل پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب مرحوم۔ حضرت شوق، جناب شہری، جناب شاد عظیم آبادی وغیرہ بزرگوں نے بھی قابل قدر مضامین سے زمانہ کی امداد فرمائی ہے۔ حضرت شوق نے ایک مفصل تنقید اس پر لکھ بھیجی تھی جس میں زمانہ کی حوصلہ افزا الفاظ میں تعریف کی گئی تھی۔ لیکن جب ایڈیٹر کو اس کے چھاپنے میں پس و پیش رہا تو صاحب مرحوم نے اسے کسی دوسرے رسالہ میں شائع کرادیا۔ اپنے کمال محبت سے آپ نے کئی بہترین نظمیں ہدیۂ ناظرین رسالہ فرمائیں۔ جناب شہری نے بھی اکثر مضامین سے رسالہ کی قدر افزائی فرمائی۔ پنڈت بشمبھر ناتھ صاحب کے بھی کئی عالمانہ مضامین زیب رسالہ ہو چکے ہیں۔ آپ کا ادبی ذوق آخر عمر تک قائم رہا۔ اور زمانہ و کشمیر درپن دونوں کے لیے آپ نے خوب مضامین تحریر فرمائے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جناب شاد عظیم آبادی نے بھی اپنے علمی احسانات سے مرہونِ منت فرمایا جب کبھی آپ سے کلام کا تقاضا کیا گیا تو آپ نے اپنے الطاف بزرگانہ سے محروم نہیں رکھا۔ چنانچہ آپ کے کئی اہم مضامین نثر اور کئی بلند پایہ نظمیں زیبِ رسالہ ہو چکی ہیں۔ اب وہ موجود نہیں ہیں لیکن ان کے کلام کا دفتر موجود اور اشاعت کا منتظر ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ قدردانانِ اردو آج تک ان جواہر پاروں کے اشاعت کا کوئی انتظام نہ کر سکے۔ شاد مرحوم زندگی میں اکثر اپنے مجموعۂ کلام کے اشاعت سے مایوسی کا اظہار فرمایا کرتے تھے چنانچہ ایک نوازش نامے کا ایک حصہ یہاں پر نقل کیا جاتا ہے۔

"...... خدا جانے کتنی محنتیں کر کے غزلوں اور دوسرے منظومات اور مرثیوں کا ایک دفتر کیا" ان کے علاوہ اور متفرق تصنیفوں عروض و قوافی و معنی و بیان و نصاب تعلیم کے چھوٹے بڑے کتنے ہی رسالے لکھے۔ اب ان چیزوں کے ڈھیر کو دیکھ کر خود دم گھبراتا ہے یقین جانئے ادھر میرا دم نکلا اور یہ کل عمر بھر کا ریاض مٹی میں مل گیا......"

خدا کرے یہ خوف درست ثابت نہ ہو اور ہم اپنے اہلِ کمال کی قدردانی کرنا سیکھیں اور ان کی تبرکات ضائع نہ ہونے پائیں۔

⁘ ⁘ ⁘

ناظرین زمانہ عرصہ تک شمس العلماء، خان بہادر منشی ذکاء اللہ صاحب و شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی سے بھی مستفید ہو چکے ہیں۔ دونوں بزرگوں نے عرصہ تک اس رسالہ کی قلمی اعانت فرمائی۔ مولوی ذکاء اللہ صاحب نے جولائی ۱۹۰۵ء میں یہ تحریر فرمایا تھا کہ "اس پیرانہ سالی میں جس قدر اعانت مجھ سے زمانہ کی ہو سکے گی کروں گا" اس وعدے کو آخر دم تک انھوں نے پورا کر کے دکھا دیا۔ لطف یہ کہ پولیٹکل نقطۂ خیال سے آپ کو زمانہ اور اس کے ایڈیٹر سے اکثر اختلاف رائے رہتا تھا۔ چنانچہ اگست ۱۹۰۷ء کے خط سے جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ "پولیٹکل مضامین تو بہت سے لکھے ہوئے رکھے ہیں مگر وہ سب آپ کے زمانہ کی پالیسی (Policy) کے خلاف ہیں۔ اس اختلاف کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ تاہم اس کے بعد آپ نے زمانہ کے لیے متعدد مضامین لکھے۔ آپ کی وضعداری کی کیا تعریف کی جائے۔ فرشتہ خصلت مسٹر اینڈریوز آپ کے اخلاقِ حمیدہ کا اعتراف فرما چکے ہیں۔ آپ نے اردو مصنفین کے لیے جس قدر تاریخی مسالہ فراہم کیا ہے وہ آپ ہی کا خاصہ تھا۔ آپ کی وقت کی پابندی ضرب المثل تھی۔ ہر کام نہایت قاعدہ اور قرینہ سے کرنے کے عادی تھے۔ پابندیٔ وقت ہی کی بدولت آپ نے ہزارہا صفحوں کی کتابیں لکھ ڈالیں دوسروں کا جس قدر آپ کو خیال رہتا تھا اس سے زیادہ کم لوگوں کو رہتا ہوگا حتیٰ کہ جزئیات پر بھی آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے زمانہ بھیجنے کی ممانعت کی اور لکھا کہ آپ ناحق اپنا پرچہ کیوں بھیجتے ہیں۔ میں پبلک لائبریری میں اس کو دیکھ ہی لیتا ہوں" دنیا کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف تھے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور سرد و گرم زمانہ دیکھ چکے تھے۔ ملک کی قدر دانی کا حال بھی آپ سے پوشیدہ نہ تھا۔ چنانچہ ترقی اردو کی کوششوں کی مالی کامیابی سے قطعی مایوس تھے۔ اسی وجہ سے جب آپ نے سنا کہ ایڈیٹر زمانہ سے وکالت کا امتحان پاس کرنے کے لیے اصرار کیا جا رہا ہے تو آپ نے بھی ایک کارڈ لکھا کہ "مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ وکالت میں امتحان دیں گے۔ خدا آپ کو کامیاب کرے آپ قانونی عزت حاصل کرنے میں سعی کیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مولوی نذیر احمد صاحب کے قلمی احسانات کی ابتدا یہ ہے کہ ١٩٠٥ء میں آپ نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے لیے ایک عالمانہ لکچر تیار کیا تھا۔ لیکن باہمی مخالفت کے باعث اس سال انجمن کا اجلاس برہم ہو گیا تھا۔ جس سے مولوی صاحب اپنے لکچر کا ایک لفظ بھی انجمن میں نہ پڑھ سکے، چنانچہ آپ نے از راہ محبت اسے لکھ کر بھیج دیا۔ کہ آپ اسے زمانہ کے صفحوں میں جگہ دیجئے اور دفعۃً یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے جدا آپ مناسب سمجھیں شائع کیجئے۔" مگر اس سے ناظرین کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ مولوی نذیر احمد صاحب کے مضامین آسانی سے مل جاتے تھے۔ درحقیقت مولوی صاحب بڑے نازک مزاج واقع ہوئے تھے، چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے تقسیم بنگالہ کے ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں سودیشی تحریک کا زور شور تھا۔ اور زمانہ میں بھی اس کے متعلق اکثر مضامین شائع ہوئے تھے۔ اسی سلسلہ میں ایڈیٹر زمانہ نے اس مسئلہ سے متعلق اکثر بزرگان ملک سے استصواب رائے کیا تھا۔ مولوی صاحب کو اظہار رائے کی تکلیف دی گئی اور جواب کے لیے ایک ٹکٹ دار لفافہ بھی ان کے خط میں رکھ دیا۔ مگر آپ نے اسے پسند نہیں فرمایا۔ اور فوراً ہی یہ لکھ بھیجا کہ "اب تو آپ کھینچ تان کر مجھ کو کارسپانڈنٹی کے راستے پر ڈال چلے جو میری عادت اور میرے مزاج کے خلاف ہے۔ رسالوں اور اخباروں کی کارسپانڈنٹی وہ کرتا ہے جس بدنصیب کو شہرت کا دوسرا ذریعہ میسر نہیں، شکر ہے خدا نے مجھ کو اس بے حرمتی سے بچایا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

بہر حال اس مبحث پر آپ نے کچھ نہیں تحریر فرمایا گو اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی زمانہ کو کئی قیمتی مضامین عطا فرمائے سچ ہے۔ بزرگوں کا مزاج تولہ ماشہ ہوتا ہے کبھی ذرا سی بات میں خوش ہو جاتے ہیں اور کبھی ناخوش لیکن ان کی ناخوشی دیرپا نہیں ہوتی۔ چنانچہ مولوی نذیر احمد صاحب بھی اپنے سے کم عمر والوں سے ہمیشہ مراعات ہی سے پیش آتے تھے۔ مگر اب یہ باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ زمانہ کی پرانی جلدیں دیکھ کر یہی خیال رہ رہ کر آ رہا ہے کہ پچیس سال پہلے ملک میں کیسے کیسے نامور انشا پرداز موجود تھے جو اس اثنا میں ہماری نظروں سے ہمیشہ کے لیے پنہاں ہو گئے۔ رائے بہادر لالہ نہال چند صاحب بھی جن کی نسبت اکبر مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں۔ کہ "ذرا ان کے فیض کا کبھی ہوتا نہیں تھا بند" زمانہ کے قلمی معاون تھے۔ نواب وقار الملک صاحب بہادر نے بھی زمانہ کے لیے ایک خاص مضمون لکھا تھا۔ لیکن جب محب وطن کے سلسلے میں یہ مضمون حوالہ قلم ہوا تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس کے احسانات کا ہم کیا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔ نواب صاحب موصوف نے مولوی عزیز احمد صاحب مرحوم ہوم ممبر سرکار نظام کے متعلق ایک مفصل مضمون تحریر فرمایا تھا۔ عزیز مرزا صاحب کے بہت سے مضامین زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں ان کا ہر مضمون ناظرین کے لیے ایک درجہ کی علمی ضیافت ہوتا تھا۔ جس خلوص اور محبت سے مولوی عزیز مرزا صاحب اس رسالے کیلئے مضامین لکھا کرتے تھے اس کی یاد دل سے کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ آپ کی محبت و قدردانی کا ایک مزید ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کتابی صورت میں بھی اپنے بلندپایہ مضامین کے مجموعہ کی اشاعت کا حق ایڈیٹر زمانہ ہی کو عنایت فرمایا ہے۔ آپ کی عملی ہمدردی اور علمی قدردانی کی کیفیت ایک اور واقعہ سے بھی معلوم ہو گی۔ آپ نے ایک دفعہ رسالہ کی مالی مشکلات کا حال سنا تو بلا کسی تحریک کے از خود رسالہ کی توسیع اشاعت کی عملی کوشش کی اور حیدرآباد میں زمانہ کے سو کے قریب خریدار بنا لئے اور ان سے رسالہ کی سالانہ قیمت وصول فرما کر دفتر میں روانہ کر دی۔

اسی طرح ہمارے دوست کرنیل بھولا ناتھ صاحب اور رائے شمبھو ناتھ صاحب رئیس کان پور نے ایک دفعہ رسالہ کی امداد فرمائی تھی۔ ورنہ ۱۹۰٦ء کے بعد سے بارہ سال مسلسل ہزارہا روپیہ کا نقصان یکہ و تنہا ایڈیٹر رسالہ ہی کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ ع

جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

بہرحال مولوی عزیز مرزا صاحب کی ذات گرامی سے زمانہ کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، مگر آپ کی بے وقت وفات نے ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ ہمارے محبان وطن اس قدر جلد داغ مفارقت دے جاتے ہیں۔ مولوی عزیز مرزا کی زندگی کچھ اور وفا کرتی تو اردو ادب کے لیے وہ بہت کچھ کر جاتے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔

منشی کندن لال شرر سہارن پوری، رائے پربھو لال حیدرآبادی، سرور جہان آبادی، منشی نوبت رائے نظر لکھنوی، اور پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کی وفات بھی بہت بے موقعہ ہوئی۔ ان حادثات سے نہ صرف زمانہ ہی کو بلکہ اردو ادب کو بہ حیثیت مجموعی ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ شرر صاحب کی بہترین نظمیں زمانہ کی پرانی جلدوں میں محفوظ ہیں ان کو دیکھ کر آج بھی ان کی الکلامی کی داد دینا پڑتی ہے۔ آپ کی موجودگی میں جب کبھی ہندو اتہاس کے متعلق کوئی تصویر رسالہ میں شائع ہوئی تو آپ ہی سے اس پر نظم لکھنے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ ہمیشہ ہماری درخواست کو بخوشی قبول فرماتے تھے۔ اس دوستانہ نوازش کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ آپ نے تمام زندگی کبھی ہماری درخواست کو رد نہیں کیا۔ اب بھی آپ کی بعض بعض نظمیں پڑھ کر بے اختیار یاد آتی ہے۔ اب بھی بزم زمانہ میں آپ کی جگہ خالی ہے۔ اب بھی آپ کی قوم آپ کا ماتم کر رہی ہے۔ آج آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن آپ کا دلکش کلام ہمارے دلوں کو مسرور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کرنے کو اب بھی باقی ہے۔ اور جلد یا دیر کبھی نہ کبھی کتابی صورت میں شائع ہوگا اربعہ عناصر سے لیکر اہم سے اہم عنوانوں پر آپ نے نہایت شگفتہ نظمیں لکھی ہیں۔ جن کی بدولت آپ کا نام عرصہ تک یادگار زمانہ رہے گا۔

پربھو لال صاحب کی مذہبی مضامین اور فلسفیانہ تحریریں آپ ہی اپنی جواب ہوتی تھیں مشہور مرہٹہ لیڈر شیواجی پر جس تحقیق و تفتیش سے آپ نے ایک طولانی سلسلۂ مضمون لکھا تھا۔ اس کی داد دینے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ گیتا کے فلسفہ کو جس عام فہم پیرایہ میں آپ نے ناظرین زمانہ کے ذہن نشین فرمایا اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال بڑے بڑے اہم مسائل و ہدایت کے متعلق آپنے ناظرین زمانہ کے لیے ایسے مشرح اور مفصل مضامین تحریر فرمائے کہ ایک معمولی اردو خواں شخص بھی ان سے بخوبی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر اب یہ سب باتیں روانیوں میں داخل ہو گئیں۔ اسی طرح جب سرور جہاں آبادی نظر لکھنوی اور چکبست مرحوم کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک درد سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ آہ اب یہ صورتیں کہاں دیکھنے کو نصیب ہونگی۔ سرور جہاں آبادی صرف سینتیس ۳۷ برس کی عمر میں ہم سے جدا ہوگئے۔ لیکن چکبست نے چوالیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ نوبت رائے صاحب نے ۵۰ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ لیکن چند سال کے علاوہ فارغ البالی کی زندگی بسر نہ کر سکے۔ اردو شاعری آج بھی ان تینوں باکمالوں کا ماتم کر رہی ہے۔ تینوں حضرات زمانہ کے مسند نشینوں میں تھے۔ زمانے کو بھی ان تینوں صاحبوں پر ہمیشہ فخر و ناز رہے گا۔ اور ان کی یاد کبھی دلوں سے محو نہیں ہو سکتی۔ درحقیقت ان کی سخنوری کے چرچے اس وقت تک باقی رہیں گے جب تک اردو زبان کے نام لیوا دنیا میں موجود ہیں۔ چکبست صاحب زمانہ کے اجراء کے چند ہی ماہ بعد سے زمانہ میں اپنی نظمیں عطا فرمانے لگے۔ اور یہ سلسلہ ان کی زندگی بھر قائم رہا ہے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں وہ ہم سے جدا ہوئے اور نومبر ۲۵ء کے پرچے میں ان کی آخری نظم شائع ہوئی ہے۔ موجودہ ایڈیٹر زمانہ کی ادارت میں پہلا پرچہ نومبر ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا ہے۔ چنانچہ اسی نمبر سے چکبست صاحب کی نظموں کی اشاعت شروع ہوئی۔ اس پرچہ میں جسٹس رانا ڈے کا نوحہ وفات شائع ہوا۔ اور اس کے بعد بیسیوں مضامین اور بیسیوں نظمیں مرحوم نے زمانہ کی خاطر لکھیں۔ مضامین نثر میں سرشار، اور داغ دہلوی پر وہ خاص مضامین ایسے لکھے کہ اس موضوع پر ان سے بہتر مضامین آج تک اردو میں نہیں لکھے گئے۔ چکبست جس طرح نظم میں انیس کے مقلد تھے۔ اسی طرح نثر میں انھوں نے صاحب آب حیات کے طرز تحریر کا متتبع کیا۔ دونوں میں ان کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ چنانچہ جس طرح ان کی نظمیں پرجوش اور برجستہ ہوتی تھیں۔ اسی طرح نثر بھی نہایت شگفتہ اور پرزور لکھتے تھے۔ ان کے منتشر مضامین ان کے مذہبی خیالات ان کی فکر رسا کے نمونے دیکھ کر دوست و دشمن سب کو ان کی قادر الکلامی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ چکبست کے کلام نے ان کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا ہے، ہماری آیندہ نسلیں فخر سے پڑھیں گی اور ان کے کمال فن کی داد دیں گی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سرور جہاں آبادی کی نظمیں دل میں جذبات کا تلاطم برپا کر دیتی ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک بحرِ ناپیدا کنار کی سی روانی ہے۔ ان کی طبیعت سمندر کی طرح گہری۔ ان کا خیال سربفلک پہاڑوں کی چوٹیوں کی طرح بلند تھا شعر کہنے بیٹھتے تو کاغذ پر اپنے جگر کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیتے تھے۔ جو سوز و گداز ہم کو سرور کے کلام میں ملتا ہے، اسے کسی دوسرے شاعر میں ڈھونڈھنا فضول ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں شاعری ہی کے لیے بنایا تھا، اور شاعری کے سوا انھیں کچھ اور آتا بھی نہیں تھا بہر حال ان کی سچی تشبیہیں ان کے نئے استعارے، عمیق جذبات۔ حسن و عشق کی معاملہ بندیاں، دلوں میں چٹکیاں لیتی ہیں۔ سرور کی مختلف نظمیں دیکھ کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کمال فن روز افزوں ترقی کر رہا تھا اور وہ اپنے معراج شاعری تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم سے چھین لیے گئے۔ اگر یہ باکمال شاعر صرف دس برس بھی اور زندہ رہ سکتا تو اردو شاعری کی حالت کیا سے کیا ہو گئی ہوتی۔ کمبخت شراب کا برا ہو جس نے عنفوان شباب ہی میں اس یکتائے زمانہ شاعر کے پیمانۂ عمر کو لبریز کر دیا۔ سرور کو زمانہ اور ایڈیٹر زمانہ سے کیسی سچی محبت تھی۔ روپے کی انھیں پروا نہ تھی۔ پابندی سے کام کرنے کے لائق نہ تھے۔ علایق کی فکر سے بالکل آزادی ہو چکے تھے، جس کی وجہ سے معاش کی چنداں فکر نہ تھی۔ مگر سالہا سال سے ان کا یہ درجہ رہا کہ مہینوں آکر دفتر زمانہ میں قیام فرماتے۔ شروع میں چند ماہ دفتر میں باقاعدہ کام کرنے کی کوشش بھی کرتے لیکن مزاج کی وارفتگی سے عرصہ تک یہ پابندی نبھا نہ سکتے۔ لیکن اس سلسلے میں جو اس باہمی قائم ہو گیا وہ آخر دم تک بڑھتا ہی رہا اور سرور کبھی زمانہ اور اس کے ایڈیٹر سے بے تعلق و بے پروا نہ رہ سکے۔ اگر کبھی کسی وجہ سے خط و کتابت میں ذرا سی بھی غفلت ہوئی تو سرور صاحب ایسا تقاضا شدید کرتے کہ شرمندگی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ لگتا تھا۔ انھیں موقعوں میں سے ایک موقعہ پر ذیل کی پر لطف نظم ہاتھ لگی۔

بھیجا نہ کوئی پرچہ لکھ کر ذرا ہِ شفقت — اگلی سی کیا نہیں وہ مجھ پر نگاہ شفقت

کہنا مرے مکرم سے اے نسیم جاکر — دیوار خاموشی ہے کیوں سدِّ راہ شفقت

شرمندۂ کرم ہے اب تک غلام دیریں — اگلی نوازشیں ہیں اب تک گواہ شفقت

تم وہ، تمہاری شفقت خوگر وہ تغافل — ہیں وہ مجھے تغافل پہ اشتباہِ شفقت

آنکھیں بچھائے بیٹھا ہوں کوئے آرزو میں — چشم کرم ادھر بھی صاحب! ذرا ہِ شفقت

تم کو قسم ہے میری حرماں نصیبوں کی
ہیں کب سے منتظر ہوں مجھ پہ نگاہِ شفقت

اس قسم کی شعر و شاعری کا روزانہ سلسلہ رہتا تھا۔ نظموں کی فرمائشوں پر فرمائشیں ہوا کرتیں کبھی انگریزی نظموں میں نشان کرکے ان کا ترجمہ کی درخواست ہوتی کبھی نثر کے خاکے تیار کرکے پیش

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کیے جاتے۔ بہر حال یہی چرچا رہتا۔ اور سرور مرحوم اپنے خوش اخلاقی، نیک نفسی اور قادر الکلامی سے ہمیشہ ممنون و مرہون فرمایا کرتے تھے۔ لیکن فلک ناہنجار اس لطف صحبت کو دیکھ نہ سکا۔ سرور صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ان کی شراب خواری تھی۔ پے در پے خانگی حادثات کی بدولت وہ اپنا غم غلط کرنے کے خیال سے اس میں مبتلا ہو گئے اور تمام احباب کی مسلسل کوششوں کے باوجود اس میں اعتدال قائم نہ رکھ سکے۔ موصوف کی یہ پہلی اور آخری کمزوری تھی ورنہ کسی حیثیت سے ان کے اخلاق کے متعلق کوئی شخص آدھی بات بھی نہیں کہہ سکتا ہے۔ سرور صاحب کی نیک نفسی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جو لوگ تمام عمر تائب رہ چکے ہیں ان کو بھی سرور کے خاطر مدارات میں عذر نہ ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ سرور بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے، لیکن آخر اسی کمبخت شراب ہی نے ان کی جان بھی لی۔

منشی نوبت رائے نظر لکھنوی بھی کئی سال تک زینت افزائے بزم زمانہ رہے ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں رسالہ کا مقام اشاعت بریلی سے کانپور میں تبدیل ہو گیا۔ یہاں طباعت وغیرہ کے انتظام کے لیے ایک مہتمم کی ضرورت پڑی۔ چنانچہ نظر انتخاب نظر صاحب ہی پر پڑی۔ آپ کا مشہور رسالہ خدنگ نظر، مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ مگر دل میں ادبی خدمت کا ذوق تھا۔ اس لیے نظر صاحب نے بھی اس خدمت کو دوسرے کاموں پر ترجیح دی۔ بہرحال کئی سال تک وہ منیجری کے فرائض ادا کرتے رہے۔ وہ خود بھی اچھے مصور اور خوش نویس تھے اور کتابت و طباعت دونوں سے بہ حیثیت فن بخوبی واقف تھے۔ اہتمام کے علاوہ حصۂ نظم کی ترتیب کا کام بھی آپ کے ذمہ تھا۔ زمانہ قیام کانپور میں آپ نے رسالہ کے لیے کئی خاص مضامین بھی لکھے۔ جن کو پڑھ کر آج بھی آپ کی قابلیت کا قائل ہونا پڑتا ہے، نظر صاحب کا ادبی مذاق نہایت سنجیدہ واقع ہوا تھا۔ ان کی طبیعت غیور، مزاج نفاست پسند اور خودداری لیے ہوئے تھا۔ غضب کے طباع اور ذہین تھے۔ گو انگریزی ہائی اسکول کا معمولی کورس بھی ختم نہ کیا تھا لیکن دقیق سے دقیق مضامین کا بخوبی ترجمہ کر لیتے تھے۔ آپ کی ذہانت کا یہ حال تھا کہ گو زمانہ میں آنے سے پہلے انھوں نے کبھی طرز جدید کی کوئی تنقید نہیں لکھی تھی لیکن چند ہی اشاروں اور مشوروں کے بعد آپ کو تنقید نگاری میں ملکہ حاصل ہو گیا۔ آپ کی پہلی تنقید "نقاد لکھنوی" کے نام سے جون ۱۹۰۵ء کے زمانہ میں مثنوی گلزار نسیم کے متعلق شائع ہوئی تھی اس کے بعد آپ کی اکثر عالمانہ تنقیدیں شائع ہوتی رہیں۔ منیر شکوہ آبادی، داغ دہلوی، رجب علی سرور پر آپ کے مضامین آج بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ زمانہ میں ایک سلسلۂ مضامین اردو رسالوں کے حصہ نظم کی تنقید کا بھی شروع کیا گیا تھا۔ یہ بھی نظر صاحب ہی کا لکھا ہوتا تھا۔ وفات سے ماہ سوا ماہ قبل "خطوط اکبر" پر آپ نے ایک آزادانہ اور عالمانہ تنقید زمانہ میں لکھی تھی جس سے آپ کے بلند پایہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

معیار کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ زمانہ میں چند سال رہ کر آپ انڈین پریس چلے گئے تھے جہاں سے اردو کا مشہور رسالہ ادیب آپ کی ایڈیٹری میں جاری ہوا۔ ڈیڑھ سال بعد ۱۹۱۱ء میں ایک واقعہ کے سبب سے مستعفی ہو کر لکھنؤ واپس آگئے۔ اور بعد چندے پھر کانپور آکر زمانہ کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ یہاں ان دنوں ہفتہ وار "آزاد" کے اجراء کی تیاریاں ہو رہی تھیں، چنانچہ اس دفعہ آپ نے اخبار کا بھی کچھ کام اپنے ذمہ لیا۔ شروع شروع میں آپ کو اس سے کسی قدر حجاب تھا۔ انھیں اس کا عملی تجربہ بھی نہ تھا لیکن چند روز کام کرنے کے بعد آپ نے اس میں بھی کافی مہارت پیدا کر لی۔ اور ایڈیٹوریل نوٹ وغیرہ لکھنے لگے۔ لیکن والدہ کی علالت و تنہائی کے خیال سے وہ اس مرتبہ زیادہ دنوں تک کانپور نہ رہ سکے۔ آخر احباب نے مطبع نولکشور لکھنؤ میں ان کے لیے گنجائش نکال دی، جہاں آپ پہلے اخبار تفریح اور بعدہٗ اودھ اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ آپ کے وقت میں اودھ اخبار کی کایا پلٹ ہو گئی اور صوبہ کا قدیم ترین پرچہ بھی رفتار زمانہ سے متاثر نظر آنے لگا۔ لیکن اس کی اصلاح و ترتیب میں جو محنت شاقہ کرنا پڑی اس کا بار آپ کی طبیعت دیر تک اٹھا نہ سکی۔ پے در پے خانگی حادثات نے طبیعت کو اور بھی نڈھال کر دیا تھا۔ پہلے ان کا چہیتا نواسہ پھر والدہ اور اس کے بعد اکلوتی لڑکی داغ مفارقت دے گئی۔ چند ہی دنوں بعد اودھ اخبار سے بھی قطع تعلق ہو گیا۔ جس کے بعد آپ کا اطمینان قلب ہی رخصت ہو گیا آخر ۱۰ اپریل ۱۹۲۳ء کو آپ خود بھی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ کا مجموعہ کلام بہت مختصر ہے لیکن جو کچھ ہے لوح دل پر نقش کرنے کے لائق ہے۔ ان کی شاعری پر خواجہ آتش کا مقولہ صادق آتا ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ نگینہ کی طرح اپنی جگہ پر جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے اپنے اشعار کے حرف حرف پر غور کامل فرمایا کرتے تھے۔ نظر ثانی سے کبھی ان کا جی نہیں بھرتا تھا۔ جب دیکھیے کچھ نہ کچھ ردو بدل کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان کی صفائی۔ بندشوں کی چستی، مذاق کی شستگی، اور فکر کی بلندی میں وہ اکثر معاصرین سے گوے سبقت لے گئے۔ نظر صاحب کلام میں ندرت مضامین اور جدت بیان دونوں ملحوظ رکھتے تھے۔ ان کا ہر شعر رقت نظری کا نمونہ ہوتا تھا۔ بھرتی کے اشعار سے انھیں دلی نفرت تھی۔ معمولی بات کو بھی نئے پیرایہ میں کہنے کی کوشش کرتے جس سے فصاحت و بلاغت کا انتہائی لطف ان کے کلام میں پیدا ہو گیا ہے۔ کبھی کوئی پیش پا افتادہ مضمون آپ نے نظم ہی نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس دھن میں رہتے تھے کہ جو بات کہیں اسے سن کر لوگ پھڑک اٹھیں۔ افسوس نظر صاحب کو زندگی میں مالی اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوا۔ فارغ البالی میسر ہوتی تو شاید ان کے کلام میں یہ سوز و گداز بھی نہ ہوتا طبیعت میں خودداری کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس سے اور بھی قباحت ہوتی تھی۔ اس لیے ان کے کلام میں اکثر خوددارانہ پاس کی جھلک نمایاں ہے۔ آپ نے ایک دوست کو ایک قصیدہ لکھ کر دیا تھا۔ جس میں شکوہ بخت کے سلسلے میں آپ کا ایک شعر قابل اقتباس ہے۔ فرماتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بے بہا جنس کی صورت ہوں یہاں میں بیکار
بکنے بھی جاؤں تو اٹھتے نہیں بازار میں دام

اسی انداز کے دو ایک شعر ملاحظہ ہوں۔

مئے کو دنیا آتش سیال کہتی ہے لیکن
اپنے جام میں آتے ہی پانی ہوگئی

⁂

مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے
وہ یک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے

⁂

اے انقلاب عالم تو بھی گواہ رہنا
کاٹی ہے عمر ہم نے پہلو بدل بدل کر

ناموافق حالات کی وجہ سے ان کی بعض نظمیں دوسروں کے حوالہ ہوگئیں، تاہم جس قدر مجموعہ کلام انھوں نے اپنے دیوان کے لیے باقی رکھا وہ بھی ان کے نام کو عرصہ دراز تک روشن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ سچ ہے۔

چشم و چراغ دہر تھا پوچھتے ہو نظرؔ کو کیا
سرمہ ہے اسکی خاک بھی دیدہ روزگار میں

⁂

لکھنؤ کے نادر شعرا جناب آبرؔ و نادر کاکوروی بھی زمانہ کے خاص معاونین میں تھے۔ لیکن ان کا شمار بھی مرحومین میں ہے۔ پنڈت بشن نرائن صاحب آبر اردو کے اچھے شاعر انگریزی کے بلند پایہ ادیب نامور نقاد سخن اور ملک کے مشہور رہنما تھے۔ یوں تو شروع ہی سے آپ زمانہ کے سرپرست رہے لیکن جب آپ بہ سلسلۂ علالت المورٔہ تشریف لے گئے تو آپ کی ملاقات ایڈیٹر زمانہ کے ایک دلی دوست اور قریبی عزیز ڈاکٹر مادھوسرن صاحب نگم (مرحوم) سے ہوگئی جو خود بھی اسی نامراد مرض میں مبتلا تھے جس کے پنڈت صاحب عرصہ سے شکار تھے: فرشتہ خصلت مادھوسرن نے شروع ہی سے زمانہ کی اعانت و امداد کو اپنا فرض سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ جب المورٔہ میں انکا اور پنڈت صاحب کا ارتباط بڑھا تو انھوں نے زمانہ کے لیے پنڈت صاحب سے ایک اچھا خاصہ دیوان حاصل کر لیا۔ آبر صاحب نے اس مجموعہ کی سب غزلیں عزیزی مادھوسرن جی کے تفنن طبع کے لیے کہی تھیں، اور ان پر انھیں اختیار کامل دے دیا تھا کہ جو چاہیں کریں۔ چنانچہ یہ مجموعہ ان دونوں اصحاب کی باہمی محبت کی یادگار ہے۔ اس کی غزلیں مختلف موقعوں پر مادھوسرن جی مرحوم نے خود اپنے قلم سے نہایت خوشخط لکھی ہیں۔ جناب آبر نے اس کی نظر ثانی کر دی ہے۔ جس کاپی پر یہ کلام نقل کیا گیا ہے وہ اسکول کی ایک معمولی اکسرسائز بک ہے جس میں نام کی جگہ ڈاکٹر مادھوسرن نے اپنا نام کلاس کی جگہ "مجبوری" اسکول کے نام کے سامنے "عالم فانی اور سبجکٹ کے خانے میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"دق" لکھا ہے۔ آج یہ دونوں محب عالم بالا میں ہیں لیکن ان کی محبت کی نشانی اب تک اسی طرح محفوظ ہیں اور شاید کسی وقت دنیا کے روبرو پیش کر دی جائے۔ در صاحب نے مادھو سرن جی کے وفات (۱۹۱۱ء) کے بعد زمانہ پر خاص نظر عنایت مبذول فرمائی۔ چنانچہ اس بیاض میں خاص خاص مقامات پر پنسل سے نشانات بنا کر بہت سے اشعار خود انتخاب فرمائے ہیں، اس غزل کے آخر میں جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

دنیا میں درد کے لیے گر آفریدہ ہوں ۔۔۔ یارب کسی یتیم کا اشک چکیدہ ہوں

آپ نے خود دفتر زمانہ میں تشریف لا کر یہ دو اشعار پنسل سے اضافہ فرما دیئے تھے۔

میں کیا خراب محفل زنداں میں ہونگا شیخ ۔۔۔ ایمان کسی کا ہوں، نہ کسی کا عقیدہ ہوں
خاموشی کا اشارہ یہ ہے گوش عقل سے ۔۔۔ مجھ کو بھی سن کہ میں سخن ناشنیدہ ہوں

یہاں پر آپ کے چند اور اشعار بھی ناظرین پر بار نہ ہوں گے۔

نہ ٹپکا آنکھ سے جو اشک غم لہو ہو کر ۔۔۔ وہ میرے دل میں رہا خون آرزو ہو کر

⁂ ⁂ ⁂

کہیں آشنا بہ بادی ہوں ملن سمندر گزرتا ہے ۔۔۔ میں روتا ہوں اگر دیوار میں پانی بھی مرتا ہے

⁂ ⁂ ⁂

کیسی میخانہ میں یہ تفرقہ پردازی ہے ۔۔۔ خم سے شیشہ ہے جدا شیشہ سے پیمانہ جدا

⁂ ⁂ ⁂

نظر آتے نہیں جو چشم بلبل کو بھی گلشن میں ۔۔۔ نگاہ شوق چن لیتی ہے ان پھولوں کو دامن میں

⁂ ⁂ ⁂

گھیرے ہیں آرزوئیں جبتک ہے جان تن میں ۔۔۔ ہے شمع سے ہجوم پروانہ انجمن میں

⁂ ⁂ ⁂

میں ہوں رنگ آئینہ آبریاں میں برآئی نیکر کہ ۔۔۔ نہ کدورت دل دشمناں نہ غبار خاطر یار ہوں

⁂ ⁂ ⁂

جن اصحاب نے پندرہ سال پیشتر زمانہ کے صفحات میں نادر کاکوروی کی بے نظیر نظمیں "مقدس سرزمین"، اور "بہارستان"، "مادرِ ہند"، "دعوت گل"، "شعاع امید"، "شمع امید"، "نغمہ شاعری" وغیرہ ملاحظہ فرمائی ہیں ان کے دلوں سے اس محب وطن شیریں بیان شاعر کی یاد آسانی سے محو نہیں ہو سکتی ہے۔ افسوس نادر کاکوروی صرف ۴۵ سال کی عمر میں اکتوبر ۱۹۱۳ء میں داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے دل میں ملکی محبت کا شعلہ جزن تھا۔ اردو شاعری میں اصلاح کے حامی تھے اور طرز جدید میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

خوب خوب نظمیں کہتے تھے۔ جو اردو کے مشہور پرچوں میں چھپ کر مقبول عام ہوتی تھیں۔ جب سے زمانہ کا سلسلہ جدید شروع ہوا۔ آپ اپنی بہترین نظمیں اسی رسالے کی نذر کرنے لگے۔ اکثر تصویروں کے متعلق آپ نے خاص نظمیں بھی کہہ کر اپنے زور طبع کا ثبوت دیا ہے۔ ایڈیٹر رسالہ کے ساتھ آپ کی محبت کا کیا ذکر کیا جائے ۱۹۱۲ء میں جب راقم الحروف کے برادر خورد مسٹر رام سرن نگم کی شادی ہوئی تو آپ نے ایک مرصع سہرا کہہ کر بھیجا تھا جس کی شاعرانہ خوبیوں کا لطف دل میں اب تک باقی ہے۔ چند شعر آپ بھی سنئے :۔ فرماتے ہیں :۔

ہے جلوۂ برق طور سہرا ہے ساعد صاف حور سہرا
ہے موج دریائے نور سہرا ہے جوش جام بلور سہرا

نسیم جنت کی چل گئی تھی اسی کی اک موج ہو یہ باقی
بہار فردوس ہنس پڑی تھی اسی ہنسی کا ظہور سہرا

پری نے پیچھے سے راجہ اندر کے سر پہ ڈالا ہو اپنا آنچل
جو یہ نہیں ہے تو ہیں کہوں گا ہے طرۂ زلف حور سہرا

فلک پہ رحمت برس رہی ہے زمیں پہ گنگا اتر رہی ہے
ہے رحمتوں کا نزول سہرا ہے برکتوں کا وفور سہرا

افسوس موت نے بہت جلد اس شاعر شیریں بیان کو بھی ہم سے چھین لیا۔ اردو شاعری کی بڑی بڑی امیدیں مرحوم کی ذات سے وابستہ تھیں۔

دیگر شعرائے اردو میں جو ہمارا ساتھ دینے کو موجود نہیں ہیں مگر جن کی حسن سلوک کی زمانہ کی گذشتہ جلدیں گواہ ہیں سید غلام آدہ یسین دہلوی۔ جناب شفق عماد پوری۔ مسٹر اماشنکر فنا، رنگ بلند شہری، سید وجاہت حسین صدیقی جناب افق لکھنوی۔ حضرت طالب بنارسی گہر لکھنوی۔ وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نثر میں لالہ بالمکند گپتا، پروفیسر مرزا حیرت۔ مولوی شفیع الدین مرادآبادی۔ سردار لال سنگھ۔ سید علی سجاد عظیم آبادی۔ کنور کامتا پرشاد۔ قاضی کبیر الدین۔ مسٹر عبدالرحمن سہواروی مولانا سعید احمد۔ لالہ دیوی دیال صاحب۔ لالہ مدن گوپال ایم۔ اے۔ مسٹر رام شنکر پرشاد ایڈیٹر تفریح۔ منشی جالپا پرشاد ایڈیٹر اودھ اخبار۔ رائے بہادر پیارے لال۔ رائے بہادر لالہ رانج دیال۔ منشی دیبی پرشاد مورخ راجپوتانہ۔ پروفیسر نانک پرشاد۔ پنڈت مادھورام وکیل انبالہ وغیرہ اہل قلم کے احسانات فراموش ہونے کے قابل نہیں ہیں۔ خصوصاً منشی دیبی پرشاد صاحب مصنف جو دھپور جس نظر محبت سے زمانہ کو دیکھتے تھے اس کی یاد سے آج بھی دل کو مسرت ہوتی ہے۔ آپ کے اکثر محققانہ تاریخی مضامین زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ تاریخ راجپوتانہ قدیم سکہ جات۔ اور پرانی زمانہ کی مصوری سے آپ کو تمام عمر ایک خاص دلچسپی رہی۔ آپ کی عطیہ تصویریں اکثر زمانہ میں ہدیہ ناظرین ہو چکی ہیں۔ آپ ہمیشہ رسالہ کو غائر نظر سے دیکھا کرتے تھے اور جب کبھی کوئی بات آپ کو کھٹکتی تو فوراً ہی ایڈیٹر کو اس کی اطلاع دیتے۔ عجیب باوضع بزرگ تھے! اب ایسے بزرگ کہاں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دیکھنے کو نصیب ہوں گے۔ مشہور محب وطن مادھورام صاحب وکیل انبالہ کا پچھلے ہی سال انتقال ہوا ہے آپ بھی زمانہ کے اولین مضمون نگاروں میں تھے اور باوجود عدیم الفرصتی۔ آپ نے اس کے لیے نہایت محبت و محنت سے بیسیوں مضامین لکھے، عدہا معاملات میں ایڈیٹر زمانہ کو قابل قدر مشورے دیئے۔ بنارس کانگریس کے موقعہ پر جس خلوص و محبت کا آپ نے زبانی اظہار فرمایا جس شفقت بزرگانہ کے ساتھ آپ ہر سال راقم الحروف کو پہلے انبالہ پھر سولن میں مدعو فرمایا کرتے آج اس کی یاد آتی ہے تو دل میں ایک درد سا پیدا ہونے لگتا ہے۔ افسوس مکروہات دینوی نے ایک دفعہ بھی تعمیل ارشاد کی اجازت نہ دی۔ دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئیں اور ہمارے ممدوح کو سفر آخرت پیش آ گیا۔ پنڈت مادھورام صاحب کو ملکی فلاح و بہبود کے عام مسائل میں دلچسپی تھی۔ ان کا دل حب الوطنی سے سرشار تھا دن رات انھیں باتوں پر جن پر ملکی ترقی کا دار مدار ہے غور تھا۔ چنانچہ آپ نے زمانہ میں مختلف مسائل ملکی و تمدنی پر مضامین لکھے ہیں جن سے آپ کے خلوص اور حب الوطنی مترشح ہوتی ہے۔ موت سے ایک سال قبل آپ نے ہماری قومی ضروریات پر ایک قابل قدر سلسلہ مضامین لکھا تھا بہرحال جب کبھی زمانہ کے لیے آپ سے کسی خاص مضمون کی درخواست کی گئی تو آپ نے کبھی مایوس نہیں فرمایا۔ اس حسن سلوک کو یاد کر کے بے اختیار یہی دعا نکلتی ہے کہ ایشور آپ کی روح پر فتوح کو اپنی سایۂ عاطفت میں جگہ دے۔

لالہ بالمکند گپتا ایڈیٹر بھارت مترکا ذکر اوپر آ چکا ہے آپکے خلوص و محبت کو یاد کر کے اب بھی دل بشاش ہو جاتا ہے۔ لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ آپ جیسا جوہر شناس قدرداں محب دنیا میں باقی نہیں ہے تو تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لطف یہ کہ آپ قدیم خیال کے کٹر ہندو تھے۔ تاہم آپ کا زاویۂ نگاہ اور علمی نقطۂ خیال بلند تھا جس سے آپ آسانی سے تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیتے تھے۔ ادنیٰ تعصبات سے آپ کی طبیعت بری تھی۔ لیکن روزمرہ روش اور طرز معاشرت میں آپ قدیم وضع کے سختی سے پابند تھے۔ سوشل ریفارم کے مسئلہ میں آپ کو زمانہ کی پالیسی سے بے حد اختلاف رائے تھا۔ لیکن رسالہ کی ترتیب و تدوین میں جو محنت کی جاتی تھی اس کی آپ سے زیادہ کوئی شخص داد نہ دیتا تھا۔ آپ جب کلکتہ سے اپنے گھر کے گاؤں جاتے تو ہمیشہ خواہ تھوڑی دیر ہی کیوں نہ ہو ایڈیٹر زمانہ سے ملنے کے لیے کانپور ضرور ٹھہر جاتے تھے، شروع شروع میں تصویروں کی اشاعت میں آپ سے قابل قدر امداد ملی ہے چنانچہ اس کے کل بلاک آپ ہی اپنی معرفت بنوا دیا کرتے تھے۔ آپ کی بلند خیالی۔ آزاد منشی۔ صاف گوئی بے تکلفی کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ جبتک آپ بھارت متر کے ایڈیٹر رہے کلکتہ کے مارواڑی آپ کی اخلاقی سخت گیریوں سے دبتے رہے حتیٰ کہ خود دیر ویر اسٹر اخبار پر آپ کا اخلاقی رعب غالب

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھا اور وہ بے حد لحاظ کرتے تھے۔ آپ نے کبھی دولت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اور بڑے بڑے تاجداروں کی سخت سے سخت نکتہ چینی میں دریغ نہ کیا۔

ان کی محبت اور بے تکلفی کا یہ حال تھا کہ ۱۹۰۶ء کی کلکتہ کانگریس کے موقعہ پر جب ایڈیٹر زمانہ معہ چند احباب دس بارہ دن آپ کا مہمان رہا۔ لیکن کسی دن کسی کو یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ اپنے گھر میں نہیں بلکہ کسی غیر شخص کا مہمان ہے۔ زمانہ کے لیے آپ نے ملک کے اخبارات پر ایک نادر سلسلۂ مضامین لکھا۔ شیو شمبھو کے نام سے لارڈ کرزن کے نام چند کھلے چھٹے لکھے جنھیں دلاویز ظرافت کے پیرایہ میں آپ نے لارڈ ممدوح کے عہد حکومت کی سختی پر نکتہ چینی کی۔ ان چھٹوں کا ہندوستان بھر میں چرچا ہوا۔ اکثر انگریزوں نے انھیں پڑھوا کر سُنا۔ بعض احباب کی فرمائش سے ان کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر کے انگلستان بھیجا گیا۔ خبر تو یہاں تک معلوم ہوئی تھی کہ خود لارڈ کرزن نے بھی انھیں پڑھوا کر داد سخن دی تھی۔ بہر حال آج بھی یہ چھٹے اپنے طرز خاص کے لحاظ سے آپ ہی اپنے جواب ہیں۔ آپ نے لارڈ کرزن کی تعلیمی پالیسی کے خلاف "گرجن اور سرسوتی" کے عنوان سے ایک پُر مذاق مکالمہ زمانہ ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا۔ یہ مکالمہ اپنے طرز کا ایک انوکھا مضمون ہے۔ گپتا صاحب کو سنجیدہ ظرافت کا خاص ملکہ تھا۔ پرائیویٹ صحبتوں میں مذاق ہی مذاق کے پیرایہ میں وہ اپنی باتیں کہہ جاتے تھے کہ سننے والے دنگ رہ جاتے۔ ان کی حاضر جوابیاں بڑا لطف دیتی تھیں۔ ان کی پُر مذاق گفتگو۔ ان کے ڈھلے ہوئے فقرے' ان کے رکھے ہوئے نام' یاد آتے ہیں تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ کاش آپ کو کچھ دن اور احباب کی خوشی کی خاطر کا موقع ملتا۔ اخبار نویسی کی جو عزت آپ کے نگاہ میں تھی اس کے سامنے دنیا کی بادشاہت ہیچ تھی۔ وطن اور اہل وطن سے آپ کو ایسی محبت تھی کہ اپنے کو ہر خادم ملک کا نیازمند سمجھتے تھے زمانہ کے ساتھ آپ کی عنایات کا کیا بیان کیا جائے۔

دل من داند و من دانم و داند دل من

⁂ ⁂ ⁂

خاتون مضمون نگاروں میں یہاں پر دو مرحومہ بہنوں کے احسانات کا ذکر کرنا ضروری ہے شریمتی ہر دیوی جی۔ بھارت بھگنی لاہور کی ایڈیٹر اور بزرگ قوم لالہ روشن لال صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ہماری درخواست پر ۱۹۱۱ء کے دربار نمبر زمانہ کے لیے ایک خاص مضمون تحریر فرما کر ہم کو شکر گذار بنایا تھا۔ فرقہ نسواں کی اصلاح و بہبود کے لیے آپ کی کوششیں یادگار زمانہ ہیں۔ دوسری بہن شریمتی چاند رانی کو پر لوک سدھارے ہوئے کئی سال ہو گئے لیکن ان کے متعدد و مختلف مضامین جو زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ عرصہ دراز تک ان کے زور قلم اور فکر بلند کی یاد دلاتے رہیں گے۔ چاند رانی صاحبہ ایک لائق ماں کی لائق بیٹی تھیں۔ گھر ہی میں تحصیل علم کیا تھا مگر سادہ و موثر عبارت میں دلی جذبات

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

قلم بند کرنے کا انھیں ملکہ حاصل ہو گیا تھا۔ عنفوان شباب ہی میں اپنی رفیق زندگی سے ان کا ساتھ چھوٹ گیا تھا۔ مگر شہر کے جوگ میں تمام عمر رونے دھونے میں کاٹنے کے بجائے انھوں نے ملک کی علمی خدمت کا تہیہ کر لیا تھا۔ افسوس زندگی نے وفا نہ کی ورنہ ان کی ذات گرامی پر ہمارے صوبہ کو بہت کچھ فخر حاصل ہوتا۔

سچ ہے "خدا کا نام رہنا ہے ہمیشہ کچھ نہیں رہنا"۔ ہمارے یہ ہمدرد و معاونین جن کی ہم رہ رہ کر یاد کر رہے ہیں، ہماری امداد و اعانت کے لیے اس عالم علم و عمل میں موجود نہیں ہیں لیکن ہم کو یقین ہے کہ ان کا روحانی فیض اس وقت بھی ہمارے شامل حال ہے۔ ان کی ہمدردی، ان کی دستگیری بیکار نہیں گئی۔ ان کے کارنامے ہمیشہ یادگار زمانہ رہیں گے اور جب تک ادب اردو کا نام و نشان باقی ہے ان کے اعلیٰ خیالات اور پاکیزہ جذبات جو زمانہ کی گذشتہ جلدوں میں محفوظ ہیں۔ عزیزان وطن کے دل و دماغ کو مسرور و منور کرتے رہیں گے، اور شائقین ادب ان کے کارناموں کو فخر اور مسرت سے یاد کریں گے۔ ان کی مثالیں شمع ہدایت کا کام دیں گی۔ ان کے نقش قلم رہنمائی کا فرض ادا کریں گے۔ اور ان کی محنت و محبت کی یادگاریں آیندہ نسلوں کو بھی ملک کی ادبی خدمت پر مائل کرتی رہیں گی۔ اس وقت بھی شکر کا مقام ہے کہ خادمان ادب کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ جن مقاصد کو مد نظر رکھ کر زمانہ جاری ہوا تھا ان کی تکمیل و توسیع کا کام اس وقت ملک میں ایک بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے ملک کی ادبی خدمت میں کئی معزز معاصرین بھی ہمارے ساتھ سرگرم کوشش ہیں۔ ملک کے منتخب و چیدہ اہل قلم اسی جوش و خلوص کے ساتھ جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس وقت بھی اس خدمت میں ہمارے شریک کار ہیں۔ اس وقت بھی ملک کے اہل کمال ہم کو زیر بار احسان کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں کہ ہم ان کی مسلسل و پیہم عنایات کا شکریہ ادا کر سکیں۔ کوئی بضاعت نہیں کہ ہم ان کی عرق ریزیوں کا کوئی صلہ پیش کر سکیں، ہاں، ہماری گردن ان کے بار احسان سے جھکی ہوئی ہے۔ ہمارا دل ان کی شکر گذاری سے لبریز ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اور ہمارے ناظرین ان احسانات سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری محسنوں کو نہ کسی داد کی خواہش ہے اور نہ کسی صلہ کی پروا، کیونکہ وہ کسی اور خیال سے نہیں بلکہ ایک مقدس فرض سمجھ کر ملک کی ادبی خدمت کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم بھی اسی دعا پر ختم کلام کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ہمارے ہمدردوں کی عمر میں برکت دے، ان کے حوصلے بلند رہیں، ارادے کامیاب اور ارمان پورے ہوں۔ برادران وطن اپنے ملکی ادب کی قدر کریں۔ کارکنان زمانہ کا خلوص باقی اور جوش قائم رہے۔ مزید خدمت کی توفیق ہو اور اس کے لیے ان کا حوصلہ بڑھتا رہے۔ زمانہ آیندہ اس وقت سے بھی زیادہ ملک کی علمی و عملی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حضرت جوش ملیح آبادی

نقش و نگار و "شعلہ شبنم"

زمانہ ستمبر ۱۹۳۷ء

نقش و نگار و شعلہ و شبنم" کے نام سے حال ہی میں اردو کے شاعر اعظم حضرت جوش ملیح آبادی کے دو دلفریب مجموعے کلام جامعہ ملیہ دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوئے ہیں۔ جن میں موصوف کی متعدد دلکش نظمیں اور دلآویز غزلیں کتابی صورت میں نہایت پسندیدہ طریقے پر جمع کر دی گئی ہیں۔ اور اس نامور شاعر کا ایک پر لطف پنسل اسکیچ بھی ہدیہ ناظرین کیا گیا ہے۔

حضرت جوش ملیح آبادی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے ہیں ان کے آباؤ اجداد کو دربار اودھ میں ایک امتیازی شان حاصل تھی۔ ان کے والد۔ دادا اور پردادا بھی شاعر تھے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جوش نے شاعری کی فضا میں آنکھ کھولی۔ اور شاعری ہی کے گود میں پرورش پائی۔ شاید اسی کی برکت ہے کہ وہ نو برس کی عمر میں شعر کہنے لگے۔ شروع میں تین چار سال تک انھوں نے حضرت عزیز لکھنوی مرحوم سے مشورہ سخن لیا۔ اس کے بعد کسی استاد کی امداد کے بغیر مشق سخن کرنے لگے اب ایک عرصہ سے خود انکا شمار اساتذہ میں ہے۔ بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ موجودہ عہد میں اردو کے شاعر اعظم کہلانے کے مستحق ہیں۔

حضرت جوش نے اردو فارسی کی تعلیم گھر ہی پر پرانے طریقے سے حاصل کی تھی انگریزی کے لیے البتہ انھوں نے اسکول و کالج کی خاک چھانی لیکن ان کی لاابالی طبیعت نے اس کو تکمیل تک نہ پہونچنے دیا کئی سال ہوئے "روح ادب" کے نام سے ان کی ابتدائی شاعری کا ایک دلچسپ مجموعہ شایع ہوا تھا جس کی اکثر نظمیں کہنہ مشقی کی شان رکھتی تھیں۔ تاہم وہ ان کی تقلیدی شاعری تھی جس پر لکھنویت کا اثر غالب تھا۔ مگر اس وقت بھی ان کا کلام نفس مضمون کی لطافت اور جدت، تخیل کے اعتبار سے قابل تحسین تھا۔ ان کے خیالات و جذبات میں صداقت معنوی کا رنگ موجود تھا۔ اور تغزل میں وہ غالب کے مقلد معلوم ہوتے تھے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تصوف کی جھلک بھی موجود تھی اور جا بجا ٹیگور کے طرز سخنوری کی تقلید بھی نمایاں تھی۔

حسن اتفاق سے ۱۹۲۴ء میں جوش صاحب کو حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں ملازمت کا موقعہ مل گیا۔ اور وہ اس محکمہ کے ادبی تصانیف کے نگراں کار بنا دیے گئے۔ اس طرح کئی سال تک وہ "ناظر ادب" کی اہم خدمت انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی شعر و سخن کا چرچا بھی گرم رہا اور انھیں اپنی قابلیت بڑھانے اور اس میں مزید ترقی کرنے کا موقع ملا جس سے انکا جوہر قابل چمک اٹھا اور وہ تقلیدی شاعری کے قید و بند کو توڑ طبعی شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس طرح جوش اقلیم سخن کی مقررہ ترکیبوں اور اردو شاعری کی روایتی باتوں سے کنارہ کش ہو کر اصلی شاعری کا حق ادا کرنے لگے اور اپنی نازک تخیل و طرز ادا دونوں کے بدولت وہ اردو کی بزم سخن میں مسند نشینی کے حقدار ہو گئے ہیں۔

غرض شاعرانہ تخیل و طرز ادا دونوں لحاظ سے جوش زمانہ حال کے اردو شعرا میں اپنا جواب نہیں رکھتے وہ فطرتاً رند مشرب، آزاد منش، حق پرست اور بیباک واقع ہوئے ہیں۔ ان کا دل آئینہ کی طرح صاف ہے۔ طبیعت کو تملق و تصنع سے نفرت ہے۔ تخیل بلند نگاہ وسیع اور دماغ نکتہ رس ہے۔ وہ فرقہ دارانہ ہمدردی کے لیے پیدا نہیں ہوئے ہیں اور نہ دماغی حیثیت سے وہ کسی تنگ خیال جماعت کے ہمنوا ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بنی نوع انسان کے مخلص دوست اور زمانہ بھر کی جمہوری تحریکوں کے سچے ہمدرد اور پست و پامال طبقوں کے زبردست حامی ہیں۔ ان کا خاندان زمینداری پیشہ ہے۔ اور خود ان کی زندگی عیش و عشرت کی سوسائٹی میں بسر ہوئی تاہم دماغی حیثیت سے وہ جمہوریت کے دلدادہ اور غریب ہم وطنوں اور افلاس زدہ لوگوں کے خیر خواہ ہیں۔ تنگدست و مظلوم لوگوں کے درد دکھ کا ان کے دل میں سچا قلق ہے۔ جس کا اثر قریب قریب ان کی ہر نظم میں نمایاں ہے۔ چنانچہ ایک عرصہ سے قومی حمیت اور ملکی غیرت کا اعلیٰ ترین معیار زندگی ان کے شاعرانہ تخیل کا مرکز بن گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مادی حیثیت سے ملک کے اعلیٰ و عام طبقے کی معاشرت میں جو افسوسناک فرق نمایاں ہے۔ اس کا ان کی شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ گو وہ اب بھی کچھ عادتاً اور کچھ ضرورت سے مجبور ہو کر اہل دولت اور ذی اثر طبقے سے بے نیاز نہیں ہیں لیکن دماغی حیثیت سے انھیں ملک کے اہل ثروت و اہل جاہ کی زبردستیوں سے قلبی نفرت ہے۔ جس کا ثبوت ان دونوں مجموعوں کے اکثر نظموں میں قدم قدم پر ملتا ہے۔

جوش صاحب کی نظم و نثر دونوں میں انقلاب کا اکثر ذکر ہوتا ہے۔ ان کے اکثر قدردان بھی انھیں "شاعر انقلاب" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن ہم انھیں "اردو کا شاعر اعظم" سمجھتے ہیں۔ اور اسی خطاب سے انہیں یاد کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ کے اردو شاعروں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں ملک کے سیاسی ماتحتی کا سب سے زیادہ قلق جوش ہی کو ہے۔ ہندو مسلمانوں کے نفاق کا بھی سب سے زیادہ رنج انھیں کو ہے۔ اس عہد میں دیسی علم و فن کے بے قدری کے لیے سب سے زیادہ آنسو بھی وہی بہاتے ہیں۔ نااہل امرا کے بھی وہ سخت مخالف ہیں اور ان کے کلام میں اکثر سوشلزم بلکہ کمونزم کی جھلک بھی نمایاں رہتی ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو وہ "انقلاب" "انقلاب" پکارتے ہوئے بھی صرف موجودہ صورت حال کی خاطر خواہ اصلاح ہی چاہتے ہیں۔ اور ہر محب وطن کی طرح ملک کے غریب طبقے کو فارغ البال اور ہندوستانیوں کو اپنے گھر میں پولٹیکل حیثیت سے آزاد دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ انقلاب کے متعلق ان کا تخیل یہی ہے کہ ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہو، پولٹیکل غلامی باقی نہ رہے۔ اور اہل کمال کی قدر عام ہو، لیکن ملکی معاشرت کا خاکہ قدیم مشرقی تہذیب ہی کے سانچے میں ڈھلا ہوا رہے۔ اس میں وہ سر مو کوئی تبدیلی دیکھنا پسند نہیں کرتے ہیں اور اگر مطلق العنان شخصی سلطنت کے ذریعہ ان کا مدعا حاصل ہو سکے تو انھیں اس میں ذرا بھی عذر نہ ہوگا۔ وہ دراصل مغربی تہذیب کو صرف ناپسند ہی نہیں کرتے ہیں بلکہ اصولی حیثیت سے بھی اس کے تخیل مساوات کے خلاف ہیں۔ مثلاً عورت کو وہ محض خانگی زندگی کا امین سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی جوانوں کی دل بستگی بچوں کی پرورش اور بوڑھوں کی نگہداشت کے لیے وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اسے مرد کا محبوب ہی نہیں بلکہ معبود کا درجہ تک دے سکتے ہیں۔ لیکن میدان عمل میں عورت کو مساوی حیثیت سے مرد کے دوش بدوش مصروف کار دیکھنے یا جدوجہد حیات میں برابر کا شریک بنانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں اور ان کا بس چلے تو وہ اس بارے میں ہٹلر و مسولینی سے بھی زیادہ سختی روا رکھیں وہ عورتوں کے اعلیٰ تعلیم کے بھی حامی نہیں ہیں۔ اور انھیں اس خیال ہی سے تکلیف ہونے لگتی ہے کہ

حسن کا آغوش رنگیں و لفریب و دل ربا ‏ ‏ ‏ ‏ علم سے بن جائے اقلیدس کا صرف اک دائرہ

مصحف روئے کتابی۔ رو کشِ نازِ گلاب ‏ ‏ ‏ ‏ اور بن جائے لغت یا دفتر علم حساب

آزادی نسواں کی تحریک سے بھی وہ بہت مشتبہ ہیں اور جب کبھی موقعہ ملتا ہے وہ "مغرب زدہ" ہندوستانی لیڈیوں کے مضحکہ اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ اسی طرح یورپین معاشرت کے اکثر خصوصیات کے بابت انھیں غلط فہمی ہے۔ ان کے دل میں عورت کی انتہائی قدر و منزلت ہے۔ کیونکہ ان کی رائے میں اس کی ذات بزم عالم کے تزئین۔ اور خلق اللہ کی تفریح طبع کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کی حسن و عشق کی دنیا ہی ویران ہو جائے گی۔ اس لیے جذبات کے ماتحت وہ عورت کو اپنے دل کا مالک بنا دیں گے۔ لیکن ٹھنڈے دل سے کبھی برابر کا شریک اور مشیر نہ سمجھیں گے۔ اور خلوت یا گھر کی چہار دیواری کے باہر بیرونی دنیا کی جدوجہد میں اسے کوئی درجہ نہ دیں گے۔

ہمارا خیال ہے کہ جوش جس دور زریں کا راگ گایا کرتے ہیں اس کے لیے قدر شناس اہل

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ثروت کی موجودگی ضروری ہے۔ البتہ ناشناس اہل دولت کے وہ جانی دشمن ہیں اور اس طبقے کو جس صورت سے بھی ممکن ہو تو فوراً معدوم کرنے کے لیے کم سے کم ذہنی طور پر تیار ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس پوزیشن اور سرمایہ داری کی اصولی مخالفت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

جوش کے کلام میں سپاہیانہ رنگ بھی غالب ہے" ان کے نعرۂ مردانہ" کے چند شعر ملاحظہ ہوں

ہمنشیں مجھ کو لرزتے ہوئے آگاہ نہ کر — کہ بلاخیز حوادث کی نظر ہے مجھ پر
جانتا ہی نہیں درماندہ و حیراں ہونا — کھیل ہے غم سے مجھے دست و گریباں ہونا
روح ہو مجھ میں مصیبت کے پرستاروں کی — شب ہوتا ہے مجھے چھاؤں میں تلواروں کی
وجد کرتا ہوں میں چلتی ہوئی تلواروں پر — نیند آتی ہے، دہکتے ہوئے انگاروں پر

نازک اندامان کالج والی نظم میں بھی انھوں نے عیش پرست، آرام طلب نوجوانوں کو بہت سخت سست کہا ہے۔ یہ انداز بیان ناصحانہ نظموں میں خاص طور پر نمایاں ہے یوں بھی ان کے الفاظ بہت جاندار ہوتے ہیں جس سے ان کا ہر شعر حیات و حرکت سے معمور رہتا ہے۔ زبان پر انھیں ایسی قدرت حاصل ہو گئی ہے کہ ہر وقت ان کی زور طبع کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ اور جس طرح وہ چاہتے ہیں اپنی شاعری کے سانچے میں اسے ڈھال لیتے ہیں۔ ان کی ترکیبیں نئی اور تشبیہیں بالکل نرالی ہوتی ہیں۔ ان کا تخیل اچھوتا۔ ان کا طرز بیان انوکھا اور ان کے استعارے اور تخیل ہوتے ہیں۔ اور محاوروں کو تو وہ اپنی ضرورت کے موافق، اس طرح توڑ موڑ کر کے رکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ان کے پر کیف کلام کے لطف اندوزی میں اس کے احساس کی فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔

غرض جوش لفظ کے صحیح معنوں میں زمانہ حال کے بہترین اردو شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو چار چاند لگائے ہیں، اور بقول جناب کیفی "ان کی شاعری نے ہم کو اس قابل بنا دیا کہ ہم آنکھیں نیچی کئے بغیر اردو شاعری کو دنیا کے ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں"

موجودہ شعرا میں جوش نظم کے بادشاہ ہیں ان کی غزلیں ان کی نظموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں گو وہ جو کچھ کہتے ہیں پر لطف، پر کیف ہوتا ہے اور غزلوں میں بھی اکثر بلا ارادہ مسلسل نظم کا رنگ غالب ہو جاتا ہے۔

ایک سچے شاعر کی حیثیت سے جوش بھی ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز رہتے ہیں۔ ان کی شاعری کو حیدرآباد ہی میں تکمیل کا درجہ نصیب ہوا۔ لیکن وہاں بوجوہ ان کے شاعرانہ کمال کی واجبی قدردانی نہیں ہوئی۔ اس لیے نسبتاً فارغ البالی میسر ہونے پر بھی وہاں کی آب و ہوا ان کے موافق نہ ہوئی اور باوجود اس کے کہ وہ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے اور نظم لکھنے کا شغل

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی جاری رہا۔ بیرونی دنیا کو ان کے شاعرانہ کمال سے زیادہ واقفیت نہ ہونے پائی۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں جب راقم الحروف کو ستعلیق کانفرنس کے سلسلہ میں حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا تو اسے کلام جوش کے مختلف قلمی مجموعے دیکھ کر بڑا تعجب اور افسوس ہوا۔ "تعجب حضرت جوش کے کمال فن کی ترقی پر افسوس اس بات پر کہ حیدرآباد جیسے سرپرست اردو ریاست میں ایسا زبردست شاعر اس کس مپرسی میں پڑا رہے۔ مگر ہر کمال کے لیے ایک میدان ہوتا ہے اور ہر شخص کو وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ زمانہ کو دو ڈھائی سال تک کلام جوش کے مسلسل اشاعت کا فخر نصیب ہوا۔ اور ہندوستان کے قدر شناسان فن اس تاجدار اقلیم سخن کے کمال شاعری سے بخوبی واقف ہو گئے۔ تاہم دو تین سال تک اشاعت کلام کا بندوبست نہ ہو سکا۔ مگر اب جامعہ ملیہ دہلی کے توجہ اور اولعزمی سے دلکش نظمیں، خوبصورت کتابی صورت میں قلم بند ہو گئی ہیں۔

نقش و نگار اور شعلہ و شبنم دونوں میں بہت سی نظمیں وہی ہیں جو ناظرین زمانہ پہلے پڑھ چکے ہیں مگر بہت سی نئی نظمیں بھی ہیں جن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ناظرین زمانہ و دیگر قدردان سخن کو ان مجموعوں کے جلد سے جلد خرید نا چاہیے۔

ابھی جوش کی شاعری کے شباب کا زمانہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے نظموں کا انبار لگا دیا ہے اور ابھی ایسے کئی مجموعے شائع ہونے کو باقی ہیں۔ در اصل ان کی ذات سے اردو شاعری کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ ہیں لیکن ان کی کمال جوہر سخنوری کی مزید ترقی کے لیے ایڈیٹری کے خشک فرائض سے سبکدوشی ضروری ہے۔

جوش مجسم شعر ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی بھی شاعری کے لیے وقف رہنا چاہیے۔ حسن و عشق کے معرکے ہی اُن کے لیے کیا کم جان لیوا ہیں جو کسی مستقل ادبی خدمت کا بار بھی ان کے سر ڈالا جائے ہمارے ملک کی بدقسمتی ہے کہ ابھی تک نہ خواص میں فن کی قدردانی کا جذبہ پیدا ہوا ہے اور نہ عوام ہی کو اس کا خیال اور اس کی مقدرت ہے کہ وہ ملک کے اہل کمال کو ضروریات زندگی سے بے نیاز کر دیں۔ دوسرے ملکوں میں جوش جیسے شاعر کی نظموں کی آمدنی ان کی ضروریات کے لیے کافی سے زیادہ ہوتی۔ مگر ہمارے ملک میں احباب کی قدردانی زبانی تعریف تک محدود رہتی ہے۔

خیر کچھ ہو۔ جوش حسن و عشق کے بندے اور شعر و سخن کے پتلے ہونے کے بدولت۔ غمِ فردا سے آزاد ہیں۔ سچے حسن پرست کی حیثیت سے انھیں ہر جگہ حسن ہی حسن دکھائی دیتا ہے۔ انسانی حسن کے متعلق ان کا تخیل نہ رسمی تکلفات کا پابند ہے اور نہ کسی روایتی خصوصیات کا قائل، اُن کی طبیعت میں مرد

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

و محبت۔ شرافت و سیرچشمی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے

غیرت مندی کا یہ حال ہے کہ ایک نظم میں لکھتے ہیں ؎

میرے آبا کی لگاتار نوازش کے طفیل — زنگ رلیوں ہی میں کٹتا تھا زمانہ جن کا
ان کے بعد اب ہیں کچھ اس طرح ملول و غمگین — کہ انھیں دیکھ کے پھٹتا ہے کلیجہ میرا
دست خالی کی طرف دیکھ کے رہ جاتا ہوں — انکا چہرہ نظر آتا ہے جب اترا اترا

ساغر و بادہ کے وہ علانیہ قدر داں ہیں۔ مگر ان کی مینخواری درویشانہ ہے اور ریاکاری سے انھیں انتہائی نفرت ہے۔ رسمی مذہب کی ظاہر پرستیوں کے وہ بڑے دشمن ہیں۔ چنانچہ زندہ ریاکاری" کے عنوان سے انھوں نے ظاہر پرست ملانوں کی جو پرلطف تصویر کھینچی ہے۔ اس میں ان کا پورا حلیہ آگیا ہے اور ان "شبیہ قبہ و تصویر منبر" حضرات کو "حوروں کا شوہر" کہا گیا ہے۔ "فریب خانقاہ" اور "ذاکر سے خطاب" نامی نظموں میں بھی ریاکاری و مذہبی نمائش سے دلی نفرت کا خوب دل کھول کر اظہار کیا گیا ہے۔

جوش کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ مہر و وفا ان کی فطرت ثانی ہے۔ خلوص اور حق پرستی ان کا شعار ہے۔ یہی باتیں ان کی شاعری میں ہر جگہ درخشاں ہیں۔ ان کے کلام کی تاثیر کا اصلی راز ان کے خلوص باطن میں پوشیدہ ہے چنانچہ اشعار ذیل میں انھوں نے حیدرآباد میں اپنی نجی زندگی کو کس پرلطف انداز سے بے نقاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے شخص! اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور صبح کو وہ ناظر نظارۂ قدرت — طرف چمن و صحن بیاباں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی — شہر ہنر و کوئے ادیباں میں ملے گا
اور شام کو وہ مرد خدا، رند خوش اوقات — رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملے گا
اور رات کو وہ خلوتیٔ کاکل و رخسار — بزم طرب و کوچۂ خوباں میں ملے گا

اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملے گا

رند خوش اوقات اور عاشق شاد کام ہیں۔ مگر ان کے کلام میں تصوف، فلسفہ، نفسیات سبھی کچھ ہے۔ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ شیرازی کی روح کھینچ کر سمو دی گئی ہے۔ البتہ وہ روحانیت نہیں جو حافظ کے ہر شعر میں موجود پائی جاتی ہے۔ تاہم جوش کے کلام میں بلا کا زور ہے روانی اور گھلاوٹ کی کہیں کمی نہیں۔ ان کی بندشیں ایسی چست اور تشبیہیں ایسی درست ہوتی ہیں کہ پڑھنے والا حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کہیں ثقیل و نامانوس الفاظ آجاتے ہیں تو اس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

استادانہ ترکیب ہے کہ طبع نازک پر گراں نہیں گزرتے۔

"نقش ونگار" اور "شعلہ و شبنم" دونوں متعدد ابواب میں منقسم ہیں۔ ہر باب کا نام علیحدہ رکھا گیا ہے مثلاً نقش ونگار کی پانچ ابواب میں ایک کا نام "نگار خانہ" ہے دوسرے ابواب میں کسی کو "خمریات" کسی کو "مطالعہ نظر" قرار دیا گیا ہے "نقش ونگار" میں چھوٹی بڑی کل بانوے نظمیں و قطعات ہیں۔ شروع میں لطیف الدین صاحب اکبر آبادی نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں مصنف کے ذاتی و خاندانی حالات کے علاوہ ان کی شاعری پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور شعر و شاعری پر ایک فلسفیانہ بحث کی گئی ہے۔

"شعلہ و شبنم" کی انجمن گل ہیں" بقول مصنف "شعلے بھی ہیں شبنم بھی"۔ اس مجموعہ کے بھی چار حصے ہیں۔ "آتشکدہ" جس میں سیاسی رنگ کی نظمیں ہیں۔ "رنگ و بو" میں خالص شاعرانہ نظمیں ہیں۔ "اسلامیات" میں خدا، پیغمبر اسلام، علی وغیرہ پر نظمیں ہیں" بادہ سرجوش" میں مسلسل و غیر مسلسل غزلیں ہیں۔ جن میں جدید و قدیم رنگ تغزل دونوں کے دلکش نمونے موجود ہیں قدیم رنگ کے کلام میں بھی جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ جوش کی شاعری فرسودہ و پامال رسمی شاعری نہیں ہے۔ ان کا تخیل بہت کچھ اور تخیل (ORIGINAL) ہوتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کے حسن و قبح کو اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے واضح کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ اس میں تقلید کا شائبہ نہیں ہے۔ چنانچہ حسن و عشق ہو یا حکمت و فلسفہ۔ مناظر قدرت ہوں یا فتوحات انسانی ان کی ہمہ گیر طبیعت اور دوررس نظر سب کو اپنا بنا لیتی ہے۔ اور ہر چیز کو ایک ایسے نئے اور اچھوتے پیرائے میں پیش کرتی ہے کہ ناظرین محو حیرت ہو جاتے ہیں۔

یہاں پر کوہستان کی عورت کے عنوان سے ان کی نظم کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔ اس کی انوکھی ترکیبیں اور پُر معنی تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔

یہ الہتی عورتیں، اس چلچلاتی دھوپ میں … رنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں

واہ کیا کہنا ترا اے حسن ارض آفتاب … یہ برشتہ رنگ، یہ تپتے ہوئے سنگین شباب

ہر سراپا بت، تراشوں کی عرق ریزی کا پھل … اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

چال جیسے تند چشمے تیوریاں جیسے غزال … عارضوں میں جامنوں کا رنگ آنکھیں پتیال

غور تیں ہیں یا کہیں برسات کی راتوں کے خواب … پھٹ پڑا ہے جن پہ طوفان خیز تخمیر بلا شباب

پر جوال چہرے ہیں چہروں میں برنائی کا جوش … تو کہے آہن میں ٹھونسے ہیں کسی نے چشم و گوش

جسم میں کچھ اس قدر ٹھونس الحفیظ والاماں … لیجے چٹکی تو چھل جائیں خود اپنی انگلیاں

مچھلیاں شانوں کی ابھری سی بٹی سی کلائیں … آہن و فولاد کے بیٹھے اسلاخوں کی رگیں

دید کے قابل ہیں ان کا ذہنوں کا رباب درخت … کھب گئی ہے جیسے بارش ٹپکی ہے جن کو دھوپ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ان بناتِ کوہ کی کڑیل جوانی ، الاماں | پتھروں کا دودھ پی پی کر ہوئی ہیں جو جواں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنھیں | آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنھیں
کیا خبر کتنے دلوں کی جوش پامالی ہوئی | ان اداؤں سے کہ طوفانوں کی ہیں پالی ہوئی

شاعری مصوری کا اس سے بہتر نمونہ اور کونسا پیش کیا جا سکتا ہے! البتی عورتیں" سنگ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں" تپتے ہوئے سنگیں شباب" برسات کی راتوں کے خواب" بپھر لیا شباب" یہ عجیب و غریب ترکیبیں جوش کے سوا اور کہاں دیکھنے میں آ سکتی ہیں۔

ہر سراپا ئت تراشوں کی عرق ریزی کا پھل | اتنی بے پایاں صلابت پر بھی ہر نقشہ سجل

"صلابت" کا لفظ کسی قدر ثقیل بلکہ مہیب ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہندی کا پیارا لفظ "سجل" کس خوبی کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ جس سے دونوں لفظ برمحل معلوم ہو رہے ہیں شاید اسی وجہ سے شعر کے حسن میں کوئی فرق آنے نہیں پایا یہ قادر الکلامی کا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔

اسی طرح جامن والیوں پر جو نظم لکھی گئی ہے۔ اس میں جوش نے شمال ہند کے غریب دیہاتی عورتوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھدی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مست بھونرا گونجتا پھرتا ہے کوہ و دشت میں | روح پھرتی ہے کسی وحشی کی گھبرائی ہوئی

کوئی جواب ہی نہیں ہو سکتا ہے۔

اس مضمون میں ہم نے مفصل انتخاب کلام سے قصداً گریز کیا ہے۔ کیونکہ جوش کی ہر نظم شروع سے آخر تک بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ شائقین کو ان سے بحیثیت مجموعی لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ واقعی جوش جو کچھ لکھتے ہیں بے مثل لکھتے ہیں۔ ان کی شاعری ہمارے لیے باعثِ فخر ہے۔ اور ہر سخن فہم اور ہر اہلِ دل کو اس کی قدر کرنا چاہیئے۔ دونوں کتابوں کی لکھائی چھپائی کاغذ و جلد وغیرہ بھی قابل تعریف ہے۔

* * *

اصلاح تمدن (سوشل ریفارم) کے میدان میں تو فرقہ وارانہ جدوجہد کے بغیر آپ مروجہ برائیوں کو دور ہی نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہر فرقے میں چند خاص نقائص داخل ہو گئے ہیں جن کی قرار واقعی اصلاح کسی عام تحریک کے ذریعہ آسان نہیں ہے' اس کے لیے آپ کو مجبوراً فرقہ وارانہ تحریکوں کا سہارا لینا ہوگا، جس طرح آپ کو خاص خاص بیماریوں کے لیے علیحدہ علیحدہ اسپتال قائم کرنا پڑتے ہیں اسی طرح مختلف فرقوں کے خاص خاص عیوب دفع کرنے کے لیے آپ کو علیحدہ علیحدہ کوششیں کرنا پڑیں گی۔

دیا نرائن نگم

زمانہ، دسمبر ۱۹۳۲ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھانیسر کی لڑائی اور اس کے اثرات

زمانہ، اگست ۱۹۳۰ء

دنیا میں ہمیشہ سے لڑائیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن بعض ایسی اہم اور زبردست لڑائیاں ہوئی ہیں جن کی بدولت ملکوں اور قوموں کی قسمت ہی پلٹ گئی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں اسی قسم کی لڑائی بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں تھانیسر میں ہوئی تھی۔ جس نے اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت کا چراغ سدا کے لیے گل کر دیا۔ اور مسلمانوں کے قدم صدیوں کے لیے یہاں مضبوطی سے جما دیئے۔ یوں تو ہندوستان کی دولت اور جہاد کے شوق نے ساتویں صدی سے بسط ہی سے مسلمانوں کو ہندوستان میں دعوتِ عمل دے رکھی تھی۔ اور ایران کی فتح نے اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے لیے راستہ بھی کھول دیا تھا۔ لیکن تھانیسر کی لڑائی کے پہلے صرف دو ہی واقعات ایسے قابل ذکر ہوئے جن کا اثر اس ملک کے تاریخ پر پڑا۔ ان میں پہلا محمد بن قاسم کا حملہ ہے جس نے ۷۱۲ء میں سندھ پر قبضہ کر کے ہندوستان میں پہلی مسلمان حکومت قائم کی۔ لیکن اس حملہ کا اثر فقط سندھ تک محدود رہا اور ہندوستان خاص پر کچھ اثر محسوس نہ ہوا۔

دوسرا واقعہ محمود غزنوی کے پے درپے حملوں کا ہے مگر یہ بھی بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں کی طرح آئے اور نکل گئے، اور ان کا اثر صرف پنجاب تک محدود رہا۔ محمود کی وفات کے بعد چند ہی سال بعد ہندوؤں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور دلی میں ایک طاقتور سلطنت قائم کر لی۔ مگر محمود غزنوی نے درۂ خیبر کا راستہ از سرِ نو کھول کر آئندہ مسلمان حملہ آوروں کے لیے اس ملک میں داخل ہونے کی یقینی راہ دکھائی دراصل یہی ہندوستان کا پہلا پھاٹک ہے۔

محمد بن قاسم غلط راستے سے ہندوستان آیا اور سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستانوں نے اسے ہندوستان خاص تک پہنچنے نہ دیا۔ محمود غزنوی درۂ خیبر سے آیا جس کی بدولت آسانی سے پنجاب میں داخل ہو کر سرہند تک پہنچ گیا۔ جو ہندوستان کے اندرونی قلعہ کا اصلی پھاٹک ہے۔ ہندوستان کی تمام فیصلہ کن اور تاریخی لڑائیاں اسی سرزمین میں ہوئی ہیں۔ دہلی کی تاریخی اہمیت کی بھی یہی وجہ ہے۔ جس کی بدولت اکثر سلطنتوں نے اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھانیسر اسی علاقہ کا ایک تاریخی مقام ہے جو راجہ ہرش کے باپ راجہ پربھاکر وردھن کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ ہرش کے لاولد، جوانمرگ بہنوئی کے بعد جب اس کی بہن شوہر کے غم میں اپنا راج پاٹ چھوڑ کر بودھ مت کی بھکشنی ہو گئی، اور قنوج کی رعایا نے ہرش کو اپنا راجہ انتخاب کیا تو اس نے بھی تھانیسر چھوڑ کر قنوج کو اپنا دارالسلطنت بنا لیا۔ مگر تھانیسر کی جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ پر قائم رہی اور آگے چل کر اس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ ہمیشہ کے لیے پلٹ دیا۔

تھانیسر کی لڑائی ۱۱۹۱ء میں محمد غوری اور پرتھی راج کے درمیان ہوئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بعد ملک میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم ہو گئی اور وہ مستقل طور پر ہندوستان میں آباد ہو گئے۔ اس لڑائی کے بعد پھر ہندوؤں کو ہندوستان میں حکومت کرنا نصیب ہوا۔

دکن میں وجے نگر کی سلطنت ایک بجھنے والے شعلہ کی آخری بھڑک تھی اور اٹھارھویں صدی میں مرہٹوں کا عروج بھی محض چند روزہ تھا۔ جسے ایک طرف احمد شاہ ابدالی نے اور دوسری طرف انگریزوں نے کچل دیا۔ سیاسی حیثیت سے قطع نظر تھانیسر کی لڑائی کا ملک کے مذہب، معاشرت اور کلچر پر دائمی اثر پڑا۔ اور اس کا پولیٹیکل اثر لگ بھگ سات صدی تک باقی رہا۔

اس وقت ہندوستان میں کئی طاقتور راجپوت خاندانوں کی حکومت قائم تھی۔ جن میں قنوج کے راٹھور اور دہلی کے چوہان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چوہان، دہلی اور اجمیر کے حکمران تھے۔ راٹھوروں کی حکومت قنوج کے گرد و نواح میں تھی۔ مگر چوہانوں کا عروج سب سے بڑھا ہوا تھا اور پرتھی راج کی بہادری کا سکہ ہندوستان بھر میں بیٹھا ہوا تھا۔ تھانیسر کے متصل ہی ترائن کی پہلی لڑائی میں پرتھی راج محمد غوری کو شکست فاش دے چکا تھا جس سے اس کا رتبہ تمام ہندو راجوں میں اونچا ہو گیا تھا۔ لیکن غوری کے دل میں یہ شکست کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ اور ۱۱۹۲ء میں وہ اسی میدان میں ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ جس میں ترک افغان اور دیگر دلاور جنگجو شامل تھے اپنی شکست کا بدلہ لینے آیا۔ اس وقت پنجاب میں ترکوں کی حکومت قائم تھی اور لاہور مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اس لیے عرب راجپوتوں پر تھانیسر ہی کے میدان میں حملہ کر سکتے تھے۔ پرتھی راج متعدد راجاؤں اور بیشمار بہادروں کے ہمراہ تین لاکھ سوار اور تین ہزار ہاتھی لے کر ترائن کے میدان میں، تھانیسر سے چودہ میل کے فاصلہ پر مقابلہ کے لیے آ ڈٹا۔ مگر اس بار راجپوتوں کی بہادری کام نہ آئی اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ رہی۔ راجپوت بہادری اور جاں بازی میں کسی سے کم نہ تھے، مگر انھوں نے پچھلے تجربے سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا، اور وہ تمام غلطیاں دہرائیں جن کی وجہ سے وہ پہلے بھی مسلمان حملہ آوروں کے مقابلے میں ہار چکے تھے۔ ان دونوں فریقین کا دارومدار سواروں پر تھا، لیکن ہندو سردار اول تو یہ گُر معلوم نہ تھا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کہ تیزی سے نقل و حرکت کرنے والے سواروں کے پے در پے حملے ایک جگہ پر کھڑی ہوئی کثیر فوج کو آسانی سے پراگندہ کر سکتے ہیں۔ لڑائی شروع ہوتے ہی جب ہندو سواروں نے مسلمان سواروں کے پہلے حملے کو کامیابی سے روک لیا تو محمد غوری یہ ترکیب چلا کہ اس نے اپنی فوج کے درمیانی حصے کو چھوڑ کر بقیہ فوج کے چار حصے کر کے چاروں طرف سے راجپوتوں پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سوار راجپوتوں پر حملہ کر کے فوراً پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اس طرح تمام دن میدان کارزار گرم رہا۔ آخر کار جب راجپوت لڑتے لڑتے تھک گئے تو خود محمد غوری بارہ ہزار چیدہ اور تازہ دم سواروں و تیر اندازوں کو ساتھ لے کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ راجپوت دل کھول کر لڑے مگر وہ تھکے ہوئے تھے آخر ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ پرتھی راج میدان سے بھاگ نکلا لیکن قلعہ سرستی کے قریب گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔

یہ خیال صحیح ہے کہ اگر جے چند والیِ قنوج اس لڑائی میں پرتھی راج کا ساتھ دیتا جو اس وقت صرف اپنی ہی نہیں بلکہ تمام راجپوتوں کی طرف سے لڑ رہا تھا تو راجپوتوں کو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ یہ بات جے چند کے ماتھے پر ہمیشہ کے لیے کلنک کا ٹیکہ بنی رہے گی کہ اس نے ذاتی عداوت یا پولیٹیکل رقابت سے متاثر ہو کر اس کڑی مصیبت کے وقت اپنے ملکی یا قومی آن کا کوئی خیال نہ کیا اور گو اس کی سلطنت پرتھی راج کی حکومت سے کہیں زیادہ بڑی اور طاقتور تھی لیکن اس نے ملک کی حفاظت کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اگر وہ پوری قوت سے پرتھی راج کا ساتھ دیتا تو ترک اس قدر آسانی کے ساتھ ہندوستان پر قبضہ نہ کر سکتے۔ مگر تقدیر اٹل ہے۔ شروع سے لے کر اب تک ہندوستان اپنی پھوٹ ہی کی وجہ سے برباد ہوتا چلا آیا ہے۔ جے چند بھی اس قومی غداری کے بعد بہت دنوں تک چین سے نہ بیٹھنے پایا۔ پرتھی راج کی شکست کے دو ہی سال بعد اس کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد راجپوت وقتاً فوقتاً مسلمانوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے لیکن دہلی اور قنوج کی ریاستوں کے مٹ جانے کے بعد ہندوستان میں ترکوں کے سیلاب کو روکنے والی کوئی طاقت باقی نہ رہی۔ ہانسی اور اجمیر کی ریاستیں بھی آسانی سے فتح ہو گئیں، اور سلطان محمد غوری قطب الدین ایبک کو ہندوستان کا نائب مقرر کر کے غزنی واپس چلا گیا۔

یہاں پر اس زمانہ کے سماجک حالات کا مختصر بیان بیجا نہ ہوگا۔ ذات پات کی بندشوں نے اس وقت کے ہندوؤں کو پوری مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا۔ برہمن سب سے اونچے مانے جاتے تھے، حتیٰ کہ وہ موت کی سزا سے بھی مستثنیٰ تھے۔ راجپوتوں کا درجہ بھی چنداں کم نہ تھا۔ ان کی بہادری بے نظیر تھی، اور وہ میدان جنگ سے بھاگ کر جان بچانے سے وہیں جان دینا کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ لیکن شاید حوادث کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا ان میں مادہ نہ تھا۔ ذاتی شان اور خاندانی آن کے لیے وہ ہر وقت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مر مٹنے کو تیار رہتے تھے لیکن مجموعی حیثیت سے دیس یا دھرم کی حفاظت و ترقی کا انھیں چنداں خیال نہ تھا اور جتنا انھیں اپنی بات کا لحاظ اور اپنی عزت کا پاس تھا، اس کا آٹھواں دسواں حصّہ بھی ملک کی شان یا قوم کی حفاظت کا لحاظ نہ تھا۔ عورتوں کی حالت محکومیت کی تھی۔ بیواؤں کو دوبارہ شادی کا اختیار نہ تھا۔ ستی اور جوہر کا عام رواج تھا۔ دختر کشی بھی عیب نہ تھی۔ کم سنی میں شادی کر دی جاتی تھی۔

ملک کی مالی حالت اچھی اور تجارت ترقی پر تھی۔ علم و ادب کا عام چرچا تھا اور راجپوت راجوں رئیسوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی، اور وہ پنڈتوں اور ودوانوں کی بڑی قدر کرتے تھے کئی حکمران خود بھی شاعر و مصنف تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ملک میں کوئی نظام یا سنگھٹن نہ تھا اور نہ عوام کو منتشر طاقتوں کے شیرازہ بندی کی کوئی صورت تھی۔ باہمی رقابتوں اور روزمرہ خانہ جنگیوں نے ملک کو کمزور کر دیا تھا۔

تھانیسر کی لڑائی کے پہلے ہی سے بدھ مت کی جگہ شیومت اور وشنو دھرم نے لے لی تھی جس کو بھگتی کی مذہبی تحریک سے بڑی تقویت پہونچ چکی تھی۔ ملک میں ہزاروں مندر اور شوالے بن گئے تھے۔ مسلمانوں کی فتوحات نے اس سوشل نظام کو تہ و بالا کر دیا اور ہندو مذہب۔ ہندو لٹریچر اور ہندو کلچر سب کو ان سے بڑا دھکا پہونچا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے مندر توڑ کر مسجدیں بن گئیں اور بیشمار ہندو مسلمان ہوگئے۔ لیکن یہ سب تبدیلیاں سطحی تھیں۔ ملک کے نظم و نسق کے لیے مسلمان حکمرانوں کو ہندو ملازموں ہی کو رکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے سلطنت میں انقلاب ہو جانے کے باوجود مال گذاری کی تحصیل وصول اور عدالتوں کا کام۔ تعمیرات اور دیگر سول محکمے ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ مسلمان بادشاہوں نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں ہندو کاریگر ہی کام کرتے تھے۔ ہندو سنار ان کے سکے ڈھالتے اور ہندو پنڈت دھرم شاستر کے متعلق انھیں مشورے دیتے تھے۔

تھانیسر کی لڑائی کے بعد مسلمان ہندوستان میں مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ جس کا ملک کی تاریخ پر بہت بڑا اثر پڑا۔ ظاہر ہے کہ ایک جگہ سکونت رکھنے کے بعد ہندو مسلمان دونوں ایک دوسرے سے کیسے بے اثر رہ سکتے تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے ایسا طریق زندگی اختیار کر لیا جو نہ خالص ہندو تھا اور نہ خالص مسلم۔ بلکہ جو دونوں کا مشترکہ اور مجموعی کلچر تھا جسے ہم "ہندو مسلم کلچر" کے نام سے یاد کر سکتے ہیں اور جس میں ہندو مسلمان دونوں کے پہلو بہ پہلو رہنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس نئے طرز معاشرت میں ہندو مذہب، ہندو آرٹ، ہندو لٹریچر اور سائنس نے مسلم عناصر کو کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ خود ہندو کلچر کی ماہیت تبدیل ہو گئی۔ اسی طرح ہندو مسلم تصادم سے مسلم کلچر، مسلم آرٹ اور خود اسلام نے ہندوستان میں ایک نئی شکل اختیار کر لی۔

ہندو مذہب پر اسلام کا سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ عوام کے عقائد میں توحید کا خیال جو عرصہ سے سست پڑ گیا تھا پھر زیادہ زور کے ساتھ جاگزیں ہو گیا۔ پرانا کہ ہندوؤں میں بہت سے دیوی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ اور گو شروع ہی سے ہندو مذہب میں ایک قادر مطلق پرمیشور کا خیال موجود ہے لیکن دیوی دیوتاؤں کی کثرت نے توحید کو کمزور کر کے اسے بالکل پس پشت ڈال دیا تھا۔ اسلام نے ہندوستان آکر خدا کی وحدانیت پر غیر معمولی زور دیا جس کا عام خیالات پر بہت بڑا اثر پڑا۔ چنانچہ تین چار صدی بعد کے ہندو ریفارمروں اور روحانی لیڈروں کی تعلیمات میں اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ ان ریفارمروں نے بعض مذہبی عقائد عمداً ترک کر دیئے اور ان کی جگہ جن عقائد کا پرچار کیا ان کی بدولت ہندو مذہب اور اسلام دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہو گئے اس مذہبی اصلاح کی سب سے نمایاں مثال کبیر اور گورو نانک کی تعلیمات میں ملتی ہے اسی سلسلہ میں ریداس داؤد، تلوک داس، اور بہت سے دوسرے روحانی پیشواؤں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلم صوفیوں نے بھی جو محمد بن قاسم کے وقت سے سندھ آکر ہندوستان کے بہت سے مقامات میں پہونچ گئے تھے بعض ہندو عقائد قبول کر لیے۔

اس وقت کی تعمیرات میں بھی اس مشترکہ کلچر کا اثر بخوبی نمایاں ہے۔ اس زمانہ کی ہندو عمارتیں خالص ہندو طرز کی نہیں ہیں۔ ان کے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نئے اسٹائل نے جو نہ خالص ہندو ہے اور نہ خالص مسلم پرانے طرز کی جگہ لے لی ہے اس طرح مسلم تعمیرات میں صاف طور پر ہندو اثر نظر آرہا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مسلم تعمیرات میں ایرانی اور عربی طرز تعمیرات کے چند پہلو اب بھی قائم رہے، لیکن جب یہ پہلو ہندو طرز تعمیر میں شامل ہو گئے تو ایک نیا اسٹائل پیدا ہو گیا جس میں ہندو تعمیر کا رنگ صاف طور پر جھلکتا ہے۔ اس نئے اور متحدہ اسٹائل میں اگر ایک طرف مسلم طرز تعمیر کی سادگی باقی نہ رہی تو دوسری طرف ہندوؤں کے شوق آرائش[ل] و سجاوٹ میں بھی بہت کمی ہو گئی ہندو صناعی کی عام وضع قطع (جنرل ڈیزائن) اس کی سجاوٹ اور پرکاری تو قائم رہی لیکن اس پر نوکدار محراب اور سادہ گنبد اور ہموار دیواروں کے جو پیوند لگائے گئے وہ مسلم فن تعمیر کے خاص جز و تھے۔ اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس زمانہ کی ہندو مسلم تعمیرات دراصل ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں جن میں چند ظاہری اختلافات کے باوجود معنوی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

ہندو مسلم کلچر کا اثر تعمیرات سے کہیں زیادہ مصوری میں پایا جاتا ہے، چنانچہ مغل اور راجپوت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ل ORNAMENTAL

مصوری ایک ہی آرٹ کے دو مختلف نمونے ہیں اور راجپوت مصوری اجنتا کے فن تصویر سے بہت دور مگر مغل مصوری کے بہت قریب ہے۔ در اصل مغل اور راجپوت مصوری کا فرق محض سطحی ہے راجپوت آرٹ میں راگ راگنیوں اور نائکوں کی تصویروں میں جو نمونے بنائی گئی ہیں وہ شکل صورت سے تو راجپوت ہیں لیکن ان کا لباس اور ان کی نشست ایرانی ہے۔ اس طرح نیا آرٹ خالص ہندو یا خالص مسلم آرٹ سے بالکل جداگانہ ہے، اور اس کو فقط "ہندو مسلم آرٹ" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ نئے طرز میں اجنٹا کے آرٹ کے لوچ اور نرمی کے ساتھ ساتھ سمرقند اور ہرات کا تناسب اور وصل و فصل بھی موجود ہے، اور انواع و اقسام کے رنگوں کے حیرت انگیز شوخی اور ان کی آمیزش نے باریک خطوط کے ساتھ مل کر ایک نیا حسن پیدا کر دیا ہے۔

نئے ہندو مسلم کلچر کا اثر دیسی لٹریچر اور دیسی زبانوں پر بھی پڑا۔ مسلم فتوحات کے بعد سنسکرت کا زمانہ تو بالکل ختم ہو گیا، اور اس کی جگہ اظہار خیال کے لیے ہندی۔ مرہٹی۔ بنگالی، گجراتی زبانیں وجود میں آئیں مسلمانوں نے بھی ترکی۔ فارسی ترک کر کے دیسی زبان اختیار کی، اور اس طرح ایک نئی زبان یعنی اردو یا ہندوستانی پیدا ہوئی۔ ہندی زبان پر بھی مسلم اثرات کے گہرے نقوش ہیں۔ الفاظ۔ گرامر۔ تشبیہات اور طرز تحریر سب پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ یہی بات مرہٹی پنجابی اور سندھی وغیرہ زبانوں پر صادق آتی ہے۔ امیر خسرو کی خالق باری اسی اثر کا خوشگوار نتیجہ ہے۔ قطب الدین ایبک کا خطاب لاکھ بخش ان دونوں زبانوں کے میل جول کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

اہل عرب بہت دنوں پہلے ہندو علم حساب اور ہندو فن طب کے مرہون منت ہو چکے تھے لیکن عربوں نے یونان سے بھی اپنے علم میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس لیے وہ ان صیغوں میں ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ان کی نئی معلومات سے ہندوؤں کو بہت فائدہ پہونچا ہندو ریاضی دانوں نے کئی اصطلاحات مسلمانوں سے مستعار لیے اور کئی عربی کتابوں کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ مثلاً علم ہیئت میں تاجک کا سنسکرت میں ترجمہ کیا گیا۔ دوا سازی کی کئی خاص ترکیبیں ہندوؤں نے مسلمانوں سے سیکھیں۔ فن کاغذ سازی بھی مسلمانوں نے چین سے حاصل کر کے ہندوستان میں رائج کیا۔

ہندو موسیقی پر بھی اس اتحاد کا غیر معمولی اثر پڑا۔ مسلمانوں نے یہاں کی قدیم راگ راگنیاں تو قبول کر لیں لیکن آلات موسیقی میں بہت کچھ رد و بدل کیا جو آج تک رائج ہے۔ چنانچہ یہاں کے پکھاوج اور مردنگ کی جگہ طبلہ بن گیا اور بین کی جگہ ستار نے لے لی۔

لباس۔ رسمیات۔ آداب محفل۔ غذا۔ کھانا پکانا سب پر مسلمانی تہذیب و معاشرت کا

Spacing - نٹ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا گہرا اثر پڑا موجودہ حلوائی کی دکان تو شروع سے آخر تک مسلمانوں کی رہین منت ہے۔ خود حلوائی کا لفظ اور اکثر ہر وجہ مٹھائیاں گلاب جامن۔ بالوشاہی۔ امرتی وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کا تحفہ ہیں۔ روٹی بھی ترکی زبان کا لفظ ہے۔ چمچہ۔ توا وغیرہ معمولی الفاظ بھی مسلمانوں کی بدولت رائج ہوئے ہیں۔ چاچا۔ چاچی۔ دادا۔ دادی۔ چیچا۔ چیچی۔ سب غیر ملکی الفاظ ہیں جو اب ہمارے روزمرہ زندگی کا ضروری جزو بن گئے ہیں۔ اماں کا لفظ بھی ہم کو ترکوں سے ملا ہے۔ ہمارا موجودہ درزی خانہ بھی مسلمانوں کا رہین منت ہے۔

غرض ہماری زندگی کا کوئی شعبہ مسلم اثر سے خالی نہ رہا۔ اور ہندوؤں نے جن کی احتیاط اور الگ تھلگ رہنے کی عادت ضرب المثل ہے دانستہ یا نادانستہ مسلمانوں کی معاشرت اور زندگی کے طور طریقوں کو بالکل اپنا لیا مسلمان بھی ہندو تہذیب و ہندو تمدن سے شیر و شکر کی طرح گھل مل گئے۔ آج کل کے ناواقف مسلمان شاید یہ سن کر تعجب کریں کہ تھانیسر کے فاتح محمد غوری نے عرصہ تک پرتھی راج کے سکوں کا سانچہ قائم رکھا۔ اس کے سکوں کی پشت پہ لکشمی جی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ بلبن پہلا ترک حکمران تھا جس نے عربی طرز کے سکے رائج کئے۔

ہندوستان کو مسلمانوں کی آمد سے ایک اور بہت بڑا فائدہ پہونچا کہ آٹھویں عیسوی میں بدھ دھرم کے زوال کے بعد صدیوں تک اس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس تعلق کو از سر نو جاری کیا۔ چنانچہ یورپ کی نئی ایجادات ترکوں ہی کے ذریعہ ہندوستان میں رائج ہوئیں۔ بارود کو سب سے پہلے ہندوستان میں بابر نے پانی پت کی پہلی لڑائی میں داخل کیا اس طرح تھانیسر کی لڑائی نے ہندوؤں کا عروج ختم کرنے کے ساتھ ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی۔

* * * *

جب انسان حسن و عشق کے مرحلے طے کرتا کرتا منزل کمال تک پہونچ جاتا ہے تو وہاں حسن و عشق دونوں فنا ہو جاتے ہیں، نہ حسن حسن رہتا ہے اور نہ عشق عشق، بلکہ ایک عام محویت طاری ہو جاتی ہے اور دوئی کے پردے درمیان سے اٹھ جاتے ہیں اور انسان اس مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں من تو شدم تو من شدی کا وظیفہ ورد زبان ہوتا ہے۔ اس منزل پر پہونچ کر منصور نعرۂ "انا الحق" لگاتا ہے اور مجنوں "انا لیلیٰ" پکارنے لگتا ہے۔

جنوری ۱۹۳۶ء

دیا نرائن نگم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نگاہ خلوص بیں کا

جواب

کانپور: ۲۵۔ اپریل ۱۹۴۳ء

بھائی جوشؔ! تسلیم

نفس کو تعریف کا عادی بنانا میں نے ہمیشہ جرم سمجھا، اور "زمانہ" کو بھی اس معصیت سے بچائے رکھا ہے، اس طرح جیسے کوئی ماں اپنی بیٹی کا نگاہِ بدبیں سے بچاتی ہے۔

پرچے میں شاذ و نادر ہی کبھی آپ نے میرا ذکر یا احباب کی خواہ مخواہ تعریف دیکھی ہوگی۔ ہاں جب کسی کے کمال کی حکومت دل پر قائم ہو جاتی ہے تو مجبوراً و معذوراً دو چار سطریں قلم سے نکل جاتی ہیں، مگر ان سطروں کو آپ وہی درجہ دیجئے جو اہلِ حکومت خراج کو دیتے ہیں۔ بعض احباب اسکو طبیعت کا فطری بخل سمجھتے ہیں، بعض اسے تجاہلِ عارفانہ یا غرورِ بیجا کہتے ہیں مگر میں اپنی جگہ پر اس خصلت سے جو میری جزوِ طبیعت ہو گئی ہے شرمندہ نہیں ہوں۔ اور شاید یہ معمولی سی ادا کارسازِ حقیقی یا منتظمِ عالم کو بھا گئی۔ اور آج اس نے عمر بھر کی کمائی کا حساب آپ کی نظم کی صورت میں بیباق کر دیا ہے۔ شاید میرا انعام (اگر میں کسی انعام کا مستحق تھا) اس سے زیادہ ممکن نہ تھا۔ اتنا افسوس ہے کہ میں دولتِ دنیا سے محروم ہوں ورنہ آج قارون کا خزانہ بھی ہوتا تو آپ کے محبت بھرے اشعار پر تصدق ہو جاتا۔ خواہ بچے کوستے اور دنیا جو چاہتی کہتی، مگر یہ بھی عنایتِ ایزدی ہے کہ آپ کی محبت کی داد دینے کی جرأت کرنے کا بھی امکان نہیں ہے۔ ورنہ کمالِ فن اور خلوصِ قلب، دونوں کو اپنی اپنی جگہ شرمندگی سے منہ چھپانا پڑتا۔

آپکی نظم سننے کے بعد میری کیا حالت ہوئی؟ شاید آپ مبالغہ سمجھیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب کی کیفیت ناقابلِ اظہار ہے۔

آپ کے اشعار کا اہل ہونے کے لیے میں ایک نہیں، اپنے کئی جنم نثار کرنے کو تیار ہوں۔ کسی انسان کو اس نظم کی تمنا میں سو برس بھی جینا پڑے تو کم ہے۔ دعا کیجئے کہ شاعر کے لافانی اشعار کہیں مجھے مغرور نہ بنا دیں، اور کہیں ان سے نفس کی بدی کو تقویت نہ مل جائے۔ زندگی کے چند لمحے جو باقی ہیں اسی قرینے سے کٹ جائیں اور بعد کو اہلِ نظر کو یہ کہنے کا حق نہ ہو کہ جوشؔ جیسے نکتہ رس شاعر کی "نگاہِ خلوص بیں" دھوکا کھا گئی تھی۔

میرے لیے یہ اشعار حاصلِ زندگی ہیں خدا کرے آپ کو یا مجھ کو ان کے لیے کم سے کم اس جہانِ آب و گل میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

آپ کا خادم

دیا نرائن نگم

بخدمت حضرت جوشؔ ملیح آبادی صاحب

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

(از زمانہ یادگار نمبر ۱۹۴۳ء)

پریم چند

زمانہ، اکتوبر ۱۹۳۶ء (اقتباس)

آج جب ادبی دنیا کا یہ آفتاب عالم تاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ہے تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ آج کل جب آئے دن اردو ہندی کی باہمی رقابت میں ترقی ہو رہی ہے جب ہمارے ادبی رہنما خواہ مخواہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو رہے ہیں۔ پریم چند کے بعد ہمکو کوئی انشا پرداز ایسا دکھائی نہیں دیتا ہے جو دونوں کے درمیان سفیرِ صلح کی خدمت انجام دے سکے اور جس سے باہمی غلط فہمیاں رفع کرنے کی امید کی جا سکے۔ ملک میں لکھنے والوں کی کمی نہیں افسانہ نویسوں کا قحط نہیں۔ شاعروں کی بھی ہر طرف بہتات ہے لیکن ایسے لکھنے والے کہاں ہیں جن کو قدرت نے تخلیق کا مادہ بخشا ہو۔ جن کو فطرت نے اتفاق و اتحاد کی تلقین کا حق عطا کیا ہو جو فروعی تکلف۔ سطحی اختلافات اور ظاہری تصنع سے بالاتر ہو کر عوام کو زندگی کے حقائق کی طرف متوجہ کر سکیں اور جن کی بات دل پر نقش ہو کر بیٹھ جائے۔

پریم چند کو قدرت نے یہ مادہ فیاضی کے ساتھ عطا کیا تھا۔ جس خلوص و مستقل مزاجی بلند نظری و اولوالعزمی کے ساتھ انہوں نے اپنے خداداد زورِ قلم کو ملک اور قوم کی اعلیٰ ترین خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ موجودہ زمانہ کی ادبی تاریخ کا ایک زرّین کارنامہ اور ہمارے ملکی ادب کی عظیم الشان داستان کا تمہیدی باب ہے جس پر آئندہ ہماری انشاپردازی کی قدر و قیمت کا دارومدار ہوگا۔ پریم چند کے افسانے چار دانگ عالم میں ہمارے ملک اور ہمارے ادب کا نام روشن کریں گے۔

پریم چند نے اپنی تمام تصانیف میں ہم کو اپنے ملک پر فخر اور اہلِ ملک سے محبت کرنے کی عملی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے پسماندہ طبقوں کی فطری شرافت کو نمایاں کر کے وطن پرستی کا حق ادا کیا ہے۔ انہوں نے پست و پامال لوگوں میں بھی انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر ڈھونڈھ نکالے ہیں۔ اُن کے ناول ترجمانِ حقیقت ہیں۔ ان کے قصے درسِ عبرت ہیں۔ ان کی سیرت نگاری نے مردانہ محاسن اور زنانہ خوبیوں کی تصویریں کھینچ دی ہیں۔ ان کے ناولوں کے کیریکٹر خیالی دنیا کی مخلوق نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کے جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان کے مضامین رہنمائے حقیقت ہیں ان کے ڈرامے انسانی فطرت کے دلنشیں عکس ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

Mrs. Daya Narain Nigam
1884 – 1939

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

Mr. Sri Narain Nigam M.A., LL.B. (Senior Advocate)
He Edited Zamana from 1942 to 1949

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانہ

اپنے مضامین کے آئینہ میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حبِ وطن کی منزل

لالہ لاجپت رائے

زمانہ جنوری ۱۹۰۸ء

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

گذشتہ دو سال سے جو سلوک سرکار ہند کی طرف سے باشندگان ملک کے ساتھ ہو رہا ہے اس پر ہمارے اہل وطن بہت رنجیدہ اور ناراض ہیں۔ لیکن حقیقت میں اگر غور کیا جائے تو سرکار انگریزی نے جو کارروائی کی ہے۔ وہ کوئی غیر معمولی نہیں ہے۔ ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کہ ظلم اور بدمعاملگی۔ انسانی نیچر میں طبعی ہیں۔ تاہم معمولی انسانی تجربہ یہ تبلاتا ہے کہ جب کوئی شخص واحد یا جماعت انسانی ایک دفعہ کسی دوسرے کے مال و منال اور حقوق پر قبضہ کر لیتی ہے اور ایک مدت تک اس سے مستفید ہوتی رہتی ہے تو اس کے لیے یہ ایک نہایت ہی مشکل امر ہو جاتا ہے کہ وہ شخص یا جماعت محکوم و تحت کے دعوے پر اس کے حقوق اس کو دیدے۔ عام طور پر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک مدت کے ناجائز یا جابرانہ قبضے کے بعد شخص یا جماعت قابض کی ذہنی اور اخلاقی حالت میں ایسی تبدیلی واقع ہوتی ہے کہ اس کو فریق محکوم و ماتحت کے دعوے خلاف قدرت اور بیہودہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ از روئے وہ اپنا جائز حق سمجھتا ہے کہ ہر قسم کے وسائل سے اپنے قبضے اور اختیارات کی حمایت اور محافظت کرے۔ اور شخص غیر قابض کو نہ صرف اس کے دعووں کی بیہودگی کا یقین دلائے بلکہ جبر و تشدد سے کبھی اس کی اُن سب کوششوں کا مقابلہ کرے۔ جو وہ اپنے حقوق کے واپسی کے لیے کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کے معمولی تعلقات میں یہ بات روزمرہ دیکھنے میں آتی ہے تو پولیٹکل دنیا میں اس کا تجربہ اور مشاہدہ اور بھی وضاحت سے ہوتا ہے۔ ہم اس سے پہلے ایک تحریر میں یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ ہم اس بات کو باور نہیں کرتے کہ اس ملک میں انگریز اہل ہند کے فائدے کے لیے آئے۔ اور اُن کی موجودہ حکومت محض اہل ملک کے فائدے کی غرض سے ہے۔ انگریزی قوم کو ہندوستان پر قبضہ رکھنے میں بڑا فائدہ ہے شاہ برطانیہ کے تاج میں ہندوستان سب سے بڑا نگینہ ہے۔ شہرت۔ طاقت اور ملکی رتبہ کے علاوہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

انگریزی قوم کو ہندوستان سے بہت کچھ مالی فائدہ بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں قدرتاً انگریزوں کی وہ جماعت جو ہندوستان پر حکومت کرتی ہے۔ اور جس کے ہاتھ میں کروڑہا ہندوستانیوں کی قسمت ہے۔ ہندوستانیوں کی ان کوششوں کو جو وہ اپنے اختیارات کی کمی اور اپنے حقوق کی بحالی کے لیے کرتے ہیں، پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ اول تو وہ ہندوستانیوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اہل ہند کی بہبودی اسی میں ہے کہ ہندوستان کے طرز و طریق حکومت میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ لیکن جن لوگوں پر یہ جادو نہیں چلتا۔ ان کو جبراً روکنا بھی وہ اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ اس وقت تک ہندوستانی غالباً اس خیال میں بیٹھے تھے۔ کہ جس وقت انگریزوں سے اپنے حقوق طلب کریں گے اسی وقت انھیں وہ حقوق مل جائیں گے۔ دو سال گذشتہ میں جو تجربہ ان کو ہوا ہے۔ اس سے ان کی ان امیدوں پر پانی پھر گیا۔ لیکن اصل یہ ہے کہ ہندوستانیوں کا یہ خیال کہ انگریز محض طلبی پر بخوشی خاطر ان کے پولیٹیکل حقوق عطا کر دیں گے محض ایک خام خیالی ہے اور ہم خوش ہیں کہ ان سب پر اب اس خیال کی غلطی ظاہر ہو گئی۔

ہم کو پہلے سے یقین کامل تھا کہ جس وقت ہندوستانیوں نے اپنے حقوق طلب کرنے کی کوشش کی۔ اور اپنے آپ کو اپنے قومی رشتے میں مضبوط کرنے کا ارادہ کیا تو فوراً حکام وقت کی طرف سے ان کی مخالفت ہو گی اور اگر ضرورت ہوئی تو جبر و تشدد سے بھی کام لیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بذات خود ہم کو اپنے حکام وقت کے کارروائیوں پر نہ کوئی حیرت ہوئی اور نہ ہے۔ ہم اپنے ذہن میں اس جبر و تشدد کے لیے بالکل تیار تھے۔ اور اسی لیے ہم کو ذاتی طور پر اس جبر سے بہت تکلیف نہیں ہوئی۔ ہم نہایت خلوص دل سے اپنے اہل وطن کی خدمت میں گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ قومی خدمت کا راستہ آسان گذار نہیں ہے۔

عشقبازی کار بازی نیست اے دل سر بباز
زانکہ گوئے عشق نتواں زد بچوگان ہوس

جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو اس قسم کے جبر و ظلم کے لیے تیار رہنا چاہیے ورنہ اس راستہ میں قدم ہی نہ رکھنا چاہیے۔ گورنمنٹ ہند جو کچھ کر رہی ہے وہ دنیا کی تاریخ میں اس سے پہلے دیگر گورنمنٹیں کرتی چلی آئی ہیں۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ ہم سے پہلے دیگر ممالک کے محبان وطن کے ساتھ ہو چکا ہے اور ہوتا رہا ہے۔ پس عقلمندی اور دانائی اس میں ہے کہ بغیر کسی غصہ و ناراضگی کے نہایت سنجیدگی اور متانت سے کام کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اس منزل میں جو تکلیفیں دنیا میں دوسرے انسانوں کو ہوئی ہیں وہ ہمیں بھی ہونگی۔ ان کے بغیر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

راہ گذاری ناممکن ہے۔ خواہ مخواہ شکوہ و شکایت میں وقت ضائع کرنے اور اپنی قوتوں کے بیجا استعمال اور تصرف سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اس راستہ میں نہ شکوہ و شکایت کی گنجائش ہے اور نہ شخصی نفع و نقصان کے حساب کو دخل ہے۔

خواہی کہ روشنت شود احوال سر عشق
از شمع پرس قصہ ز باد صبا مپرس
در دفتر طبیب خرد باب عشق نیست
اے دل بدرد خو کن و نام دوا مپرس

⁂ ⁂ ⁂

میری رائے میں سودیشی تحریک کی کامیابی سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان نااتفاقی، اختلاف اور تلخی کا ایک بوجہ بہت حد تک کمزور ہو جائے گا۔ اس وقت سرکاری عہدوں کے لیے جو کشمکش تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کے درمیان ہو رہی ہے وہ بڑی حد تک اس موجودہ افسوسناک شکر رنجی کی ذمہ دار ہے میرا خیال ہے کہ اگر سودیشی تحریک کی کامیابی سے تعلیم یافتہ ہندو مسلمان سرکاری ملازمت کی ضرورت سے آزاد ہو کر اپنے ملک کی تجارتی ضروریات پوری کرنے کو اپنی ترقی و دولت کی بنیاد بنا دیں تو اس باہمی شکر رنجی کا ایک باعث اگر بالکل دور نہیں کم از کم کمزور تو ضرور ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے تجارت و حرفت و صنعت کے بازار میں ہندو مسلمانوں کے باہم خاص تمیز کا قائم رہنا بھی اگر ناممکن نہیں تو سخت مشکل تو ضرور ہے۔ مثلاً کون سا سودیشی ہندو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ محض ہندوؤں کی ساخت کی اشیاء استعمال کرے گا۔ تجارتی معاملات میں باہمی اعتبار اور باہمی گہرے تعلقات کے پیدا ہونے کے بہت موقعے ہیں جو سرکاری ملازمت میں نہیں۔ سودیشی تحریک سے مسلمانوں کی بہت سی بیکار پیشہ جماعتوں کو کام ملے گا اور ان کی کمائی اور مزدوری میں معقول بیشی ہوگی جس سے ان میں سیلف ریسپکٹ کا خیال ترقی پائے گا بالفرض اگر یہ مان لیا جائے کہ تجارت و حرفت کے معاملات میں بھی دونوں مذہبی جماعتیں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں تو بھی یہ مقابلہ ملک کے لیے مفید ہوگا اور ملک کی دولت بڑھانے میں مدد دے گا اور چونکہ دونوں ایک ہی ملک کے رہنے والے ہیں اس واسطے مالی حالت کی بہتری اور دولت کی بیشی سے دونوں کو فائدہ پہونچے گا۔ اس میں دونوں کا مادی انٹرسٹ ہے کہ دولت اس ملک سے باہر نہ جائے۔

زمانہ مئی ۱۹۰۶ء لاجپت رائے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندی مذاق

سلطان احمد

زمانہ نومبر ۱۹۰۸ء

ترا کہ گفت کہ مائل بہ سرِ بستان باش
بہ نوش یک دو سہ جامے و خود گلستان باش

جن لوگوں نے زبانوں اور زبانوں کے آثار۔ کیفیات اور جذبات پر منصفانہ غور اور نظر کی ہے وہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی نگاہوں میں یا ادبی ترازو میں باعتبار وسعت۔ اثر اور مذاق کے زبانوں کی حالت مقابلتًا کیا ہے۔ جب انسان ادبی راہوں سے زبانوں کا تماشا دیکھتا ہوا گذرتا ہے۔ تو اُس وقت اُس تنگ چشمی یا تنگ دلی سے یہ تماشا نہیں دیکھتا جو عمومًا عوام الناس کا شیوہ ہوتا ہے۔ ادبی مذاہب میں سب زبانیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور ان میں باعتبار مراتب ایک نسبت وحدت پائی جاتی ہے۔ جس طرح باعتبار انسانیت کے سب انسان ایک ہی شاخ خلقت کے ثمر ہیں۔ اسی طرح سب زبانیں ایک ہی سلسلہ نطق یا شاخ طلاقت کی شعبہ ہیں یہ جدا بات ہے کہ ان میں باعتبار بعض حالات یا کیفیات کے گونہ امتیاز اور فرق ہو۔ مگر اُن کے ایک سلسلے میں ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا اور ممالک کی زبانیں کچھ نہ کچھ آپس میں نسبت رکھتی ہیں اور ان سب میں ایک واسطہ ہوتا ہے۔

یہ الحاق یا اتحاد اس لیے ہے کہ قدرتی اقتضا سے زبانوں کے مبادیات قریبًا ایک ہی قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ اگرچہ سب زبانوں کی ابجد میں کم و بیش ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ اختلاف رکھتی ہیں مگر اُن کی افتاد ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ مثلاً الف۔ ب۔ پ وغیرہ حروف کا تلفظ قریبًا ہر ایک زبان میں یکساں ہی واقع ہوا ہے۔ ہندی میں باپ۔ انگریزی میں پادر۔ فارسی میں پابودہ ایک ہی کشش سے جو حرف پ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اطلاق پاتے ہیں جن زبانوں مثلاً عربی اور عبرانی میں پ کا تلفظ ب سے کیا جاتا ہے وہ اس وجہ سے کہ عربوں اور عبرانیوں کی زبان پر پ کا اطلاق ثقیل ہے وہ تلفظ اُن کا بھی ہندیوں۔ انگریزوں اور فارسیوں کی طرح ہے ایک عربی یا ایک عبرانی پابودہ یا پادر کا اطلاق بابودہ یا بادر سے کرے گا۔ صرف ثقالت کی وجہ سے بجائے تین نقطوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے ایک نقطہ کام دے جائے گا۔ گو مختلف زبانوں کی ابجدوں اور انتا دابجدوں میں فرق ہے مگر ابجدی سلسلے ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر زبان دوسری زبان سے ایک نسبت رکھتی ہے زبانیں دو قسم کی ہیں۔

(۱) اصل یا قدیمی زبانیں۔

(۲) جدید یا مابعدی یا متفرع زبانیں۔

اس میں ہنوز بحث ہے کہ اصل یا قدیمی کون کون سی ہیں۔ بعض کے خیال میں حسب ذیل ہیں جرمن۔ فرنچ۔ اطالین۔ یونانی۔ سنسکرت۔ عربی۔ عبرانی۔ فارسی۔ بعض نے اس سلسلے میں کچھ ترمیم بہ شکل ایزادی کی ہے۔ ان کے ماسوائے اور جس قدر زبانیں ہیں وہ ان ہشتگانہ السنہ سے رفتہ رفتہ نکلی ہیں۔

بعض کا ایسا خیال کرنا کچھ بے جوڑ نہیں۔ اگر دوسری زبانوں کے الفاظ اور معانی کا مقابلہ ان ہشتگانہ السنہ سے کیا جائے تو صدہا کیا ہزاروں الفاظ اصل زبانوں کے ان میں پائے جاتے ہیں اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر اصل زبانوں کا سرمایہ نہ لیا گیا ہوتا تو ان کی پونجی کچھ بھی نہ تھی۔

انگریزی زبان کا سرمایۂ ذاتی نسبتاً کم ہے اطالین اور فرنچ سرمائے سے یہ زبان بنی ہے یا دوسری زبانوں سے عاریتاً سامان طلاقت لیا گیا ہے۔

اردو زبان کا کیا سرمایہ ہے۔ یہ زبان بنی تھی ہندی۔ فارسی۔ عربی سے اور اب رفتہ رفتہ اس میں انگریزی بھی ملتی جاتی ہے۔ اگر ہندی۔ فارسی۔ عربی کے جوڑ یا پرزے نکال دیئے جائیں تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ بھاشا کا سرمایہ سنسکرت ہے اگر اس میں سے سنسکرت کے الفاظ نکال دیئے جائیں تو بھاشا بذاتہٖ کچھ بھی نہیں رہتی۔

جو زبان دوسری زبانوں سے مرکب ہیں اُن کی ترکیب دو جہت سے۔

(الف) بہ جہت الفاظ و ترکیب۔

(ب) بہ جہت معانی و آثار و جذبات۔

ہر ایک مولفہ یا مرکبہ زبان میں یہ دونوں قسم کے آثار اور کیفیتیں پائی جاتی ہیں انگریزی میں فرنچ لٹریچر کی لہریں بہت کچھ پائی جاتی ہیں۔ اردو میں ہندی موجیں اپنا ٹھاٹھ دکھا رہی ہیں۔ عربی۔ فارسی بھی جھلک مار ہی جاتی ہے۔ اردو زبان میں جس کثرت سے ہندی الفاظ کا ذخیرہ پایا جاتا ہے اُس کا اندازہ اور احصار مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ اردو کا اندوختہ بہت کچھ ہندی ہی کے منتر ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو کی بنیادوں میں ہندی الفاظ ہی کی بھرتی کی گئی ہے۔ اور سوائے اس بھرتی کے اردو کی بنیاد رہتی بھی کھوکھلی۔

گو عربی فارسی الفاظ سے بھی عمارت اردو کی رنگا میزی ہوئی ہے۔ مگر ہندی مصالحہ بہت کچھ لگایا گیا ہے اور یہ لازمی بھی تھا۔ کیونکہ ہندی سامان خاص اپنا تھا اور عربی فارسی عاریتاً لیا گیا تھا۔ ہند میں وہ پیدا ہوئی تھی اور ہند ہی میں اس نے پرورش بھی پائی ہے۔ اگر ہندی سامان میں اس کا بہت کچھ حصہ نہ ہوتا تو کس کا ہوتا۔

عربی۔ فارسی سے اردو نے جو کچھ لیا اچھے انتخاب سے لیا اور اپنے اپنے موقع پر اُسے اچھا بنایا۔ اردو میں اب جس قدر الفاظ عربی فارسی کے پائے جاتے ہیں یا جن کا اس وقت استعمال ہوتا ہے وہ ایک خوبی اور متانت سے رکھے گئے ہیں اور اُن سے اچھا کام لیا جا رہا ہے اُن کی نشست منزل اردو میں اس خوبی اور اس عمدگی سے رکھی گئی ہے کہ اُن کا ذرا سا تغیر و تبدل بھی ترتیب میں فرق لاتا ہے۔ جس طرح ایک فوج صف شکنی سے بے ترتیب ہو جاتی اور بھدی لگتی ہے۔ اس طرح اگر ان الفاظ کی صف شکنی کر کے انھیں ردیف نقطہ سے نکال دیا جائے تو اردو ہی نہیں رہتی۔

اگر ہندی الفاظ نکال دیئے جائیں تو پھر اور بھی اُس کی مٹی خراب ہوتی ہے عربی فارسی الفاظ کا نکال دینا کڑیوں کا نکال دینا ہے۔ اور ہندی الفاظ سے اس کا خالی کر دیا جانا ایک شہتیر توڑ دینا ہے۔ خواہ زمانے میں کسی کی رائے کچھ ہو اب یہ وقت نہیں کہ اردو کی تختی میں سے ان زبانوں اور ان زبانوں کے الفاظ نکال کر کوئی خوبی اردو میں باقی رہ سکے اردو نے ہندی الفاظ جس طرح کثرت سے لیے ہیں اس نسبت سے ادبی دنیا میں یہ شعبہ شاعری یا نظم فارسی سے اس قدر حصہ نہیں لیا۔ زمین نثر میں تو بہت کچھ تبعیت ہندی کی کی جاتی ہے۔ لیکن نظمی سلسلوں میں زیادہ تر فارسی کا زور رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظموں اور شاعری میں ہندی خیالات یا ہندی جذبات کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔

اس کی سب سے بڑی وجہیں یہ ہو سکتی ہیں۔

(۱) ہندی کے اصل شعبوں سے ناواقفیت

(۲) ہندی کی شاعری اور نظم سے ناآشنائی۔

اگر فارسی ذخائر کی طرح ہندی ذخیروں سے بھی کام لیا جاتا تو اس وقت اردو شاعری کی کچھ اور ہی وقعت اور وسعت ہوتی۔ یہ غلطی قابل تسلیم ہے کہ ہندی کے ذخائر کی بابت بہت کم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کوشش کی گئی اور ہندی کا حاصل کرنا پس پشت ڈالا گیا۔ ایران میں دوڑ دھوپ رہی اپنے گھر یا اپنے مسکن کی خبر تک نہ لی۔ سیفی۔ ناصر کے عروض پہ نظر رہی۔ ان کی تقلید کا شوق رہا۔ اسی طرح غنی۔ سعدی اور حافظ کے کلام زیر مشق رہے۔ ہندی پنگل یعنی فن عروض۔ اترس فن قافیہ۔ کاتب۔ یعنی فن شعر سے شناسائی حاصل نہ کی نہ فن بنٹ یعنی تقطیع جانا اور نہ فروعات شعری۔ مثل۔ چھند۔ ساکھی۔ دوہا۔ وغیرہ سے واقفیت پیدا کی۔

اس غلطی کا صرف یہی نتیجہ نہ نکلا کہ معلومات میں ترقی نہ ہوئی۔ بلکہ یہ بھی کہ اردو کے ادبیات اور نظم شاعری میں جن قیمتی خیالات کی ضرورت تھی۔ ان سے اردو اب تک کسی حد تک خالی ہے اور دوسرے یہ کہ زبانوں کے خیالات جو بذریعہ تبادلہ خیالات کے ایک دوسری قوم کو ایک دوسرے کے قریب تر لے جاتے ہیں اس میں بہت کچھ فرق آگیا۔

یہ بات ہمیں ہندو کشمیری پنڈتوں اور کائستھوں کی فارسی آموزی سے معلوم ہوئی ہے کہ چونکہ ان دونوں قوموں میں فارسی کی ترقی تھی اس واسطے ان کے تعلقات اور رسم و رسوم اکل و شرب بہت کچھ مسلمانوں سے ملتے جلتے گئے۔ ان کے گھروں میں اب تک فارسی بولی جاتی ہے اور فارسی نے بخوبی ترقی کی۔

اگر اسی طرح مسلمانوں میں بھی ہندی کا سلسلہ جاری ہو تو بہت کچھ خیالات کا تبادلہ ہو کر اور بھی قریب ہو جاتا بالخصوص جب شعری دنیا میں یہ جذبات بتدریج دخل کرتے جاتے تو علاوہ ادبی دنیا کے ترقیات کے سوشل روابط میں بھی ایک قیمتی افزائش ہوتی۔ فی الواقعہ اس وقت منجملہ اور کمیوں کے یہ کمی بھی ایسی ہے جو ملکی میل ملاپ کے راستے میں حائل ہے۔

فارسی عرب کے مذاق اور جذبات سے ہم چونکہ واقف ہیں اس واسطے اس طرف کھنچے جاتے ہیں۔ اگر اسی طرح ہندی مذاق سے واقف ہوں تو اس طرف بھی ہمیں ضرور جھکنا پڑے گا۔ اور سرمایہ اردو میں ایک بے بہا ترقی ہوگی۔ بالخصوص یہ اردو شاعروں یا ناظموں کا کام ہے کہ وہ ہندی خیالات یا ہندی جذبات کا خاکہ اردو زبان میں لیں اور ہندی حاصل کرکے ہندی میں بھی طبع آزمائی کریں جب ہندو فارسی اور اردو میں قابل تعریف ملکہ حاصل کر چکے اور کرتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان نہ کریں۔

صدہا نہیں تو بیسیوں ہندو تو ضرور ایسے قابل دلائل مل سکیں گے کہ جو فارسی اور اردو میں اچھی نثر و نظم لکھ اور کہہ سکتے ہیں۔ بتلائیے مسلمانوں میں اتنے کیا انگلیوں کی پوروں پر بھی ایسے نہیں گنے جا سکتے جو ہندی میں اس وقت فی البدیہ کیا بعد تامل و حزم و احتیاط بھی کچھ کہہ سن سکیں۔ کیا مسلمانوں کے لیے کچھ تھوڑی [illegible] اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان لگے ہاتھ یہ کمی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی پوری کرنے جائیں۔ سب سے اول شاعران نازک خیال کی توجہ مبذول ہونی چاہیئے وہ یہ پہلو لیں۔ پھر ان کی توجہ سے یہ راہ خود بخود کھل جائیگی۔ اور اس تحریک سے اردو کی شعری دنیا میں ایسی ترقی ہوگی کہ گویا جو اس کی کمی تھی وہ بوجہ احسن پوری ہو کر تکمیل ہو جائے گی۔ ہندی کے بعض خیالات منظومہ ایسے لطیف اور موثر ہیں کہ اب تک اردو دنیا میں ان کی برابر بہت تھوڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ بیشک فارسی میں ایسی نازک خیالیاں پائی جاتی ہیں۔ مگر اردو سرزمین ہنوز ان سے خالی اور محروم ہے۔

مسلمانوں میں بالعموم کاروباری دُنیا کے متعلق عام تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ایک کمی ہے۔ اگر ہندی پر زور دیا جائے تو عام جماعتوں میں سے بہت سی جماعتیں معمولی نوشت وخواند اور روزمرہ حساب و کتاب کے لیے نکل سکتی ہیں۔ اردو بھی سیکھیں اور ہندی بھی۔

میری رائے میں تو اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان ہندی کیا گورکھی۔ لنڈے بھی سیکھیں اور انھیں میں روزمرہ کاروبار جاری رکھیں۔

علم اور ہر زبان کا سیکھنا ایک بڑھتی دولت ہے۔ اس سرمایہ سے کون انکار کر سکتا ہے۔ جو اردو نہیں سیکھ سکتے وہ ہندی سیکھیں۔ جو بھاشا نہیں جان سکتے وہ لنڈے اور پہاڑی حروف ہی میں کام کاج کریں۔

یہ تو ایک ضمنی تذکرہ تھا ہمارا روئے سخن شاعروں کی طرف ہے۔ مسلمانوں اور بالخصوص مسلمان شاعروں کا فرض ہے کہ وہ ہندی خیالات سے بھی اپنی شاعری کی وسعت اور وقعت میں ایک قیمتی اضافہ کریں ہم نے کسی اخبار میں پچھلے دنوں ایک مسلمان کے چند ہندی شعر مناجات میں دیکھے تھے۔ خلوص اور اچھے تھے۔ اور ان میں ہندی اثر اور جذبات کی ایک عجیب کیفیت دل پر زد کرتی تھی۔

بھیکا بھوکا کوئی نہیں ہر گٹھڑی میں لال
گرہ کھول پرکھیو نہیں اس بدھ بھئے کنگال

⁂

نوع انسانی کی تاریخ میں ہمیشہ کچھ لوگ ایسے ہوتے رہیں گے جو تکلیف برداشت کیا کریں گے اور کچھ ایسے جو دوسروں کو تکلیف دیتے رہیں گے اور بدی کا خاتمہ کبھی بھی پوری طرح سے نہ ہو سکے گا بلکہ جس طرح شعلہ روشن رہتا ہے اسی طرح یہ ایک مسلسل کیفیت ہمارے تمدن میں بھی قائم رہے گی

ٹیگور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو زبان میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا استعمال

شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ

زمانہ، جنوری ۱۹۱۱ء

ممتاز انشاپردازوں کا ایک زمرہ ایسا بھی ہے کہ اردو زبان میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کو وحشی اور غیر مانوس الاستعمال سمجھ کر ان کے استعمال سے متنفر ہے اور یہ جانتا ہے کہ ان کے استعمال سے اردو زبان سرد یعنی بگڑی ہوئی اردو ہو جاتی ہے۔ وہ ان کا اپنی زبان میں گنجہ ترجمہ کر کے اس کے سر پہ نئے معانی کے بال جماتا ہے جو کسی طرح جمائے جمتے نہیں۔ پرانے الفاظ نئے معانی کو ذہن نشین نہیں ہوتے دیتے۔ مثلاً ڈیلی گیٹ[1] کا ترجمہ نمائندہ کیا جاتا ہے جو قانون دکھائی کی شرمناک اصطلاح کو یاد دلاتا ہے۔ والنٹیر[2] کا ترجمہ رضاکار کیا جاتا ہے جو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہے۔ انارکسٹ[3] کا ترجمہ لاحکمیوں کیا جاتا ہے جس کی ترکیب عربی فارسی زبان کے موافق درست نہیں۔ ڈیپوٹیشن[4] کا ترجمہ وفد کیا جاتا ہے۔ جو ٹھیک ترجمہ ہے مگر انگریزی اور عربی الفاظ دونوں ایسے ہیں کہ وہ عام فہم نہیں۔ جیسے وفد کے معنی جانتے ہیں مشکل ہے ایسی ڈیپوٹیشن کے معنی ہیں۔ اس باب میں پنجاب یونیورسٹی کے علمار زبان دان نے جو فیصلہ اصول زبان کے موافق کیا ہے کہ جس انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کے معانی اردو الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتے۔ اصل الفاظ کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اردو زبان کا بالطبع اقتضا یہ ہے کہ آخر کار اس کا فیصلہ جاری و ساری ہوگا۔ گو اس وقت اپنی زبان کے متعصبین اس کو اپنی زبان کے حق میں زہر سمجھتے ہیں۔ اور انگریزی زبان کے ممنون منت نہیں ہوتے جو اردو زبان کی اپنے الفاظ و اصطلاحات مستعار دیکر توسیع کرتی ہے اور طرح طرح کے حسن بیان پیدا کرتی ہے ان متعصبین کو اردو زبان کی اس تاریخی سرگزشت پر متوجہ ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کی بادشاہی زبان عربی فارسی نے یہاں کی بھاشا زبان کے الفاظ کو خارج کر کے ان کی جگہ اپنا تسلط کیا۔ اسی طرح انگریزی زبان جو بادشاہی زبان ہے عربی سنسکرت فارسی زبانوں کے الفاظ کو ٹکسال باہر کر کے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا سکہ جمائے گی۔ چنانچہ اس کی مثالیں مشاہدہ میں آتی ہیں کہ روزمرہ کی بول چال میں جن انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے ترجموں کو پہلے استعمال کرتے تھے اب ان کی جگہ انگریزی اصل الفاظ بولنے لگے۔ جن کی فہرست بڑی طول طویل ہے اور جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہماری زبان میں انگریزی الفاظ کے داخل ہونے

---

[1] DELEGATE [2] VOLUNTEER [3] ANARCHIST [4] DEPUTATION

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ں

کا حال ایسا ہی ہے جیسے کہ پہلے عربی فارسی الفاظ کے داخل ہونے کا ہوا کہ ہندوؤں نے اپنے مسلمان بادشاہوں کے ساتھ ہمکلام ہونے اور اپنا مطلب آسانی سے سمجھانے کے لیے اپنے بھاشا کے الفاظ کی جگہ عربی فارسی الفاظ بولنا شروع کیے اور آخر کو اس کی نوبت یہاں تک پہونچائی کہ انھوں نے ایک نئی اردو زبان پیدا کر دی ایسے ہی انگریزی حکام سے ہم کلام ہونے اور اپنے اغراض مطالب و مقاصد سمجھانے کے لیے عربی فارسی سنسکرت زبانوں کی جگہ ہم انگریزی الفاظ بول بول کے ایک نئی زبان اردو جس میں انگریزی زبان کا غلبہ ہوگا پیدا کر دیں گے۔ میں نے پنجاب یونیورسٹی کے فیصلہ پر خیال کر کے اپنی تحریرات میں نئی اصطلاحات اور الفاظ تراشنے کی تکلیف نہیں اٹھائی بے تکلف پولٹیکل اصطلاحات کے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا اور انکی معانی بہت توضیح اور تشریح کے ساتھ اپنی زبان میں بیان کر دیئے۔ بے شک انگریزی الفاظ کا تلفظ ہندوستانی غلط سلط کریں گے مگر اس تلفظ کی خرابی سے زبان کو نقصان ایسا نہیں پہونچے گا جو معانی کے غلط سمجھنے سے یا نہ سمجھنے سے ہوتا ہے۔ تلفظ بھی رفتہ رفتہ ایسا ان کا ہو جائے گا کہ کچھ دشواری نہیں رہے گی۔ میری ساری عمر اپنی زبان میں مغربی خیالات کے بیان کرنے میں گذری ہے۔ مجھے ایک انگریزی ضرب المثل یاد تھی کہ جو شخص غیر زبان کے الفاظ اپنی زبان میں استعمال کرتا ہے وہ احمق ہوتا ہے اس لیے میں نے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کے لیے الفاظ تراشنے میں بڑا وقت ضائع کیا۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ ضرب المثل ایسے الفاظ کے لیے ہے جو ناحق اپنی زبان میں داخل کیے جاتے ہیں۔ ضرورت کی صورت میں اس کے موافق عمل نہیں ہو سکتا۔ گو میں جانتا ہوں کہ ابھی تک بہت انشا پرداز ایسے ہیں کہ وہ پنجاب یونیورسٹی کے فیصلہ کو نہیں مانتے اور اپنی زبان کے الفاظ تراشنے کو حسن بیان اور بلاغت زبان جانتے ہیں اسلئے وہ میری زبان کو شگفتہ بیانی اور رنگین بیانی اور شیریں زبانی سے خالی سمجھیں گے۔ مگر میں اس کی پروا نہیں کرتا۔ مشرقی خیالات مشرقی زبان میں جو بلاغت و فصاحت رکھتے ہیں وہ مغربی خیالات مشرقی زبان میں نہیں رکھتے۔

؎ ؎ ؎ ؎

شہرت: شہرت کا خیال کیسا دل خوش کن ہے اس کی آرزو کیسی مسرت خیز ہے۔ اس کی تمنا کیسی دلفریب ہے کون سا دل ہے جس میں وہ جلوہ گر نہیں۔ وہ کون سا دماغ ہے جو اس کے نام سے متاثر نہیں؟ شاہ و گدا، امیر و غریب سب پر اس کی حکومت یکساں ہے۔ ہر شخص کشادہ پیشانی سے ان مصائب اور تکالیف کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا ہے جو شہرت حاصل کرنے میں اسے پیش آتی ہیں۔ ہر شخص اس کی آن پر جان دیتا ہے اور ہر شخص کا یہی منشا خیال ہے بھلے اور برے سب اس کے جویاں اور اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

زمانہ اپریل ۱۹۱۱ء

محمد یحییٰ تنہا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لکھنؤ کے پُرانے سین

نوشتہ رائے نظر

زمانہ مارچ ۱۹۱۲ء

خوشتر آن باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران

شاہان اودھ کی شوکت پسندیوں اور زندہ بختیوں کے افسانے ہندوستان سے یورپ تک مشہور ہیں اور ان میں کچھ ایسی ندرت پائی جاتی ہے کہ تمام مغربی سیاحوں نے جو گذشتہ سلطنت کے زمانہ عروج میں یہاں آئے یا قیام پذیر رہے انھیں قلمبند کرنے کی تکلیف گوارا فرمائی ہے ان اولوالعزم فرمانرواؤں کے ذاتی مشاغل۔ ان کی شاہانہ زندگی اور پولیٹیکل مسائل کی پیچیدگی کو جب باہم ملا کر دیکھا جاتا ہے تو تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اُن سیاسی مشکلات کے جن کی مقدار روز بروز بڑھتی جاتی تھی ان کے دماغ پولیٹیکل تفکرات سے آزاد ہو کر ان کی روزانہ زندگی کو کس طرح اس قدر فرحت ناک بنا سکتے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی سی سلطنت کے حدود میں قیصر و فغفور کی سی شان و شوکت اور جمشید و خسرو کی سی عشرت پسندی قائم رکھتے تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ ان کے آبا و اجداد براہ راست فارس سے آئے تھے اور نیشاپور ان کا اصلی وطن تھا۔ فارس پر اگرچہ فی الحال نکبت و زوال کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں لیکن ابتدائے زمانہ تاریخ سے اب تک وہ کم و بیش شان و شوکت اور عشرت پسندی کا گہوارہ بنا رہا ہے۔ پس یہ باتیں ان حکمرانوں کی طبیعت میں خلقی طور پر موجود تھیں جن پر پولیٹیکل تفکرات غالب نہ آ سکے۔ اگرچہ اودھ کے ابتدائی حکمرانوں میں دلیری جنگجوئی اور کشور ستانی کے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ جیسا کہ "برہان الملک"، صفدر جنگ۔ اور شجاع الدولہ کی تاریخوں سے واضح ہے۔ تاہم ان سپاہیانہ طبیعت کے حکمرانوں میں بھی (حالانکہ وہ محض ایک صوبہ دار کی حیثیت رکھتے تھے) شاہانہ مغلیہ کی سی شوکت پسندی اور عشرت پرستی کا شائبہ موجود تھا۔ لیکن ان کی بہادرانہ زندگی نے ان کی عشرت پسندی پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اور اخیر شاہان اودھ چونکہ دلیرانہ اوصاف سے تدریجاً معرا ہوتے گئے لہذا صرف ان کی عشرت پسندی ہی بدنما صورت میں ظاہر ہوئی بلکہ ان کی شوکت پسندی اور فیاضی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھی معیوب معلوم ہونے لگی۔
ان بادشاہوں کی اولوالعزمیوں میں جو امر سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے وہ ملک کے قلیل محاصل ہیں جن کی تعداد کسی زمانہ میں دو کروڑ سے زائد نہیں ہوئی بلکہ آخیر شاہان اودھ کے محاصل گھٹتے گھٹتے ایک کروڑ سے بھی کم رہ گئے تھے۔ سعادت خاں برہان الملک کے عہد میں تقریباً سات کروڑ پس انداز ہوئے تھے جو آصف الدولہ کی مشہور فیاضیوں کے کام آئے اس کے بعد سعادت علیخاں نے اپنے عہد میں تقریباً بائیس کروڑ پس انداز کیے جو غازی الدین حیدر اول بادشاہ اودھ سے لے کر نصیر الدین حیدر کے عہد تک صاف ہو گئے تھے کیونکہ جب محمد علیشاہ تخت نشین ہوئے ہیں تو داروغہ خزانہ سے استفسار پر معلوم ہوا کہ خزانہ بالکل خالی ہے صرف تیس لاکھ روپیہ ایک دیوار میں چنے ہوئے تھے جو تقریباً جلوس اور حسین آباد کی تعمیر کے ابتدائی کاموں میں صرف ہوئے۔ لیکن تخت نشینی پر نذروں کی رقم اس قدر غیر معمولی تھی کہ خزانے کا　ایک حصہ فوراً معمور ہو گیا اور سلطنت کے افلاس کا پردہ فاش نہیں ہونے پایا۔ نیز باوجود نقدیات کی قلت کے خزانہ اودھ جواہرات سے ہمیشہ لبریز رہا اور یہ وہی جواہر تھے۔ جو میر قاسم ناظم بنگالہ سے شجاع الدولہ کے ہاتھ آیا تھا اور جسے میر قاسم تین سو پچاس ہاتھیوں پر بار کر کے لائے تھے۔

دربار اودھ کی دولتمندی کے افسانوں کی صداقت کے لیے صرف ایک نظیر کفایت کرتی ہے جو نواب معتمد الدولہ آغا میر سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کے ندیم خاص اور وزیر اعظم تھے بادشاہ کو اپنے آخری ایام سلطنت میں اپنے ولی عہد نصیر الدین حیدر سے اس قدر کبیدگی پیدا ہو گئی کہ انھیں نظر بند کر دیا۔ ولیعہد کو یقین دلایا گیا کہ اس عتاب کے بانی نواب معتمد الدولہ اور راجہ امرت لال شرض بگی ہیں بہرکیف جب نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے تو ان لوگوں سے مواخذہ ایک قدرتی بات تھی آخر کچھ عرصہ کے بعد ان کی معزولی اور ضبطی جائداد کا حکم صادر ہوا۔ راجہ امرت لال کے لیے یہ بھی حکم تھا کہ ہاتھی کے پاؤں میں باندھ کر تشہیر کیے جائیں۔ لیکن راجہ غیرت مند تھے۔ انھوں نے خودکشی کر لی تاہم بادشاہ کا غصہ فرو نہیں ہوا اور ان کی لاش کی تشہیر کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس کی نوبت اس لیے نہیں آئی کہ تمام ہندو امرائے دولت نے اس انسانیت کے گذرے ہوئے حکم کے خلاف خود بادشاہ سے اپیل کی اور کہا کہ "آج ہمارے ایک بھائی کی لاش کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے کل ہم حضور سے کیا توقع رکھیں گے۔ مناسب ہے کہ ہمارے استعفے قبول کیے جائیں اور اجازت دیجائے کہ ہم شہر چھوڑ کر کسی طرف چلے جائیں شاہ نصیر الدین حیدر اپنے حکم کی پابندی کے لیے مشہور اور ان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

معاملات میں بہت سخت تھے۔ تاہم اس خیال سے کہ تمام انتظام سلطنت درہم برہم ہوا جاتا ہے اپنا حکم واپس لینے پر مجبور ہوئے اور راجہ مرحوم کے مکان سے شاہی پہرے اٹھا لیے گئے جائداد کی ضبطی اس سے بیشتر ہی عمل میں آچکی تھی جو سلطنت اودھ میں ایک معمولی بات تھی۔

لیکن نواب آغا میر بہت با اثر آدمی تھے اور ان کی گرفتاری یا اخراج کے لیے بادشاہ کو رزیڈنٹ سے مدد لینے کی ضرورت لاحق آئی تھی۔ بہر حال ان کے لیے اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہو سکا کہ وہ اپنے عہدے سے معزول ہو کر کانپور چلے گئے۔ جس وقت یہ لکھنؤ سے روانہ ہوئے تھے تو ان کے ہمراہ نقد و جنس کے آٹھ سو چھکڑے اور متعدد ہاتھی اور اونٹ تھے جن پر ان کا تمام مال و اسباب لدا ہوا تھا۔ جس قدر نقد جنس اپنے ہمراہ لے گئے تھے اس کا اندازہ ایک انگریزی مورخ نے پچیس کروڑ روپیہ کیا ہے جس سے دربار اودھ کی دولت مندی پر روشنی پڑتی ہے۔ آغا میر نے اپنے زمانۂ عروج میں جس قدر دولت خرچ کر ڈالی اس کا اندازہ ناممکن ہے کیونکہ ان کا دربار شاہی دربار سے شاید ہی کچھ کم ہو۔ شہر میں ان کا محل اس قدر عظیم الشان تھا کہ مشکل سے شاہی عمارت اس کی ہمسری کر سکتی تھی اور اس کے منہدم ہو جانے پر ریلوے اسٹیشن۔ مجسٹریٹی اور میونسپلٹی کی کچہریاں۔ جوبلی ہائی اسکول۔ اور ایک لمبی چوڑی سڑک سب اس کے رقبے میں سما گئے۔ تاہم ہر طرف بڑے بڑے میدان نظر آتے تھے۔ ان کی سرائے بھی ایک نہایت وسیع عمارت تھی جو کسی قدر خراب حالت میں اب تک موجود ہے اور جس میں گھوڑوں کے سوداگر ٹھہرا کرتے ہیں

شاہ نصیر الدین حیدر کا دور سلطنت ان کی طفلانہ حرکات کے لحاظ سے خواہ کیسا ہی تاریک دور کیوں نہ کہا جائے۔ لیکن عام دولت مندی۔ رفاہیت علمی ترقی اور اظہار شان و شوکت کے لحاظ سے وہ ایک مرکزی دور تھا جسے ہم شاہ جہانی عہد سے مثال دے سکتے ہیں اردو زبان کو ترقی اس عہد میں ہوئی وہ ناسخ و آتش۔ خلیق و ضمیر وغیرہ کے کلام سے ظاہر ہے۔ اگرچہ لوگ اب اس مذاق شاعری کو پسند نہیں کرتے جو اس عہد کے بے شمار شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ لیکن شاعری کی علت غائی بدرجہ اتم اس میں موجود ہے۔ اور سوسائٹی کی جیسی بے عیب تصویر اس میں ملتی ہے وہ حال کی شاعری میں کبریت احمر کا حکم رکھتی ہے نیز اس وقت کی شاعری کا ایک معیار قائم تھا جس پر اس کی جانچ ہو سکتی تھی اور آج کل کی شاعری بلا معیار ہے جس کی جانچ کے لیے کوئی قاعدہ نہیں ہے۔ شاعری کی بحث سے قطع نظر کر کے نثر اردو کو بھی اس عہد میں خاص ترقی ہوئی اور مرزا رجب علی بیگ نے "فسانۂ عجائب"، "سرور سلطانی" "گلزار سرور" وغیرہ وغیرہ متعدد تصنیفات سے نثر اردو پر وہ احسان کیا جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ ان تمام بکھیڑوں سے علیحدہ ہو کر جب بادشاہ کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

علمی شوق کی طرف خیال کیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس پس ماندہ زمانے میں ایک شاہی رصدخانہ اس پیمانہ پر قائم ہوا تھا جس کی نظیر تمام ہندوستان میں موجود نہ تھی۔ جس بے نظیر عمارت میں یہ رصد خانہ قائم کیا گیا تھا اوس کا نام "تارے والی کوٹھی تھا جس میں بالفعل بنک آف بنگال قائم ہے۔ اور اس میں انگریزی آلات رصد مہیّا کیے گئے تھے۔ جو نہایت اعلیٰ تھے اور جو ہنگامہ غدر کے بعد یا اس سے پیشتر تلف ہو گئے نیز لیتھو گراف یعنے چھاپہ خانہ بھی اسی عہد میں پہلے پہل قائم ہوا جس کا نام مطبع سلطانی تھا اور ایک اسپتال بھی جو شاہی دارالشفا کے نام سے اب تک موجود ہے ڈاکٹر اسٹیون سن کی نگرانی میں قائم کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک محتاج خانہ بھی جس میں معذور غربا اب تک پرورش پاتے ہیں کان پور سے لکھنؤ تک ایک نہر بھی اسی عہد میں راجہ بختاور سنگھ کے اہتمام سے لائی گئی تھی اور صاحب رزیڈنٹ کے اہتمام میں ایک شاہی اسکول قائم کیا گیا تھا جس میں انگریزی تعلیم دیجاتی تھی۔

دولت مندی اور اظہار شان و شکوہ کی داستان نہایت طولانی ہے تاہم ناظرین کی دلچسپی کے لیے چند حکایتیں درج کی جاتی ہیں جو ایسے مصنفین کے قلم سے نکلی ہیں جن کی نسبت مبالغے کا گمان نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مسز پارک اپنے سفرنامے میں ایک انگریزی خاتون کا چشم دید بیان حسب ذیل درج کرتی ہیں جو ان کی دوست تھیں اور جو شاہ نصیرالدین حیدر کی محل سرا میں اُن کی تاجپوشی واقع ۱۸۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء کی صبح کو بطور مہمان گئی تھیں۔

موجودہ بادشاہ کی بیگموں کے ٹھاٹھ نہایت اعلیٰ درجے کے تھے اور بادی النظر میں وہ الف لیلےٰ کے قصوں کے مخلوق معلوم ہوتی تھیں۔ خصوصًا ایک بیگم جن کا نام "تاج محل" ہے اس قدر خوبصورت ہیں کہ میں انھیں "لالہ رخ" کے سوا اور کچھ نہیں خیال کر سکتی۔ دنیا کی تمام نسلوں میں خواہ وہ گوری ہوں یا سیہ فام حسن و جمال کا ایسا کامل نمونہ میری نظر سے کبھی نہیں گذرا ان کے خط و خال کی دلکشی اور مناسبت میں قدرت نے اپنی کاریگری ختم کر دی ہے۔ ایسی خوبصورت آنکھیں اور پلکیں اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ فی الحال یہی بادشاہ کی منظور نظر ملکہ ہیں اور ان کی شادی کو ابھی ایک ہی دو مہینے گذرے ہیں۔ ان کی عمر سولہ سال کے قریب ہے قد بوٹا سا ہاتھ پاؤں نہایت ہی نازک اور چھوٹے چھوٹے اور نگاہیں بہت ہی شرمیلی۔ ان کی طرحداری اور دلربائی کی یہ انتہا ہے کہ تم انھیں دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاؤ۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہ سُرخ کمخواب کا شہانہ (شادی کا) جوڑا پہنے ہوئے تھیں اور ان کے بالوں میں اول سے آخر تک موتی پروے ہوئے تھے جن کی لمبی لمبی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ ہر لڑی کے آخر میں بڑے بڑے موتی تھے اور یہ لڑیاں پیچدار زلفوں میں اسی طرح مخلوط تھیں جس طرح "چارلس دوم" کے حسینوں کے سنگار کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے سر پر خالص سونے کا ایک حلقہ رکھا ہوا تھا جس میں بہت بڑے بڑے موتی اور زمرد لٹک رہے تھے۔ اس کے اوپر ہما کے پر کی ایک کلغی لگی ہوئی تھی جس میں موتیوں کی لڑیاں آویزاں تھیں اور سر کے بالائی حصے کی طرف اسی طرح پھری ہوئی تھیں جس طرح ہم لوگ اپنے بال سنوارتے ہیں۔ کانوں میں سونے کی بھاری بھاری بجلیاں تھیں جن میں چاروں طرف موتی اور زمرد لگے ہوئے تھے۔ جن کی لمبی لمبی لڑیاں لٹک رہی تھیں اور موتی تدریجاً بڑھتے گئے تھے۔ ناک میں سونے کی نتھ تھی جس میں بہت ہی بڑے اور گول گول موتیوں کی جوڑی اور ایک خوشرنگ یاقوت تھا۔ اسی طرح تمام جسم میں بےشمار زیور تھے جن کی تفصیل کو ایک دفتر درکار ہے۔

ان کا نیم آستین شلوکہ ایک قسم کا چھوٹا کوٹ معلوم ہوتا تھا جس کے نیچے ایک تنگ کرتی تھی۔ اور کلیوں دار پائجامہ اس قدر گھیردار تھا کہ جب وہ چلتی تھیں تو متعدد خواصیں ان کے لمبے لمبے پائنچوں کو سنبھالے رہتی تھیں۔ اسی طرح بہت سی پیش خدمتیں ان کے کوچ کے پیچھے اس غرض سے کھڑی رہتی تھیں کہ چلنے پھرنے میں سر کے ساز (زیورات) کے جو موتی اور جواہرات بےترتیب ہو جائیں یا زربفت کے دوپٹے میں الجھ جائیں ان کو درست کرتی رہیں۔ یہ حور نژاد بیگم دوسری بیگماتِ شاہی کی محسود ہیں جو ان پر رشک کھاتی ہیں اور بادشاہ سلامت اور ان کی سوتیلی والدہ (بادشاہ بیگم) کی آنکھ کا تارہ ہو رہی ہیں جنھوں نے انھیں جدا جدا خطاب دیئے ہیں۔

(قیصر باغ کی سیر جلد اول صفحہ ۸)

نواب تاج محل کا اصلی خطاب "خورشید محل" تھا اور درحقیقت بہت ہی حسین تھیں۔ ان کا وطن حسن پور بندھوا" تھا جو مضافاتِ لکھنؤ میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ محل ہونے پر انھیں چھ لاکھ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی اور شروع شروع انھیں اس قدر عروج حاصل ہوا کہ خاص محل نواب سلطان عہد۔ دختر مرزا سلیمان شکوہ شاہزادہ دہلی اور" نواب ملکہ زمانیہ" بھی گرد ہو گئیں بادشاہ ان پر اس قدر مہربان تھے کہ ایک روز فرطِ محبت سے اپنا تاج ان کے سر پر رکھ دیا اور اسی روز سے یہ "تاج محل" مشہور ہوئیں۔ بہرکیف ان کا عروج بہت عرصہ تک نہیں قائم رہا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور بالآخر یہ کربلائے معلیٰ چلی گئیں جہاں مدت العمر نہایت تزک اور احتشام سے زندگی بسر کرتے رہیں۔ ان کی دولت مندی کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے انتقال پر (جو ۱۸۹۰ء میں ہوا تھا) باوجود بیشمار دولت صرف اور تلف ہو جانے کے جو رقم ان کے ورثا مقیم لکھنؤ کو بطور ترکہ حاصل ہوئی تھی اس کی مقدار پچیس لاکھ سے زائد تھی۔

شاہان اودھ کی تلون مزاجی سے ان کے ازدواج میں کسی کو ایسا مستقل عروج نہیں حاصل ہوا کہ انھیں باقاعدہ "ملکہ" کہا جائے اور جو حقوق سلطنت میں شریک و سہیم رہی ہوں نام کی صدہا ملکہ ہوئیں لیکن آج کسی کو عروج حاصل ہوا کل کسی کو تاہم ان میں بعض بعض نہایت ذی اثر اور مضبوط کیریکٹر کی بیگمیں گذری ہیں۔ چنانچہ "بادشاہ بیگم" جن کا نام اوپر آچکا ہے اس قدر ذی اثر اور صاحب ثروت تھیں کہ بہت موقعوں پر انھوں نے سلطنت کا دلیرانہ مقابلہ کیا اور ہمیشہ اپنے ارادوں میں کامیاب رہیں یہ شاہ زمن غازی الدین حیدر کی زوجہ اور شاہ نصیر الدین حیدر کی سوتیلی والدہ تھیں جنھوں نے شاہ موصوف کو ان کی صغر سنی میں پالا تھا۔ جب غازی الدین حیدر کو اپنے بیٹے اور ولیعہد سلطنت سے کبیدگی پیدا ہوئی اور انھوں نے انھیں عاق کرنا چاہا تو بادشاہ بیگم نے نہایت دلیری سے بادشاہ کو باز رکھا اور ان کی وفات پر اسی دلیری سے اپنے سوتیلے بیٹے کو تخت نشین کر دیا۔ نصیر الدین حیدر اپنی سوتیلی والدہ پر بہت مہربان تھے اور اپنی سلطنت کے ابتدائی دور میں ان کے اشاروں پر چلتے رہے۔ لیکن قدسیہ بیگم کے انتقال پر بادشاہ بیگم سے ان بن ہو گئی اور اس نے اس قدر طول کھینچا کہ بادشاہ بیگم موصوف کی مخالفت میں اپنا سارا زور ختم کر دیا تاہم بادشاہ بیگم کا کچھ نہ بنا سکے۔ انھیں بادشاہ بیگم نے بادشاہ کی وصیت اور انگریزی رزیڈنٹ کے خلاف منشار منا جان کو بھی تخت نشین کر دیا تھا اور اگر انگریزی حکومت کا پاؤں درمیان میں نہ ہوتا تو شاہی فوج بادشاہ بیگم کی ذاتی فوج کا مشکل سے مقابلہ کر سکتی تھی جو اکثر موقعوں پر بیگم کی زنانہ باڈی گارڈ سے ہزیمت اٹھا چکی تھی۔

مسز حسین علی ایک انگریزی خاتون نے اپنی کتاب (مسلمانان ہند) میں بادشاہ بیگم کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ یہ خاتون اس زمانہ میں لکھنؤ میں موجود تھیں۔ ہم اس دلچسپ کتاب سے چند پیراگراف ذیل میں ترجمہ کرتے ہیں جو بادشاہ بیگم کی سواری کے تزک و احتشام سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب وہ ایک مذہبی تقریب پر حضرت عباس کی درگاہ میں تشریف لے گئی تھیں۔

"بادشاہ بیگم کی سواری کے جلوس میں سب سے پہلے مسلح سواروں کا ایک رسالہ تھا جس کے سپاہی پوری وردی پہنے ہوئے تھے اور اپنا نشان اڑاتے جاتے تھے۔ ان کے بعد پیدل فوج کی دو پلٹنیں تھیں جن کے ساتھ جنگی باجہ بجتا جاتا تھا اور جھنڈے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے بعد

ے دیکھیے مضمون ڈھائی گھڑی کی سلطنت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نیزہ برداروں کی ایک پوری جماعت تھی جو صاف و شفاف وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے برچھے خالص چاندی کے تھے۔ ان کے پیچھے جھنڈی بردار تھے جن کی وردیاں اور پگڑیاں بالکل سفید تھیں۔ ان کی جھنڈیاں قرمزی رنگ کی اطلس کی تھیں جن پر زردوزی کے کام میں شاہی مہر کے بنے ہوئے تھے۔ اور جن میں خالص چاندی کی تقریباً تین فیٹ لمبی ڈنڈیاں لگی ہوئی تھیں اس کے بعد باجے والوں کی ایک پوری جماعت تھی جو ڈھول، تاشے، جھانجھ اور نفیری وغیرہ بجاتے جاتے تھے۔ ان کے بعد خاص ڈنکا تھا جس سے بیگم صاحبہ کے مرتبے کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے پیچھے بیگم صاحبہ کا عالیشان سکھپال تھا جس پر وہ سوار تھیں۔ اس کے دونوں پہلوؤں میں آفتابے (سورج مکھیاں) اور چنوریاں تھیں جنھیں بیگم صاحبہ کے نہایت معتبر خواص لیے ہوئے تھے جن کی پوشاک نہایت زرق برق تھی۔

سکھپال کو نہایت قد آور اور مضبوط عورتیں (کہاریاں) اٹھائے ہوئی تھیں اور مسلح زنانہ باڈی گارڈ (ترکنیں) گھیرے ہوئے تھا جس کا فرض تھا کہ سواری کو اسی اہتمام سے درگاہ کے زنانے حصے تک پہونچا دے جہاں مردوں کا گزر نہیں ہے۔ سکھپال کے قریب چوبداروں اور مردھوں کی جماعتیں تھیں جن کی چوبیں اور سونٹے خالص سونے اور چاندی کے تھے۔ اور جو ہر قدم پر بیگم صاحبہ کا خطاب باآواز بلند پکارتے جاتے تھے یہی لوگ فقیروں کے اس نرغے کو بھی روکے تھے جو ان بیگموں کی مشہور فیاضی کی وجہ سے سکھپال کو گھیرے رہتے تھے اور جن کے غول میں بیگم صاحبہ کے خواجہ سرا جو اسی غرض سے سکھپال کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ مٹھیاں بھر بھر کے روپے پھینکتے جاتے ہیں۔

خواجہ سراؤں کا افسر اعلیٰ (نواب ناظر) سکھپال کے پیچھے ایک آراستہ ہاتھی پر سوار تھا جس کا ہودہ سونے سے منڈھا ہوا تھا اور اندر مخمل لگی ہوئی تھی۔ جس پر زردوزی کا بہت بھاری کام تھا۔ نواب ناظر ایک زرتار شملہ پہنے ہوئے تھے گلے میں زربفت کی بھاری چکن تھی اور ایک نہایت قیمتی دوشالہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ان کے بعد بیگم صاحبہ کی نہایت معزز خواصوں اور مصاحب خاتونوں کی فینسیں تھیں جن پر زربفت کے چھٹکے پڑے ہوئے تھے ان میں جو خاتونیں سوار تھیں ان کے مرتبے کی مطابقت سے فینسوں میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھا گیا تھا۔ اور ہر فینس کے ساتھ مسلح سپاہی، برچھے بردار اور چوبدار متعین تھے۔ بعد ازاں بیگم صاحبہ کے خانگی متعدد ہاتھیوں کی قطار تھی جو خوب آراستہ تھے اور جن پر مغرق جھولیں پڑی ہوئی تھیں سب کے آخر میں بیگم صاحبہ کی خادمہ عورتوں کے رتھوں کی ایک لمبی قطار تھی جو شمار میں پچاس تھے ہر رتھ میں چار چھ عورتیں [illegible] بیٹھی ہوئی تھیں اور سب پر نفیس پردے پڑے ہوئے تھے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ان میں بیگم صاحبہ کی پیش خدمتیں۔ باری داریں۔ مغلانیاں۔ ماما ئیں۔ گلوری والیاں۔ قرآن خوانیں۔ چھٹی نویسنیں۔ اور لونڈیاں باندیاں وغیرہ وغیرہ سوار تھیں۔ جن سے حضور عالیہ کی امارت کا اندازہ ہوتا تھا اور یہ بآسانی واضح تھا کہ ہندوستان کی ایک عالی مرتبت خاتون کی شان و شوکت کے لوازم میں کس قدر مختلف درجے کی خادمہ اور عورتیں درکار ہوتی تھیں، یہ جلوس اس تزک اور اہتمام سے تقریباً آدھ گھنٹہ تک خراماں خراماں اس سڑک سے گذرتا رہا جو میرے مکان کے سامنے تھی اس کا انتظام نہایت عمدہ تھا اور اپنی غرابت اور شان و شوکت دونوں کے لحاظ سے بے حد اثر انداز تھا۔"

ایک اور انگریزی خاتون جن کا نام "مسز رابرٹس" تھا اپنی بیش بہا تصنیف سین اور کیریکٹر میں شاہ نصیر الدین حیدر کی سواری کے ایک جلوس کا ذکر حسب ذیل کرتی ہیں جب وہ بتقریب عید کے موقع پر عید گاہ تشریف لے گئے تھے۔

جلوس کے اگلے حصے میں پچاس ہاتھیوں کی ایک طولانی قطار تھی جن پر شاہی نشان اور ماہی مراتب وغیرہ جھنڈے کھلے ہوئے تھے۔ ہر ہاتھی پر ایک فیلبان اور دو بندوقچی تھے جن کی وردیاں اور پگڑیاں سفید تھیں اور سرخ و سبز بانات کے کمر بند باندھے ہوئے تھے۔ ان کے بعد توپخانے کی ایک جماعت تھی جن کے گولہ اندازوں کی وردیاں نیلی تھیں۔ اس کے بعد سواروں کے دو رسالے تھے جن کے سپاہی گلنار اطلس کی نہایت فوق البھڑک وردیاں پہنے ہوئے تھے اور چمڑے کی رنگین ٹوپیاں دیے ہوئے تھے ان کے پیچھے پیدل فوج کی ایک پلٹن تھی جس کے سپاہی نیم برہنہ تھے یا وحشیانہ طریق کا نا تمام لباس پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پائجامے مشکل سے گھٹنوں تک پہونچتے تھے جہاں وہ سیاہ فیتوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے گلے میں لال کرتیاں اور سر پر سیاہ پگڑیاں ان کے ساتھ ایک فوجی نقارہ یا ڈنکا بھی تھا جسے وہ بجاتے جاتے تھے۔ جلوس کا سب سے زیادہ مہتم بالشان وہ حصہ تھا جس میں نجیبوں کی ایک اثر انداز جماعت کے پیچھے بادشاہ اور ان کے درباریوں کی "فیل گاڑیاں" تھیں بادشاہ معظم ایک قسم کی عالیشان نقرئی گاڑی میں تاج مرصع زیب سر کئے ہوئے اورنگ شہی پر جلوہ گر تھے گاڑی کی چھتری اور پردے وغیرہ قرمزی رنگ کی مخمل کے تھے جن پر زردوزی کا نہایت نفیس اور بھاری کام بنا ہوا تھا اور طلائی جھالر لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی میں چار نہایت بلند اور آراستہ ہاتھی جتے ہوئے تھے جو دن سن رنگ روپ اور قد و قامت میں بالکل یکساں تھے دوسری گاڑیوں میں صرف دو ہی ہاتھی جتے ہوئے تھے لیکن سب کی سب سونے اور چاندی سے منڈھی ہوئی تھیں جو عالی مرتبت امرا اور ندیمان شاہی تفاخرانہ انداز سے ان گاڑیوں میں سوار تھے وہ سر سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پاؤں تک جواہرات اور زربفت میں جگمگا رہے تھے ان کے زرتار شملوں میں جواہرات کی کلغیاں لگی ہوئی تھیں۔ اور نہایت بیش قیمت موتی اور جواہر کے طرے۔ بازوبند۔ اور بدھیاں وغیرہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں گھیتلے جوتے تھے جن میں جواہرات لگے ہوئے تھے اور جو زردوزی کپڑے یا قیمتی شال سے بنائے گئے تھے جن کی ساخت نہایت شاندار تھی۔ ان گاڑیوں کے اردگرد چوبداروں۔ خواصوں۔ ہرکاروں اور دوسرے خدام شاہی کے غول تھے جن میں بعض تلواریں چمکا رہے تھے۔ بعض چنوریاں ہلاتے تھے اور بعض باآواز بلند اپنے آقاؤں کے نام وخطاب پکارتے تھے۔ ان کے دونوں پہلوؤں میں بےقاعدہ سواروں کا ایک زبردست ہجوم تھا جو نیزہ بازی اور دوسرے فوجی کرتب دکھلاتے تھے بعد ازاں بادشاہ کے کوتل گھوڑوں کی قطار تھی جو مرصع سازوبراق سے آراستہ تھے اور جن کے سائیسوں کی وردیاں نہایت زرق برق تھیں ان کے پیچھے پیچھے شاہی پالکی اور میانہ تھا۔ یہ دیسی سواریاں نہایت شاندار تھیں۔ اور کلیتہً خالص سونے سے منڈھی ہوئی تھیں۔ جو کہار ان کو اٹھائے ہوئے تھے ان کی کارچوبی وردیاں تھیں اور پگڑیوں میں سونے چاندی کی مچھلیاں اور شاہی مہر کے لگے ہوئے تھے۔ بادشاہ کی کوتل بگھی بھی جلوس کی شان و شوکت میں زبردست حصہ لے رہی تھی جو انگلستان کی بنی ہوئی تھی۔ اس میں مشکی گھوڑے جتے ہوئے تھے اور ایک یورپین کوچبان ہنکار رہا تھا جو گلنار اطلس کی اچکن یا وردی پہنے ہوئے تھا۔ بادشاہ کے انگریز مصاحب جو ان کے فارن اسٹاف میں شامل تھے۔ درباری لباس پہنے ہوئے ہاتھیوں پر سوار تھے اور ان کے پیچھے دیسی امرا اور اعیان دولت کے ہاتھیوں کی ایک طولانی قطار تھی۔ ان سب ہاتھیوں پر گنگاجمنی ہودے رکھے ہوئے تھے اور مغرق جھولیں پڑی ہوئی تھیں سب سے آخر میں ان سواروں اور پیادوں کی پلٹنیں تھیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جھنڈے کھلے ہوئے تھے اور فوجی باجہ بجتا جاتا تھا اسی طرح تمام جلوس میں اطلس اور کمخواب کی ہزاروں سنہری روپہلی جھنڈیاں ہر جگہ ہوا میں لہرا رہی تھیں جن سے اس کی شان دوبالا ہو گئی تھی۔

اس معمولی بے ترتیبی سے قطع نظر کر کے جو ایسے عظیم الشان جلوس کے لیے لازمی ہے تمام جلوس بغیر کسی خاص بے ترتیبی کے جو سپاہیوں کی سخت شوری سے قریب القیاس تھی اسی شان و شوکت سے منزل مقصود تک پہنچ گیا جہاں دیسی نقاروں اور بوق و قرنا کے زبردست شور کا یورپین باجے بھی ناکام مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر بادشاہ کی سواری عیدگاہ کے اندر داخل ہوئی اور مجتہد العصر نے نماز و خطبہ وغیرہ مذہبی رسوم ادا کرنے کے بعد ایک چھرا پیش کیا جسے بادشاہ نے کلمۂ تکبیر کے ساتھ ایک اونٹ کے حلق پر پھیر دیا جو قربانی کے لیے منتخب کیا گیا تھا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

توپخانے کے گولنداز اسی وقت کے منتظر تھے اور انھوں نے اشارہ پاتے ہی توپیں اور بندوقیں داغنا شروع کر دیں جن کی گھن گرج آوازوں سے شہر کے ہر گوشے میں اطلاع ہو گئی کہ بادشاہ سلامت قربانی کی رسم ادا کر چکے۔"

⁂ ⁂ ⁂

مہاتما گاندھی کے خیالات

مطبوعہ زمانہ فروری سنہ ۱۹۴۰ء کے چند پیراگراف:-

مہاتما گاندھی کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے اور وہ موجودہ زمانہ کے بہترین مفکر و سیاست داں خیال کیے جاتے تھے۔ اگرچہ ان کے بعض خیالات سے نیک نیتی کے ساتھ اختلاف کیا جا سکتا ہے، تاہم ان کے اکثر خیالات اخلاقی حیثیت سے ہر مذہب و ملت کے افراد کے لیے یکساں مفید و کارآمد ہیں چنانچہ اسی خیال سے گاندھی جی کے بعض خیالات پیش کیے جاتے ہیں۔

تعلیم و تربیت:- تعلیم کی بنیاد تعمیر سیرت ہے اور طالب علم کے لیے بہترین درسی کتاب اس کا معلم ہے بچے کانوں سے سن کر جتنا سیکھ لیتے ہیں، کتابیں پڑھ کر نہیں سیکھ سکتے۔

معلم کو بچوں کے سامنے اور ان کے پیچھے ہر وقت اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس سے کوئی نامناسب فعل سرزد نہ ہو۔

بزدل معلم اپنے شاگرد کو بہادر نہیں بنا سکتا۔

جو ہندوستانی والدین اپنے بچوں کو بچپن سے انگریزی بولنا اور انگریزی میں سوچنا سکھاتے ہیں، وہ اپنے بچوں اور ملک دونوں کے ساتھ بے وفائی کرتے ہیں کیونکہ اس طرح وہ ان کو قوم کے روحانی و مجلسی ورثہ سے محروم کر دیتے ہیں۔

فرض و خدمت:- آدمی کو جس طرح بھی ہو سکے اپنا کام انجام دینا چاہیے۔ خواہ اس میں اسے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔ اپنا فرض انجام دیتے ہوئے مر جانا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔

جو کام ایک بار شروع کر دیا جائے اس کو کبھی ادھورا نہ چھوڑنا چاہیے سوائے اس صورت کے کہ اس میں کوئی اخلاقی خرابی نظر آئے۔

خدمت اسی وقت کچھ معنی رکھتی ہے جبکہ آدمی کو اس میں کچھ لطف آئے۔ وہ خدمت جس میں آدمی کو خوشی نہ ہو، نہ خادم کے کام آتی ہے نہ مخدوم کے۔ لیکن دلی مسرت کے ساتھ جو خدمت کی جائے اس کے سامنے دنیا کی تمام دولت و راحت ہیچ ہے۔

خدمت کوئی ایسا درخت نہیں ہے کہ ہر زمین پر نشو و نما پا سکے۔ اس کے لیے پہلی شرط خلوص نیت اور

دوسری تجربہ ہے

ابوالفضل راز چاند پوری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ڈھائی گھڑی کی سلطنت

خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی

زمانہ جنوری سنہ ۱۹۱۶ء

جولائی کی، تاریخ سنہ ۱۸۳۷ء آدھی رات کرنیل لو صاحب کو خبر ملی کہ بادشاہ اودھ حضرت نصیر الدین حیدر دفعتہً بیمار ہو کر حالت نزع میں ہیں فوراً ایک ہزار سپاہی مع توپوں کے خزانے کی حفاظت کے لیے بارگاہ شاہی میں بھیج دیئے اور خود محل میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ حضرت نے ایک آہ سرد کھینچی اور رجان بحق ہوئے۔ یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی کہ بادشاہ ایسے سخت مرض میں مبتلا ہیں اس لیے بمشورہ کرنیل لو صاحب کے فصد لی گئی۔ خون نہ نکلا تو معلوم ہوا کہ اعلیٰ حضرت نے سفر آخرت اختیار کیا۔ اس وقت مسٹر لو نے سپاہیوں کو بارگاہ شاہی کے سب دروازوں پر متعین کر کے آمد و رفت کی ممانعت کر دی اور تمام اسباب کو سربند کر کے مہر لگا دی اور فوج انتظام کے لیے طلب کر لی۔ اس کے بعد کرنیل صاحب نے نواب گورنر جنرل بہادر کے حکم کے مطابق ایک دستاویز عہد نامہ جدید کی زبان فارسی میں لکھوا کر جس بادشاہ کو تخت نشینی کے لیے تجویز فرمایا تھا ٹھیک ایک بجے رات کو دستخط کرانے کے لیے بھیجی۔ یہ بادشاہ محمد علی شاہ تھے۔ بادشاہ کو کرنیل صاحب کے آدمیوں کی آمد کی خبر پہلے سے نہ تھی اور یہ لوگ دفعتہً بے وقت در دولت پر حاضر ہوئے اس لیے حصول ملازمت میں قدرے توقف ہوا جب حاضری کے وقت دستاویز کرنیل صاحب کی پیش کی گئی بادشاہ نے برضا و رغبت بغیر کسی اعتراض و اغماض کے مہر ثبت فرمائی اور لکھ دیا کہ تمام شرطیں مجھے منظور ہیں۔ دستاویز دفتر رزیڈنسی یعنی بیلی گارڈ میں پہنچ گئی تو کرنیل صاحب نے چند آدمی بادشاہ کی طلب کے لیے بھیجے مگر بادشاہ نے بسبب کسل طبیعت گھڑی دو گھڑی استراحت فرمائی۔

بادشاہ بیگم اور منا جان بارگاہ سلطانی سے چار میل کے فاصلے پر الماس باغ میں قیام پذیر تھے اور بادشاہ کی عیادت کو آنا چاہتے تھے۔ مگر کرنیل صاحب نے کہلا بھیجا کہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں لیکن سپاہی تین بجے رات کو واپس آ کر خبر لایا کہ بیگم صاحبہ آ رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ زندگی میں بادشاہ کے دیدار سے محروم رکھا تو کیا اب جنازہ بھی نہ دیکھنے پاؤں گی خدا کے لیے مجھے نعش تو دکھا دیں کرنیل صاحب نے فوراً ایک آدمی اور سپاہ طلب کرنے کے لیے بھیجا مگر اسے سپاہ نہ ملی اور خالی واپس آیا۔ راستے میں اس نے بیگم صاحبہ کے آنے کی خبر سنی۔ یہاں آ کر دیکھا کہ کرنیل لو سامان جلوس کی تیاریوں میں مشغول تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور جب لشکر کشمیر کے ہمراہ بادشاہ بیگم کے آنے کی خبر سنی تو متحیر ہوئے اور اسی وقت کپتان پاٹن کے ذریعے سے محافظ سپاہ کو حکم دیا کہ اپنی جگہ پر مضبوطی سے قائم رہیں اور نواب روشن الدولہ کو حکم دیا کہ تمام سپاہ بیگم کے مقابلے میں لے جاؤ کہ اس نے عدول حکمی کر کے بغاوت اختیار کی اور لفٹننٹ شکسپیر کو جلد انگریزی فوج لانے کا حکم بھیجدیا۔

کپتان پاٹن نے بارگاہ سلطانی کے دروازے پر آکر دیکھا کہ دو تین غلام حبشی دروازے تک پہنچ گئے ہیں اور کچھ آدمی اس کے ساتھ ہیں اور ایک جماعت کشمیر آمادہ بہ جنگ ہے اور دروازہ کھولنے کیلئے محافظوں پر سختی کر رہے ہیں۔

کپتان صاحب نے بہت نرمی سے دروازے کے روزن سے ان کو سمجھانا شروع کیا مگر وہ لوگ اسی وقت ایک ہاتھی دروازہ توڑنے کے لیے لے آئے جب اس ہاتھی سے دروازہ نہ گرا تو ایک دوسرے فیلبان نے نہایت چالاکی سے اپنا ہاتھی آگے بڑھا کر ایک پٹ گرادیا اور کپتان صاحب دوسرے پٹ کی آڑ میں چھپ گئے لوگ اندر گھس آئے اور ان کے سرگروہ نے کپتان صاحب کو دروازہ نہ کھولنے پر سخت باتیں سنائیں اور بندوق کا کندہ اس کے منھ پر مارا اور لکڑیوں سے پیٹا کہ وہ زمین پر گر پڑے لیکن باوجود اس سختی کے بھی وہ جواب دیتے رہے اس کے بعد بیگم صاحب کے سپاہیوں نے کپتان پاٹن اور ایک سپاہی مجروح ماکھن کو گرفتار کر لیا اور بیت السلطنت میں زبردستی داخل ہوئے اور بہت فتنہ و فساد برپا ہوا۔ بیگم نے راہ آمد و رفت بند کر دی جو حکم نامہ لیفٹننٹ شکسپیر کے نام لکھا تھا وہ بھی نہ جاسکا اور یہ انتظام چند منٹ میں ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں تمام بارگاہ سپاہ سے بھر گئی اور لوگ اس قدر نشۂ نخوت میں گرفتار ہو گئے کہ لوہے کا دروازہ توڑ کر کرنیل لو اور ان کے ہمراہ شاہی مصاحبوں کو گرفتار کر لیا اور بالا بالا بندوق کے فیر کئے کل آدمی تخمیناً دو ہزار ہونگے۔

اس اثنا میں بیگم صاحبہ نے اپنے ہمراہ مناجان کو لاکر فرح بخش کی بارہ دری میں تخت سلطنت پر بٹھادیا اور آپ تخت کے نیچے بیٹھیں۔ سلامی کی توپیں دغیں اور محفل عیش آراستہ ہوئی ناچ رنگ ہونے لگا۔ مبارکباد کا ہر طرف سے شور و غل برپا ہوا مشعلیں روشن کر دی گئیں اور اس قدر گرفتاریاں عمل میں آئیں کہ بیان سے باہر ہے کرنیل لو نے بھی بادشاہ سے رہائی کی درخواست کی لیکن لوگ کرنیل صاحب کے منھ کے آگے بندوق لے جاتے تھے اور ان کا گلوبند پکڑ کے کھینچتے تھے اور کہتے تھے کہ بطریق آداب شاہی کورنش بجالا کر نذر پیش کرو۔ کرنیل لو نے انکار کیا تو کئی آدمی بہت غصے میں بھرے ہوئے اٹھے لیکن وکیل شاہی جو نہایت حلیم الطبع تھا اس نے بیگم صاحبہ کے حکم سے کرنیل لو اور اسسٹنٹ اور مترجم کو نہایت مشکل سے اور مجمع کثیر سے نکال کر رہا کر دیا اور یہ لوگ بہت مشکل سے باہر آئے ماکھن سپاہی بھی کسی طرح وہاں سے نکل بھاگا اور کرنیل منٹیھ کے پاس آیا۔ انھوں نے اسی وقت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کپتان گولی کو مع سپاہ کے روانہ کیا کہ کپتان پاٹن کو رہا کرائیں کرنیل من تھم اور کرنیل لو ہی منا جان کے تخت کے قریب چند قدم کے فاصلہ پر سپاہ کشیر کی صف باندھے ہوئے کھڑے تھے اور منا جان کے جان نثار بھی کثرت سے آگے تھے اور نہایت بے باکی اور غارت گری سے شہر کو کوٹ رہے تھے ان لوگوں نے بارگاہ شاہی میں داخل ہوتے ہی وزرا اور عزیزان شاہی کو اٹھا دیا اس وقت تک وہ سب لوگ نظر بند اور اسیر تھے اور کرنیل لو بھی بہت خوفزدہ تھے۔ اس کے بعد ایک وکیل کی معرفت رزیڈنٹ اور بیگم صاحبہ میں گفتگو شروع ہوئی۔ کرنیل اس بات پر مصر تھے کہ بہتر یہی ہے کہ بادشاہ بیگم اور شاہ نوجوان سرکاری اطاعت قبول کریں نہیں تو اس کا انجام بہتر نہ ہوگا۔ اور تمام خاص و عام کے سامنے وکیل سے کہا اگر بارگاہ سلطانی میں نوبت یورش آئے گی تو تم کو سولی دی جائے گی۔ اسی گفتگو میں اتنا موقع مل گیا کہ انگریزی فوج معہ توپ آ گئی۔ اس کے بعد کرنیل لو نے پندرہ منٹ کی مہلت اس بات کے منظور کرنے کے لیے بیگم صاحب کو دی یہ مہلت اس واسطے تھی کہ اتنی دیر میں توپیں بھی ان کے پاس پہنچ جائیں۔ میعاد منقضی ہوگئی تو فرح بخش پر گولہ باری کی گئی سات فیرمین لوگ ادھر ادھر ہونے لگے۔ نوجوان بادشاہ اور بادشاہ بیگم اور امام بخش کا زندہ مقید ہو کر کرنیل لو کی حراست میں آئے۔ امام بخش کو سرکار شاہ اودھ نے اپنی حمایت میں لے لیا۔ اس لڑائی میں سرکار انگریزی کے تین سپاہی زخمی ہوئے اور اس طرف چالیس آدمی قتل اور زخمی ہوئے اور باقی بھاگ نکلے۔

اس وقت تک حضرت محمد علی شاہ اور ان کے رفیق کمال خطرے میں تھے اور انکو درشت اور رنج افزا کلام سننا پڑتے تھے اور لوگ برملا کہتے تھے کہ دشمنوں کو قتل کیا جائے گا جس سے بادشاہ بہت متردد تھے لیکن ان لوگوں کو یہ بات قطعی طور پر معلوم نہ تھی کہ کون دعویدار سلطنت ہے اس سبب سے محمد علی شاہ کو کوئی زحمت نہیں پہونچی۔ پہر دن چڑھے کرنیل لو نے نعشوں کو اٹھوا کر اور مجروحین کو بارگاہ سے باہر کر کے بادشاہ کو تسلی اور دلاسا دیکر کوٹھی فرح بخش میں لائے اور سپاہ انگریزی و ہندستانی کے سامنے سریر سلطنت پر بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے بادشاہ کے سر پر تاج رکھا۔ توپوں کی سلامی ہونے لگی اور دو گھنٹے تک جلسہ رہا۔

بعد میں جو تحقیقات ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ بیگم صاحب کے داخل ہونے میں سپاہیوں کی سازش اور کم ہمتی تھی۔ وزیر اعظم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ چوکی اور پہرہ کے سپاہ نے غفلت کی دوپہر کو کرنیل لو نے ایک خط مشتمل بر حالات وفات بادشاہ و تخت نشینی وارث حقیقی کے لکھ کر گورنمنٹ ہند کو روانہ کیا۔ بادشاہ دربار برخاست ہونے کے بعد خلوت میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ بادشاہ بیگم نہایت خطرناک عورت ہے اگر وہ بطور قیدیوں کے رہے گی تو اس کی ذات سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فساد کا اندیشہ ہے اور خلق خدا کو آرام نہ ملے گا لہٰذا اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملک میں رکھنا چاہیے میں تمام مصارف قید خانے کے دونگا۔ بادشاہ بیگم کے ہمراہ دو عورتیں بھی گرفتار ہوئیں اور تینوں عورتیں اور منا جان رزیڈنسی میں قید ہوئے ایک کمپنی ان کی نگہداشت کو مقرر ہوئی اور انکی غذا اور لباس میں بھی کمال احتیاط کی گئی لیکن رزیڈنٹ بہادر نے بارگاہ سلطانی سے معاودت فرما کر دو کمپنیاں چوکی پہرے کے لیے مقرر کر دیں۔

دوسرے دن یہ خبر تمام شہر میں پھیل گئی کہ اب نواب گورنر جنرل بہادر کے جواب کا انتظار ہے یا تو منا جان بادشاہ مقرر ہونگے یا محمد علی شاہ سلطنت کریں گے۔ منا جان اور بادشاہ بیگم کہتی تھیں کہ کرنیل لو سے خوب انتقام لیا جائے گا۔ اس غوغا سے عاجز آکر کرنیل لو نے مخفی طور پر قیدیوں کو کانپور بھیجنے کا سامان کیا۔ لکھنؤ سے کانپور پچپن کوس ہے۔ کرنیل لو نے سراشتمو صاحب کمان افسر کانپور سے تین ترپ سوار قیدیوں کی حفاظت کے لیے منگالیں اور یہ بھی حکم دیدیا کہ لکھنؤ سے کانپور تک وہ کہیں راہ میں قیام نہ کرنے پائیں اور انکو پالکیوں میں سوار کرا کے لیجائیں اور قید میں کسی طرح کا پاس ادب نہ کریں کیونکہ ان کی حراست مقدم ہے کوئی غیر ہندوستانی آدمی سوا ان نوکروں کے جو ان کو کھانا پانی دیتے ہیں نہ جانے پائے اور نہ وہ کسی سے کچھ بات چیت کرنے پائیں اور نہ کوئی خط وغیرہ بھیج سکیں۔ انھوں نے اس بات کی بھی کافی احتیاط کر لی کہ یہ نقل و حرکت بہ صیغۂ راز رہے اور کوئی آدمی اس سے آگاہ نہ ہونے پائے اور سپاہیوں پر بھی یہ راز ظاہر نہ ہو۔ کرنیل لو کو خیال تھا کہ اگر کانپور بھجوانے کا مشورہ لکھنؤ میں ظاہر ہو گیا تو اندیشہ فساد کا ہے اور ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جب یہ قیدی گنگا پار ہو جائیں گے تو سب فساد مٹ جائے گا۔ غرض بارہویں جولائی کو آدھی رات کے وقت قیدی کانپور روانہ کر دیے گئے اور تین کمپنیاں تلنگوں کی نہایت چستی اور چالاکی سے بائیس میل تک پالکی کے ہمراہ رہیں اور ایک آدمی بھی ان میں سے پیچھے نہ رہا۔

اس کے بعد دو ترپ سوار جو اسی وقت کانپور سے آئے تھے نہایت تیز دھوپ میں پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑے اور قیدیوں کے پہنچنے میں ہر قسم کی احتیاط کی گئی۔ اور اس طرح تیرہویں تاریخ کو نو بجے شب کے وقت سب قیدی بخیریت تمام کانپور پہونچ گئے اور ایک مکان میں رکھے گئے۔ کرنیل لو نے لکھا تھا کہ اگر باہر سے حفاظت ہو سکے تو سواروں کو مکان کے اندر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس قدر احتیاط کی گئی کہ دو سپاہی اندر دروازے پر بھی متعین کر دیے گئے کہ کسی ہندوستانی سے یہ لوگ بات نہ کر سکیں۔ کپتان پہرہ کو حکم تھا کہ شب و روز میں ایک مرتبہ قیدیوں کی حاضری ضرور لیا کریں لیکن ان کے آرام میں مخل نہ ہوں لکھنؤ میں تیرہویں جولائی دو پہر کو قیدیوں کے جانے کی خبر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مشہور ہو گئی اور اسی روز فساد کی افواہ سرد ہو گئی۔ دوسرے دن حضرت محمد علی شاہ نے رزیڈنٹ بہادر سے کہا کہ بادشاہ بیگم میری بھاوج ہیں مجھے ہمیشہ منظور خاطر ہے کہ گھر اسباب۔ نوکر۔ کپڑا۔ حسب منزلت اور مرتبت انھیں ملے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال کبھی ملحوظ خاطر رہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ان کے قیام کے لیے بنارس میں یا کسی دوسری جگہ مکان کی ضرورت ہوگی تو اس کا روپیہ بھی میں دوں گا۔ لیکن میرے خیال میں ان کے رہنے کے لیے ایک قلعہ وسیع محروں کا مناسب ہوگا۔

بیسویں تاریخ کو نواب گورنر جنرل بہادر نے فرمایا کہ ان قیدیوں کو ادھر سے دور رکھنا بہتر ہے جس کے لیے انھوں نے بنارس اور چنار گڑھ دو مناسب مقام تجویز فرمائے۔ آخر میں یہی بات قرار پائی کہ قلعہ چنار گڑھ سب سے بہتر ہے اور قیدی کا نپور سے چنار گڑھ کے قلعے میں بھیج دیئے گئے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ غرض منا جان نے ڈھائی گھڑی سلطنت کر کے تمام عمر قید میں بسر کی۔

⁂ ⁂ ⁂

قضا کی گھڑیاں

مطبوعہ زمانہ مارچ ۱۹۲۰ء کا ایک پیراگراف

وہ اندھا تھا، اسے دنیا کی دلچسپ رنگینیوں یا رنگین دلچسپیوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ آسمان پر چمکنے والے چاند اور جگمگانے والے ستاروں کی روشن اور تابناک دنیا کا نظارہ اس کی بے نور آنکھوں نے کبھی نہ کیا تھا وہ لالہ و گل کی دلربا بہاروں اور پہاڑوں سے گرنے والے آبشاروں کی دلفریب روانی سے ناآشنا تھا۔ حسن و عشق کی شوخیوں نے اس کے دامن شباب کو آج تک کبھی جھٹکا نہ دیا تھا۔ اس کے جذبات سینہ میں یوں سو رہے تھے جیسے ایک بے جان چیز ہوتی ہے۔ حسن کی نشتر زنی اور جراحت سامانی سے اس کا دل محفوظ تھا۔ وہ سیاہی اور سفیدی میں بھی تمیز نہ کر سکتا تھا۔ اچھے اور برے کا صرف اتنا احساس اس نے کیا تھا جو اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا برتاؤ کرتا اسے وہ اچھا کہتا اور جو اسے ستاتا یا آزار پہونچاتا وہ اس کی رائے میں برا ہوتا۔ چہرے کے نقش و نگار کی دلکشی اور خد و خال کی موزونیت کے اعتبار سے کسی کو اچھا یا برا کہنا اس کے نزدیک بے معنی سی بات تھی۔

کوثر چاند پوری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کلام ٹیگور کا فلسفہ

رگھوپت سہائے فراق

زمانہ جولائی ۱۹۱۹ء

گیتانجلی کی مدحیہ تنقیدوں کو پڑھ کر ہندوستانیوں کو اہل مغرب میں ایک خاص رجحان کا پتا چلتا ہے۔ اہل مغرب کا مذہبی مزاج اور میلان جو صدیوں کی عیسائی تہذیب و تربیت کا نتیجہ ہے۔ ان کو ایک ایسے خدا کی عبادت و پرستش پر مائل کرتا ہے جو حقیقت میں ان سے جدا ہے۔ اور اس لیے ٹیگور کی وہ نظمیں جن کا نفس مطلب خدا اور انسان کی ہستیوں کا تفرقہ ہے۔ اہل مغرب کے مذاق کو زیادہ مرغوب ہوتی ہیں۔ ہمارے شاعر کے عاشقانہ گیتوں میں اس تفرقہ کا راگ اکثر سنائی دے جاتا ہے۔ لیکن ٹیگور کو عشق یا بھگتی کے خاص کیفیت کا شاعر تصور کرنا ان کی ہمہ گیری اور کمال کی بہت محدود اور یکطرفہ داد دینا ہے۔ ایسی غلط فہمیوں سے بچنے اور ٹیگور کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ٹیگور کی بہت سی خصوصیات میں سے چند خصوصیات جان لی جائیں۔ تب ہم کو ایک ایسی کلید مل جائے گی۔ جس سے ہم کلام ٹیگور کے ان متضاد اور ایک دوسرے سے بظاہر برعکس تخیلات کو بخوبی سمجھ جائیں گے۔

رابندر ناتھ ٹیگور کے تخیل کی وسعت و جولانی محتاج بیان نہیں۔ وہ ہر طرح کے انسانوں اور انسان کے مختلف جذبات کی کیفیتوں کو ایسا اپنا بنا لیتے ہیں۔ اور ان میں شاعرانہ جوش و خروش و یگانگی اس طرح کوٹ کوٹ کے بھر دیتے ہیں گویا وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کا ہمہ گیر تخیل نہایت کامیابی سے اپنے اوپر عورتوں کے خاص جذبات بھی طاری کر لیتا ہے۔ اور خاص خاص موقعوں پر وہ اپنی بجنسہ وہی حالت کر لیتے ہیں جو ایک خاص عورت کی ایسے وقت میں ہو گی۔ عورتوں کی مزاج شناسی اور ان کے جذبات کے اظہار کا ٹیگور کو خاص ملکہ ہے اور اس کا پتہ ان کے ناولوں اور ڈراموں سے صاف صاف چل جاتا ہے جن میں عورتوں کے جذبات کی مصوری کرتے ہیں وہ نسوانی فطرت کے تہہ کو پہونچ گئے ہیں۔

وہ ہم کو طرز معاشرت و طریق زندگی کے وہ مختلف نمونے جو ہندوستان کی کثیر التعداد آبادی میں نظر آتے ہیں۔ اس طرح دکھلاتے ہیں گویا اپنی ہی سرگزشت سنا رہے ہیں۔ ان کا تخیل فطرت انسانی پر اتنا حاوی ہے اور ان کی شاعری اصلیت میں اس قدر ڈوبی ہوتی ہے گویا انھوں نے اپنی شخصیت کے ان لوگوں کی ہستیوں پر قربان کر دی ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

یہ بات ان لوگوں کو جو رابندر ناتھ کے سوانحی حالات سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں ذرا تعجب انگیز معلوم ہوگی۔ رابندر ناتھ کی عمر کا بہت بڑا حصہ ایک نہایت محدود دائرہ میں گذرا ہے۔ وہ عوام الناس سے اس قدر دور رکھے گئے تھے کہ ان کے اعلیٰ درجہ کے مردم شناس ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر ان کی نظر اُس سے کہیں زیادہ وسیع اور ان کی جذبہ شناسی اور ہمدردی اس سے کہیں زیادہ عام اور ہمہ گیر ہے جو اُس علیحدگی کا نتیجہ ہونا چاہیے۔ ان کی تصنیفات پڑھتے وقت وہ تفرقے جو مشرق اور مغرب کے درمیان غارہائے عمیق کی طرح حائل نظر آتے ہیں۔ ہم کو مٹتے ہوئے اور ملتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس خاص رمز یا کسی ایسے اصول کو پا گئے ہیں جو مختلف وحدت اور معرفت کی بلند چٹان پر بیٹھ کر ایسا دلکش نغمہ چھیڑتے ہیں جو نوع انسان کو مسخر کر لیتا ہے کہتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تہذیب ہو اس کی تہ تک پہونچنے کے لیے ان کی ایک نظر کافی ہے۔ اور ہم لوگ جو اپنے شاعر کی ہمہ گیری سے واقف ہیں یقین رکھتے ہیں کہ رابندر ناتھ کی سیاحت یورپ اور امریکہ ضرور کسی نہ کسی شکل میں بار ور ہوگی۔ کیونکہ ان کی نظر عمیق اہل یورپ اور اہل امریکہ کی فطرتوں کی تہوں تک ضرور ڈوب کر نکلی ہوگی اور ان کی آئندہ تصانیف غالباً ضرور اس رنگ میں ڈوبی ہوئی اور مغربی زندگی کے رموز سے مملو اور معمور ہونگی۔ یہ مشکل ہے کہ انکی غائر نگاہ نے کہیں خطا کی ہو یا ان کی لطیف اور باریک بین ذہانت نے کسی چیز کو نظر انداز ہونے دیا ہو۔ ظاہراً وہ کیسے ہی لاپرواہ اور بیگانہ معلوم ہوتے ہوں یہ ممکن نہیں ہے کہ ان کا تخیل ایک لمحہ کے لیے بھی غافل ہو جائے ان کے تمام حواس جسمانی و دماغی ہر وقت بیدار رہتے ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں وہ ساکن اور بے حرکت نظر آتے ہیں۔ جن لوگوں سے وہ ملے یا جن لوگوں کو انھوں نے سرسری نگاہ سے دوران سفر میں دیکھ لیا ان کی سب باتیں اور ان کے مقاصد ان کے دل پر نقش ہوتے گئے۔ اور ان کے حواس ثانیہ کے مستقل اجزا بن گئے۔ ہر ایک شے کا عکس اس معرکۃ الآرا دماغ کے سنسیٹو پلیٹ۔ SENSITIVE PLATE پر فوراً اتر جاتی تھی۔ اور اسی دماغ کے کسی ڈارک چیمبر DARK CHAMBER میں ان عکسوں کا نگیٹو NEGATIVE ڈیولپ DEVELOP ہو رہا ہوگا۔

بالکل متضاد فطرتوں کے رموز شناسی اور بالکل برعکس جذبات کی مصوری رابندر ناتھ کا خاص حصہ ہے۔ اور رابندر ناتھ کی یہ خصوصیت ہم کو مد نظر رکھنی چاہیے جو لوگ کلام ٹیگور کا محض سرسری مطالعہ کر کے ان کے گرویدہ ہو گئے ہیں وہ ان خاص کیفیتوں میں سے محض چند کیفیتوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ جن کو شاعر نے نہایت خوبی کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔ ٹیگور کے یہ شائقین اپنے تخیل کو محض ان چند کیفیات تک محدود کر دیتے ہیں اور اسی کو ٹیگور کی پیروی سمجھتے ہیں۔ مگر جب رمز ٹیگور سے کوئی بخوبی واقف ہو جاتا ہے تو اس کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ شاید ٹیگور کی کوئی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اپنی شخصیت ہے ہی نہیں بلکہ جس عقدہ کا نام ٹیگور ہے وہ جذبات انسانی کا ایک مجسم مجموعہ ہے۔ جس میں کسی ٹیگور کا نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے دل دھڑک رہے ہیں اور جس میں جذبات انسانی اظہار کے لیے بیتاب و پریشان ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس معمہ کو ٹیگور کہتے ہیں وہ کوئی وادی ہے۔ جس میں بیشمار اور لاانتہا انسانی جذبات و کیفیات کی نہریں جاری ہیں۔ کیا عجیب ہے اگر اہل مغرب ٹیگور کی ہمہ رخی اور جامعیت سے گھبرا جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ شعرا فلسفیوں کی طرح منطق میں اپنے کو محدود نہیں کر سکتے۔ ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ اپنے کمال اور تخیل کو منطق پر قربان کر دیں۔ قیود منطق سے کلام ٹیگور بالکل آزاد ہے ٹیگور آزادی کی جیتی جاگتی تصویر ہیں اور ان کے کمال کی ماہیت جاننے کے لیے ان کی آزادی مدنظر رکھنی چاہیئے صداقت اور اصلیت ان کے کلام میں کوٹ کوٹ کے بھری ہے۔ مگر وہ صداقت اور وہ اصلیت جوش حیات سے تڑپ رہی ہے اور محض منطقی اصولوں کی صورت میں یا کسی خاص مذہبی اعتقاد کی شکل میں پیش نہیں کی گئی ہے۔

کلام ٹیگور کو سمجھ کر پڑھنے سے یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ صداقت کی کسوٹی شاید منطق نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ صداقت اور اصلیت منطق سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ کلام ٹیگور کا رجحان حقیقت کی طرف ہے۔ سگ منطق بھونکتا رہتا ہے۔ لیکن ٹیگور کا مضمون اس طرح چلا جاتا ہے کہ جیسے جائے کوئی مست فیل بے زنجیر اور یہ عارفانہ تجاہل ہے جو منطق کا غرور محض اپنی بے رخی سے توڑ کر چور چور کر دیتا ہے۔ ربندر ناتھ کی منطق اپنی ثبوت آپ ہے۔ ان کی دلیلیں وہ جذبات انسانی ہیں جن کا احساس دلائل عقلی سے کہیں گہرا ہوتا ہے۔ ٹیگور کا کمال یہ ہے کہ وہ جذبات کو گویائی عطا کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور کلام ٹیگور محض اس خاموش اسٹیج کی طرح ہے۔ جس پر جذبات خود ایکٹ کرتے ہیں اور کیفیات انسانی بے ساختہ پردوں سے نکل آتے ہیں۔

ٹیگور صرف سین اور ڈراپ سین کی ترتیب دیتے رہتے ہیں اور پردہ اٹھانے اور گرانے میں محض یہ ملحوظ رکھتے ہیں کہ ہر ایک جذبہ اپنا قصہ صاف موثر اور پرجوش الفاظ میں بیان کر کے دوسرے جذبات کی سرگزشت بھی سن لے۔

اکثر شعرا کے برخلاف ربندر ناتھ نے قلم ہاتھ میں لینے کے قبل کسی خاص فلاسفی یا مذہبی اعتقاد کو کوئی راضی نامہ نہیں لکھا۔ اجلاس منطق یا اجلاس فلسفہ یا اجلاس مذہب کے روبرو کوئی حلف نہیں اٹھایا۔ اکثر شعرا بلا کوئی اصول قائم کیے کچھ لکھ ہی نہیں سکتے۔ سکسپیر تک حالانکہ وہ ڈرامہ نویس تھا اپنی شخصیت کی زنجیر نہیں توڑ سکتا تھا اور اپنی ہی اپنے ہیروز اور ہیروئنس کی زبانوں سے کہلاتا تھا۔ مگر ٹیگور کا کلام ڈرامیٹک آرٹ کا اعلیٰ نمونہ ہے اور شاعرانہ بیگانگی کی بہترین

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مثال ہے۔

یہ انتہا درجہ کی بیگانگی اور انتہا درجہ کی ہمدردی ٹیگور کی کامیابی کا راز ہے۔ جس نے ان کے کمال کو چار چاند لگا دیئے ہیں ایک معمولی مثال اس کی یہ ہے کہ مسئلہ تناسخ یا آواگون کو یا بت پرستی کو جن میں عام ہندوؤں کو پورا اعتقاد ہے مگر جو ٹیگور کے ہم مذہب برہمو سماجی نہیں مانتے۔ رابندر ناتھ نے ایسی کئی نظموں میں نہایت ہمدردی سے پیش کیا ہے اور ہندوؤں کے ان جذبات کو نہایت پر تاثیر الفاظ میں قلم بند کیا ہے۔ واقعی رابندر ناتھ جذبات کے شاعر ہیں۔ اور ان کا کلام حیات روزمرہ کے جذبات اور اعلیٰ درجہ کے روحانی اثرات سے مالا مال ہے۔ رابندر ناتھ کو جہاں کہیں صداقت نظر آجاتی ہے وہیں ان کا سر جھک جاتا ہے۔ اسی لیے کبھی وہ دوویت واد یا دوئی کا راگ الاپتے ہیں۔ کبھی وحدت وجود کا نغمہ چھیڑ دیتے ہیں اور کبھی ہمہ اوست کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔

وحدت وجود یا ہمہ اوست یہ وہ ایسی بلندیاں ہیں کہ اولاً تو اہل مغرب ان پر چڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اور اگر کسی طرح دم بھر کو ان چٹانوں کی چوٹیوں پر پہونچ بھی گئے تو نیچے دیکھتے ہوئے ان کے ہوش اڑ جاتے ہیں اور ان کا دل تھرتھرانے لگتا ہے۔ مگر رابندر ناتھ کے رگوں میں ہندو رشیوں کا خون موجزن ہے۔ اور وحدت کی بلندی پر ان کے سر میں چکر نہیں آتا۔ کلام ٹیگور کا فلسفہ جاننے کے لیے رابندر ناتھ کی ہندو نسلیت مدنظر رکھنی چاہیئے۔ ان کی ہندو نسلیت کا اثر ان کے کلام پر ہونا ضروری ہے۔ ہندوؤں کا خاص مذہبی عقیدہ جو کچھ ہو مگر وحدت وجود و ہمہ اوست ایسے اصول ہیں جو صدیوں سے ہندوؤں کے دلوں پر اپنا اثر ڈالتے رہے ہیں۔ اور جو ان کی زندگی اور ان کے جذبات میں سرایت کر گئے ہیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ رابندر ناتھ کی حقانی نظموں میں وحدت اور ہمہ اوست کی آواز سنائی نہ دیجاتی۔

کلام ٹیگور سے کچھ حصہ اقتباس کر کے یہ بات اچھی طرح سے ثابت کی جاسکتی ہے۔ ان انتخابوں میں بالکل متضاد اور برعکس عقیدے و جذبات اور مختلف کیفیتیں قلم بند کی گئی ہیں۔ جو اصول منطق اور فلسفہ کے خلاف ہیں مگر جو بلحاظ شاعری اپنی اپنی جگہ پر درست و زیبا ہیں۔ شاعر کا کام ہے کہ چیزوں کی ہستی میں اپنی ہستی مٹا دے، نہ کہ نیک و بد صحیح و غلط کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ کسی جذبہ کا نمود اس کی صداقت کا خود ثبوت ہے۔ ٹیگور ہم کو ہر طرح کے جذبات سے لذت آشنا کرا کے اس سچی برادرانہ ہمدردی کا سبق سکھلاتے ہیں جو ہند و تہذیب کا مایۂ ناز ہے اور جس سے وہ مذاہب محروم ہیں جنھوں نے بہشت و نجات کا ٹھیکہ کسی خاص عقیدے یا کسی خاص انسان کو دیدیا ہے۔ یہ فخر صرف ہندو مذہب ہی کو حاصل ہے کہ اس کے آغوش میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بت پرستی سے لے کر اہم برہمہ (انا الحق) ایک صلح کل کے عالم میں پل رہے ہیں۔ اور متضاد فلاسفے کھیل رہے ہیں۔ کلام ٹیگور اسی ہندو تہذیب و تربیت کا عکس ہے جس کا کام ہی کثرت میں وحدت کا تماشہ دکھلانا ہے۔ ہندو نقطۂ خیال سے مختلف فلسفے واقعی مختلف نہیں ہیں بلکہ صداقت اور حقیقت کی مختلف تفسیریں ہیں۔ متضاد جذبات و مختلف عقائد ایک ہندو کے دل کو نہ صدمہ پہونچا سکتے ہیں نہ اس کو حیرت انگیز معلوم ہو سکتے ہیں۔ یہی فلسفہ ہے کلام ٹیگور کا اور یہی راز ہے ان کی حیرت انگیز ہمہ گیری اور وسعت کا۔

مئی ۱۹۱۳ء کے نارتھ امریکن ریویو میں ایک لائق خاتون مس سنکلیر گیتانجلی پر تنقید لکھتے ہوئے فرماتی ہیں "صرف چند مقاموں سے تت توم اسی (تم وہی ہو) کے تصوفانہ مقولہ کی صدا سنائی دے جاتی ہے۔ محض۔ کہیں کہیں وہ سُریلے اور پر اثر نغمے بلند ہو جاتے ہیں جو وحدت وجود اور ہمہ اوست کا اعلان کرتے ہوئے ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ تمام ہستیوں کا منزل مقصود وہی ایک ہستی ہے جس میں دنیا کی ہستیاں پنہاں ہو جائیں گی"۔ ربندر ناتھ نے بنگلہ گیتانجلی سے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے قصداً وحدانیت کی نظموں کو انتخاب کر لیا ہے۔ ورنہ وحدانیت کی آواز بہت دور تک بنگلہ گیتانجلی میں گونج رہی ہے۔ آگے چل کر مس سنکلیر نے یہ بھی لکھ دیا ہے "کہ ٹیگور کی عظمت کا اندازہ محض اس قسم کی نظموں سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہیں کہ ان کا کوئی خاص رنگ ہی نہیں۔ اور نہ وہ کسی خاص عقیدے کے پابند ہیں۔ وہ روح کی ہستی کا خدا کی ہستی میں فنا ہو جانا یا اس کا خدا سے الگ ہو کر بحیثیت عابد کے خدا کی پرستش کرنا دونوں رنگوں پر قادر ہیں۔ اور دونوں کیفیتوں کا لطف یکساں اٹھاتے ہیں"۔ چنانچہ گیتانجلی میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

اے میرے مہرِ درخشاں میں موسمِ خزاں کے اس اکا ابر کی طرح ہوں جو بیکار ادھر اُدھر اڑتا پھرتا ہے۔ کرنوں نے تجھے چوم کر ابھی گلا نہیں دیا کہ میں فنا ہو کر تیرے نور میں ملجاؤں اگر تیری مرضی ہے اور اگر تجھے یہی انداز پسند ہے تو میری اس پریشان ہستی موہوم کو لے کر اس میں اپنی کرنوں کی رنگ آمیزی کر دے۔ اسے سنہرے رنگ سے چمکا دے اور آسمان پر مختلف اور پر لطف منظروں میں اسے پھیلا دے۔

اور جب تیری خوشی یہ ہو گی کہ رات کو یہ کرشمہ ختم ہو جائے تو میں شب کی تاریکی میں فنا ہو جاؤں گا۔ اور اگر تو چاہے گا تو صبح کی مندرہ تبسم تازگی میں پھر نمایاں ہو جاؤں گا"۔

یہاں روح کا ذات ایزدی میں فنا ہو کر ہمیشہ کے لیے اپنی ہستی کھو بیٹھنے کا منشا نہیں ہے بلکہ خدا میں پنہاں ہو کر پھر اپنی ہستی کو پا جانا مراد ہے۔ مگر مغربی منطق کی سمجھ میں یہ دونوں باتیں مشکل سے آئیں گی کیونکہ اہلِ مغرب مسئلہ ہمہ خودگی IMMANENCE کہ اس کے حدود و نتائج

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تک لیجانے میں ہچکچاتے اور پہلوتہی کرتے ہیں۔ اور نہ وحدت و کثرت کا ظاہر اختلاف ان کو اتنا پریشان نہ کرتا۔

اس میں شک نہیں کہ اکثر اہل تصوف خدا سے ذاتی تعلق کو زحب ہیں، اپنی ہستی خدا کی ہستی میں مفقود نہ ہو جائے بلکہ قائم رہتی ہوئی وہ مطلق کا نظارہ کرتی رہے) تصوف اور عشق کی جان سمجھتے ہیں مگر کیا یہ کیفیت ہمیشہ طاری رہ سکتی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی کیفیت نہیں ہے۔ عاشق و معشوق کے تفرقہ کا احساس اور جذبہ عشق کا احساس کبھی اکثر مٹ جاتا ہے۔ اور بقول غالب صوفی کی کبھی وہ حالت بھی ہو جاتی ہے کہ۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔

محض فلسفہ سے اپنی اور خدا کی ہستی کی یگانگت کو سمجھ لینا اور محض دلایل سے اس خیال کو تقویت دے لینا اور بات ہے۔ اصل چیز وہ روحانی احساس اور جذبہ ہے جو ہندو تہذیب کی آب و ہوا میں نشو و نما پاتا ہے۔ جب ہم اس سے جدائی کا پُر درد نغمہ گاتے ہیں تو ایک ایک الاپ ہم کو اس سے قریب تر کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ یکتائی کا احساس ہوتے ہوتے، "من تو شدم تو من شدی" کا نعرہ بلند ہو جاتا ہے۔ کلام ٹیگور کو اس روشنی میں اگر دیکھا جائے تو اس میں کسی قسم کا تضاد باہمی نظر نہ آئے گا۔ ہمارے شاعر کے کمال کے عالمگیر ہونے کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس نے طالب و مطلوب کی یگانگت کے مسئلہ کو اس قدر دلفریب و شیریں بنا دیا ہے کہ اہل مغرب کا دل بھی وجد کرنے لگتا ہے۔

گیتانجلی کے مندرجہ ذیل گیت میں اس وصل اور جدائی کے مضامین کو اس خوش اسلوبی سے ایک ہی لڑی میں آویزاں کر دیا ہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ کہتے ہیں۔

" اے میرے خدا میری زندگی کے لبالب ساغر تو کونسی مئے رنگین نوش کرے گا۔ اے میرے شاعر کیا تیرا دل اپنی خلقت کو میری آنکھوں سے دیکھنے کو چاہتا ہے۔ اور کیا میرے کانوں پر بیٹھ کر اپنے نہی پردہ ساز کے نواہائے راز کو سننے کے لیے تو بیتاب ہو رہا ہے۔ میرے دماغ میں جہاں آواز گونج کر الفاظ کی صورت پکڑ لی جاتی ہے اور تیرا نغمۂ حقیقت اپنے سُر اس میں بھرتا جاتا ہے اور ان الفاظ میں تیری جھنکار سنائی دیتی ہے کیا تو اسی کو سن رہا ہے۔ اے میرے خدا کیا تو اپنی ہستی میرے حوالے کر کے اپنے کو میرے آغوش میں دیکھ کر خوشی میں پھولا نہیں سما رہا ہے اور فرط مسرت سے جھوم رہا ہے۔ میرے خدا یہ کیا دلفریب کرشمہ ہے "۔

گیتانجلی کی یہ نظم اپنشدوں کے بعض حصوں پر روشنی ڈال رہی ہے اور صدہا صدیوں کی آواز اس گیت میں سنائی دے رہی ہے۔ اپنشدوں میں ایک جگہ آیا ہے کہ " جب اس نے (خدا نے) چاہا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کہ میں کیوں ہوجاؤں تو اسکے اس خیال سے عالم صور و کثرت نمودار ہوگیا اور اسی کثرت میں پھر اس کی وحدت سرایت کرگئی اور آئینہ خانہ جہاں میں اپنی صورت دیکھ کر اسے خود حیرت ہوگئی۔ ہم تماشا گاہ جہاں میں اس کا جلوہ دیکھنے کے لیے اچھی اچھی دوربینیں ایجاد کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ہمارے دلوں میں اپنا جلوہ دیکھنے کے لیے اور اپنا نغمہ خاموش سننے کے لیے بیتاب ہے۔ کیا زبردست اور بلند پرواز تخیل ہے۔ مگر مہندرناتھ کی شاعری ان بلندیوں پر بے دوڑ تک چڑھ جاتی ہے۔

چونکہ خدا خود ہماری ہستیوں میں موجود ہوکر دنیا کے مزے اٹھانے کے لیے بیتاب ہے اسی وجہ سے ہم سب دنیا کے مزے اٹھانے کے لیے بیتاب ہیں۔ لہٰذا کلام ٹیگور میں کسرِ نفسی و ترکِ دنیا و عزلت پسندی کی ترغیب نہیں دی گئی ہے بلکہ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ "ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا" تو ٹیگور کہتے ہیں کہ ہوس کو ہوس سمجھنا غلط فہمی اور بزدلی ہے۔ کیونکہ ہوس اس روحانی بے چینی کا نام ہے۔ جب ذاتِ مطلق تنہائی سے گھبرا کر کثرت کا تماشا دیکھنا چاہتی ہے۔ فقرا ترکِ دنیا کا وعظ تو ضرور کرتے ہیں مگر تخلیقِ جہاں میں مشیتِ ایزدی کیا تھی "اس کا وہ کیا جواب دیں گے۔ آخر دنیا کی لذتوں کو شیطان نے تو پیدا نہیں کیا۔ دنیا کے مزے اٹھانا عین عبادت ہے بشرطیکہ کوئی رازِ خلقت کو سمجھ جائے۔

داخل ہے قدرِ وقت بھی شکرِ دپاس میں　　　خوش ہو رہے ہیں ابر کو میخوار دیکھ کر

یا بقول سعدی

صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار　　　وقت آن نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

ارتقا کا راز اس تخیل میں پنہاں ہے۔ ترقی کی جان بھی شورش ہے۔ جب شاعر کا دل پوچھتا ہے کہ میری زندگی کے لبالب پیالے سے کونسی شراب ارغوانی تو پئے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا کیا کمال میں اپنی ذات میں بہم پہونچاؤں کہ تیری معبودیت کی داد دے سکوں کس پاکیزگی سے اپنی ذات کو بھردوں کہ تیری پرستش کے قابل ہوجاؤں۔ جلوۂ قدرت کا عالم میں آشکارا ہوکر نشو و نما پانا فلسفۂ ارتقا و فلسفۂ عبادت کا اصلی مقصد ہے۔ بھگوت گیتا کی دسویں منزل میں اور پلیٹو کے ڈاکٹرن آف آئیڈیاز DOCTORINE OF IDEAS میں بھی یہی باتیں بتلائی گئی ہیں اس بارے احساس نے ٹیگور کے تخیل کو منور اور پرزور بنا دیا ہے۔ اور ان کی ایک ایک نظم سورج کی شعاعوں کی طرح دنیا کی چیزوں کو جگمگا دیتی ہے اور زندہ بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ٹیگور اس شورش کو اس روحانی ہیجان کو جو ترقی کی جان ہے سمجھ گئے ہیں۔ بقول استاد میر۔

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر　　　میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

ممکن ہے کلام ٹیگور کے فلسفہ پر یہ رائیں قطعی طور پر درست نہ ہوں۔ ممکن ہے اور بھی کئی اجزا مہندرناتھ کے تخیل میں داخل ہوتے رہے ہوں۔ کوئی چاہے تو اور طرح کے فلسفے بھی کلام ٹیگور سے اخذ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کہہ سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے ہمہ گیر شاعر کو کسی مخصوص اعتقاد یا فلسفہ کا پابند کر دینا مناسب نہیں ہے۔ ٹیگور بھی ایسی تفسیروں کے روبرو چپ چاپ رہتے ہیں۔ وہ اپنے معبود کو بلا کسی فلسفہ میں اس کی ذات کو مقید کیے ہوئے، بخوبی جانتے ہیں۔ ان کا گہرا روحانی احساس کسی فلسفہ کا محتاج نہیں۔ گیتانجلی میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

لوگوں میں میں نے یہ فخر کیا کہ میں تمہیں جانتا ہوں۔ لوگ میرے کلام میں ہر جگہ تمہاری ہی تصویر دیکھتے ہیں اور مجھ سے آکر دریافت کرتے ہیں کہ وہ کیا ہے اور کون ہے میں نہیں جانتا انھیں کیا جواب دوں اور یہ کہہ دیتا ہوں کہ واقعی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ مجھ سے آزردہ اور خفا ہو کر چلے جاتے ہیں اور تم وہیں بیٹھے مسکراتے ہو۔

"میں نے تمہارے افسانے دلفریب الفاظ میں نظم کیے۔ تمہارا رازِ نہاں بے اختیار ہو کر میرے دل سے نکل پڑتا ہے۔ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں نہیں جانتا انھیں کیا جواب دوں اور یہ کہہ دیتا ہوں کون جانے ان اشعار کا کیا مطلب ہے۔ وہ طنز سے ہنس کر میری مذمت کر کے چلے جاتے ہیں اور تم وہیں بیٹھے مسکراتے ہو۔

بنگال کے ادبی دائروں میں اکثر ان کی چند نظموں اور دیگر کلام کے نفس مطلب پر نقادوں اور علما میں بحث ہوتی رہی ہے۔ مگر ٹیگور ہمیشہ خاموش رہے ہیں اور اپنی رائے ظاہر کرنے سے ہمیشہ بچتے رہے ہیں۔ مس سنکلر صاحبہ نے اپنے مضمون مذکور میں ایک بات اور کہی ہے جو قابل توجہ ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

"اپنشد اس روحانی خلش اور تشنگی کو جو محض ذات مطلق کے وصال کے احساس سے مٹ سکتی ہے (ہیگل کی فلاسفی سے بھی بڑھ کر) دور کرتے ہیں اپنشد ہی اس کیفیت کو پیدا کر سکتے ہیں جس میں اپنی ہستی اور خدا کی ہستی میں واقعی وصل ہو جاتا ہے۔ اہل تصوف اس کیفیت کے ہمیشہ سے جویاں رہے ہیں اور جب وہ ٹیگور کو ویدانتی یا بدھسٹ یا کسی مخصوص فلسفہ میں باندھ نہیں سکتے تو ان کو ایک طرح کی مایوسی ہوتی ہے۔ جب ٹیگور یہ کہتے ہیں کہ "ہر زمانہ تجھ سے آنکھ مچولی کھیلتا ہوا گذر جاتا ہے" تو یہ لوگ برا مانتے ہیں یعنی اہل ہند کو اور وحدت وجود کے ماننے والوں کو کوئی حق نہیں کہ وہ کوئی ایسی بات کہیں جس میں خدا اور انسان میں ذاتی تعلق اس طرح سے بتلایا گیا ہو جس سے دونوں کی ذات میں تفرقہ کا اندیشہ ہو"

یہ خیال کہ اہل ہند یا وحدت وجود کے ماننے والوں کو کوئی حق خدا اور انسان میں ذاتی تعلق قائم کرنے کا نہیں ہے ان چالاک اور خود غرض عیسائیوں کی گڈھنت ہے جو ویدانت کی عظمت اور فلاسفی کو ضرر پہنچانے کے لیے عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ آخر اس ذاتی تعلق کا مفہوم کیا ہے۔ کیا ہندوؤں سے بڑھ کر کوئی بھگتی یا ذاتی تعلق کا دلدادہ رہا ہے۔ ہر ایک

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندو میں وہ روحانی احساس ہے جس میں اپنی ہستی اور ہستی مطلق سے خاص تعلق قائم رہتا ہے۔ واضح رہے کہ اہل ہنود میں یکتائی کی ہوس محض فلسفیوں کی علمی اور دماغی حرص نہیں ہے جو محض اپنے خیال کو فلسفۂ وحدت وجود سے بذریعہ چند عقلی دلیلوں کے تقویت دے لیتے ہیں۔ ہندوؤں میں وحدت وجود محض اعتقاد یا عقلی ریاضت کی صورت میں نہیں رہا ہے بلکہ ایک روحانی تجربہ اور کیفیت کی شکل میں قائم رہا ہے۔ ہندوستان میں مذہب فلسفہ کی جان اور فلسفہ مذہب کی عقلی دلیل رہا ہے۔ خشک عقلی مسائل سے ہندوؤں کو ہمیشہ وحشت رہی ہے۔ مذہب ہندوؤں کے لیے چند اعتقاد کا انبار نہیں بلکہ روحانی کیفیت کا مفہوم رہا ہے۔

یہ بات کبھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ ربندر ناتھ کا کلام موجودہ فلسفوں میں سے کسی میں بھی محدود نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ٹیگور کی شاعری کا سرچشمہ عقلی دلائل اور منطق نہیں ہے بلکہ وہ روحانی تجربے ہیں جو کسی خاص اعتقاد یا فلسفہ سے منسوب نہیں کیے جا سکتے۔ مروجہ قواعد کے مطابق کلام ٹیگور اختلاف باہمی اور برعکس جذبات سے پر ہے۔ مگر اہل مذاق جانتے ہیں کہ در حقیقت کلام ٹیگور کے مختلف حصوں میں کوئی تناسب اور سلسلہ ضرور ہے جس کو کسی خاص نام سے منسوب نہیں کر سکتے۔ مثلاً جو لوگ اس بات پر ضد کرتے ہیں کہ ربندر ناتھ خدا کی ہستی کے قائل ہیں انہیں ٹیگور کے مندرجہ ذیل الفاظ پر حیرت ہوگی۔

"جب میں اور یہ دنیا ایک تھے جب میرے جسم پر سبزہ اگا ہوا تھا اور بادِ بہاری جھوم کر مجھ پر سے گذرتی تھی اور جب طلوعِ آفتاب کے وقت ان سبز دلوں سے جو مانند شبنم کے میرے جسم پر اگ رہے تھے۔ ایک ٹھنڈی نکہت نکل کر سورج کی کرنوں کی طرح پھیل جایا کرتی تھی جب میری ہستی چرخ چنبرین کے وسیع اور چمکدار شامیانے کے تلے پہاڑوں اور دریاؤں اور میدانوں پر ایک لاانتہا وسعت کی طرح پھیلی ہوئی تھی اس وقت ایک خاص مسرت اور لطف کا ہلکا ہلکا احساس میرے بے پایاں جسم میں گویا ایک غنودگی کی حالت میں ہوتا تھا، اور ایک خواب گذشتہ کی طرح اس کی یاد مجھے اب تک آتی ہے۔"

ان الفاظ سے دہریت ٹپک رہی ہے۔ مگر ٹیگور کی شاعری وہ جادو ہے جو دہریت کے فلسفہ کو بھی خوشگوار اور پرتاثیر بنا دیتا ہے۔ یہ الفاظ محض شاعرانہ جدت اور مبالغہ نہیں ہیں۔ بلکہ صدق دل سے محسوس کردہ جذبات معلوم ہوتے ہیں۔ یہ جذبات بھی اسی روحانی بے چینی کا نتیجہ ہیں جس سے مایۂ حیات کائنات (خدا) تنہائی سے گھبرا کر آغوشِ گدی میں آ گرا اپنے اوپر مختلف کیفیات طاری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ؎ "میری ہستی نہیں وحدت میں کثرت کا تماشا ہے۔" اسی کثرت میں جذبات دہریہ کے مزے بھی ہیں۔ کہیں کہیں تو شاعر کو خود پتا نہیں ہے کہ چند جذبات اسکے اندر کس طرح پیدا ہو گئے وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں ایک زندہ پیانو (باجا) کی مانند ہوں۔ میرے اندر تاریک پردوں میں بے شمار تار اور پرزے اور کمانیاں ہیں۔ معلوم نہیں کون آ کر مجھے بجانے لگتا ہے۔ میں یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ مختلف نغمے میرے اندر سے کیسے نکلتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ اس وقت کونسی چیز بج رہی ہے اور آیا اسکی آواز پُر درد ہے یا مسرت آمیز ہے یا سُر اونچے ہیں یا نیچے یا نغمہ بے تال ہے یا ٹھیک ہے۔

ربندر ناتھ درحقیقت ایک ہندو ہیں۔ ان کی شاعری ایک پھول ہے جس کی نکہت و رنگ صدیوں کی ہندو تہذیب سے نشو و نما حاصل کر رہی ہے۔ چاہے انہیں اس کی خود کبھی خبر ہو یا نہ ہو۔ ان کو اپنے وطن ہندوستان سے گاڑھی محبت ہے وہ ہندوستان کی پرانی عظمت اور تواریخی کارنامے اور پر فضا مناظر پر دل و جان سے فدا ہیں۔ ہندوستان کی بود و باش اور زندگی کو وہ کہیں اور کی بود و باش اور زندگی سے تبدیل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بول پور میں شانتی نکیتن نام کے مدرسے میں قدیم ہندو طریقہ پر طلبا کی تربیت کر رہے ہیں اور وہیں خود کبھی تنہائی میں روحانی تصور میں غرق رہتے ہیں۔ ان کے والد مہرشی دبندر ناتھ ٹیگور کبھی یہیں تنہائی میں نیچرل منظر کی آغوش میں سرگرم ریاضت رہا کرتے تھے۔ ربندر ناتھ کا معمول ہے کہ ایک چھوٹی سی کشتی میں شام کو بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے دریائے گورائی کے مزے لیا کرتے ہیں۔ آپ اس دل بہلاؤ کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

میں ہر روز اپنے دل میں یہ پوچھتا رہتا ہوں کہ کیا میں اس سرزمین پر اس تاروں سے منور آسمان کے نیچے پیدا ہوں گا۔ کیا میں بنگال کے اسی گوشہ میں پھر پیدا ہو کر دریائے گورائی کے مزے اپنی ننھی سی کشتی میں بیٹھ کر ہر شام کو لے سکوں گا جب ندی کی دھیمی دھیمی چال اور آہستہ خرام ہوا میرے بے تاب دل کو تسکین دیا کریں گی۔ ممکن ہے آیندہ جنم میں مجھے یہ چیزیں نصیب نہ ہوں۔ کون جانے یہ منظر اس وقت کہاں چلے جائیں گے یا میں کس طرح کا دل و دماغ لے کر دنیا میں آؤں گا۔ ممکن ہے مجھے ایسی شامیں کئی نصیب ہوں مگر کون جانے کہ اس وقت میں شام کی سیاہ زلفوں کو اپنے اوپر لہراتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوں گا یا وحشت زدہ ہو کر گھبرا جاؤں گا۔ کیا میں پھر پیدا ہو کر وہی آدمی رہوں گا جو میں اب ہوں۔ جو کچھ ہو مجھے سب سے بڑا ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں یورپ میں نہ پیدا ہو جاؤں۔"

ان الفاظ میں ربندر ناتھ نے اپنا باطن ہماری آنکھوں کے آگے کھول کر رکھ دیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی محبت میں ان کا دل دھڑک رہا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندوستان کا فن تصویر کشی

جگت موہن لال رواںؔ

زمانہ، جولائی ۱۹۱۹ء

مختلف ممالک کے فنون لطیفہ کی تاریخ پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ضروریات استمداد زندگی کے رفع کرنے کے بعد انسان کو منجملہ اور جذبات و نحواہشات کے ایک یہ لطیف نحواہش بھی پیدا ہوئی کہ وہ اپنے گرد و پیش کے جانداروں اور بے جان چیزوں کی شبیہیں بنائے۔ شاعری کی طرح تصویر نگاری بھی انسان کا نہایت ہی قدیم جذبہ ہے۔

ہندوستان میں تصویر کشی کی ابتدا پُران میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ ایک برہمن کا لڑکا عین عالم شباب میں مرگیا تھا۔ اس نے برہما سے منت کی کہ اس کے لڑکے کو دوبارہ زندہ کر دیں۔ برہما نے جم سے کہا جو زندوں کے جسم سے جان نکالنے کے مہتمم ہیں کہ لڑکے کو معاف کیجئے۔ لیکن جم نے برہما کا ارشاد نہ مانا۔ مجبوراً برہما نے اپنے ہاتھ سے اس کی شبیہہ تیار کر کے اس میں روح پھونک دی برہما کو وشو کرمان کا بھی لقب دیا گیا ہے۔ اور وشو کرمان ہندوستان کے فنون لطیفہ کی روح رواں ہیں۔ ہندوستان کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ ہر بڑے خیال کی ابتدا دیوتاؤں سے ہوتی ہے چنانچہ فن تصویر کشی کی ابتدا خلاق عالم سری برہما جی سے بتلائی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے صورت نگاری کی بنیاد پڑی۔ اس کے ثبوت میں ایک دوسری مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ اُشا کا خواب اس قدر مشہور ہے کہ یقیناً جملہ ناظرین اس سے واقف ہوں گے۔ شہزادی اُشا نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت نوجوان اس کے ساتھ باغ میں سرگرم خرام ہے۔ اُشا اس خلقت خیالی سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ اس کو اس حسین نوجوان کو جیتی جاگتی حالت میں دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ کچھ عرصہ تک شہزادی اس خیال کو اپنے دل میں چھپائے رہی لیکن جب جذبات نے بے چینی کی صورت اختیار کی تو اس نے اس راز کو اپنی کنیز چتر لیکھا سے کہا۔ اتفاق امر چتر لیکھا کو تصویر کشی کا بے حد شوق تھا۔ اس نے شہزادی اُشا کی بے قراری رفع کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی کہ وہ تمام دیوتاؤں اور شاہزادوں کی تصویریں کھینچ کر شہزادی کے سامنے یکے بعد دیگرے پیش کرے۔ ممکن ہے اس طرح شہزادی اُشا کو اپنے محبوب کا پتہ مل جائے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

غرض چیتر لیکھا نے اپنی مالکہ کے سامنے تمام شہزادوں کی تصویریں تیار کر کے پیش کیں۔ جب اُشا نے انرودھ کی تصویر دیکھی تو اس کو معلوم ہو گیا کہ جو تصویر خواب میں آئینہ دل پر نقش ہوئی وہ یہی ہے۔ اسی انرودھ سے بالآخر شہزادی اشا کی شادی ہوئی۔

اس قصے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تصویر کشی کی مشق نہایت قدیم زمانہ سے چلی آتی ہے۔ ان حالات کو دیکھئے اور خیال کیجئے کہ چند ہی سال اس طرف اہل یورپ کا خیال تھا کہ فن تصویر کشی ہندوستان میں پرانے زمانے میں تھا ہی نہیں۔

پرانوں میں جو تذکرات ہیں ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ابتداً یہاں دیوار پر تصویر بنانے کی مشق زیادہ کی جاتی تھی۔ والمیکی رامائن میں ایسے کمروں کا تذکرہ ہے جن کے دیواروں پر رنگا رنگ نقش و نگار بنے تھے۔ بال کے مردہ جسم کو جب تیل میں ڈال کر اس کے ورثا دریا کے کنارے لے گئے تھے اس کا تذکرہ والمیک نے اس طرح کیا ہے۔

"اس کے رنگ نہایت خوبصورت تھے۔ پیدل سپاہی ہزاروں اس میں بنے تھے اور پرندوں اور درندوں کی تصاویر کھچی تھیں"۔

ان تذکرات سے گذر کر وہ زمانہ آتا ہے جس کے فن تصویر کشی کے نمونے اب تک موجود ہیں ان میں سے مرزاپور اور رام گڈھ کے غاروں میں جو تصاویر پائی جاتی ہیں ان کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہایت ہی قدیم زمانے کی ہیں۔ وسط ہند میں رام گڈھ کی پہاڑیوں میں جو گمارہ کے غاروں میں ہیں پرانے آثار فن تصویر کشی کے پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی ابتدائی ضروریات وہ تھیں جن سے اس کے امتداد زندگی کی صورت ہوگی۔ وہ جانوروں کا شکار کرنا اس کے لیے ضروری تھا یا جو اس کے ضروریات میں اس کے مدمقابل بن کر دشواریاں پیش کرتے تھے۔ ان کی جانب سب سے پہلے اس کا خیال مبذول ہوا ہوگا۔ چنانچہ مذکورہ بالا مقامات میں زیادہ تر ان جانوروں کی تصویریں ہیں جن کا شکار کرنا اس کے لیے معمولی بات یا اس کی بہترین آرزو تھی۔ ان مقامات کی تصویروں پر ابھی نقادان فن نے کافی غور نہیں کیا ورنہ ان کی قدامت کا پتہ چل جاتا۔ بہرکیف یہ ثابت ہے کہ جس صنف تصاویر کی تاریخیں ماہران تصویر نے معین کر لی ہیں۔ ان سے قدیم تر ہیں تصاویر کی سادگی۔ رنگوں کی پختگی۔ صورتوں کا انتخاب اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ یہ تصویریں نہایت ہی قدیم زمانہ کی ہیں۔ چند ماہران فن ان تصاویر کے قدامت کے اس قدر قایل ہیں کہ ان کا خیال ہے کہ موجودہ تصاویر جو مقامات مذکورہ بالا پر دیکھی جاتی ہیں نقوش ثانی ہیں۔ اور نقوش اول دستبرد زمانہ سے بالکل فرسودہ ہو گئے ہیں اور یہ تصاویر نقوش محکوک کی ترجیع کی ناکامیاب کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ممکن ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کہ آیندہ شائقین فن کی کوششیں اس سے زیادہ بارآور ہوں۔ اور ان تصاویر کی تاریخیں بھی معین ہوجائیں۔

ہندوستان کے فن تصویر کی بابت ہمارے معلومات بودھوں سے پیشتر زمانہ کے متعلق مشکوک ہیں۔ البتہ بودھوں کے زمانہ کے بعد ہماری معلومات صاف اور نسبتاً سلجھی ہوئی ہیں۔

بودھوں کے زمانہ کے پہلے بھی فن تصویر ہندوستان کے فنون عزنی ہیں، تھا اور اس کے اصول و موضوعات طالبان فن کے ذہن نشین تھے۔

تصویر کے چھ ارکان (سارانگ) کا تذکرہ داتسیاین جو تیسری صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ اس کی تصنیف" موسومہ کام سوتر" میں موجود ہے۔ اور خود واتسیاین مُقر ہے کہ میں نے یہ اصول بہت قدیم کتابوں سے اخذ کئے ہیں۔

چھ ارکان یہ ہیں (۱) روپ بھید" یعنی اشیاء زیر نقش کی صورت ظاہری سے واقفیت مثلاً اس کی سطح کی کیفیت۔ اس کی صورت کی ساخت۔ عمارات کی تقطیع میدانوں کا نشیب و فراز وغیرہ۔

(۲) پرمانم۔ یعنی اشیاء زیر نقش کی جسامت و ساخت کی صحیح معلومات ان کی لمبائی چوڑائی۔ نیچائی اونچائی۔ موٹائی کا ساخت و پیمائش کے رو سے صحیح اندازہ۔

(۳) بھاؤ۔ یعنی احساسات و جذبات کا اثر اشکال ظاہری پر مثلاً مغموم انسان کے چہرہ کی حالت یا خوشی سے مسکراتے ہوئے بچے کی شگفتگی۔

(۴) لاونیہ جوجنم۔ یعنی ادابندی۔ مثلاً کسی حسینہ کی گردن کا دوران تقریر اس طرح خم ہوجانا کہ دیکھنے والے لوٹ جائیں۔ یا کسی محو خواب معشوقہ کا اپنا ہاتھ اس انداز سے گال کے نیچے رکھے ہونا کہ دیکھنے والا بے قرار ہوجائے۔

(۵) سدرشیام۔ یعنی واقعات کا ہو بہو نقش اتارنا۔ مثلاً کسی عمارت کا یا انسان کا ایسا صحیح نقش کاغذ پر اتارنا کہ دیکھنے والا معاً سمجھ لے۔

(۶) ورنکا بھنگا۔ یعنی تصویر کشی کے آلات کا صحیح اور صاف استعمال۔ نقش کی صحت۔ رنگوں کی مناسبت وغیرہ وغیرہ۔

ان موضوعات تصویر کشی کے علاوہ قدیم زمانہ کے تصاویر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باشندگان ہند کو مناسب اجزا میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ مثلاً اگر بادشاہ کی تصویر کھینچتے ہیں تو ان کی قد و قامت۔ تراش۔ خراش۔ چال ڈھال سب معمولی انسانوں سے زیادہ دلکش اور وقیع ہے۔ اسی بادشاہ کے ساتھ جو خدام ہیں وہ امراے عموماً اور بادشاہ سے خصوصاً چھوٹے ہیں۔ بادشاہ کے چہرے سے جلال اور احترام نمایاں ہے۔ خدام کے چہروں پر خوشامدانہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پر بنا نی اور فد دیانہ انکسار پایا جاتا ہے۔ کسی زخمی شکار کی تصویر کھینچتے ہیں تو اس کے چہرہ پر یاس اندہ درد کا رنگ چڑھا دیتے ہیں اور شکاری کا چہرہ فرط انبساط سے جو کہ کامیابی کا نتیجہ ہے۔ کھِل جاتا ہے۔ ان تمام حالات سے یہ واضح ہے کہ بودھوں کے زمانے سے پیشتر فنون تصویر کشی ہندوستان میں کافی ترقی کر چکا تھا اور لوگ اس کو مایہ ناز سمجھتے تھے۔ شلپ شاستر اور چترلکشن جیسی کتابوں کی موجودگی اس دعویٰ کے بیّن دلیل ہے۔

اس کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب گوتم بدھ کے قائم کیے ہوئے مذہب کے لوگ تصویر کشی کو مذہب کی جان سمجھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ تصویر کے ذریعہ سے ہم اپنے مذہب اور اپنے ہادی دین کی ایسی یادگاریں قائم کر دیں گے جن کو زمانہ کا بیرحم ہاتھ بھی مشکل سے مٹا سکے گا۔ اس زمانہ کے مذہبی جوش اور واقعات گردوپیش کی امداد نے فن تصویر کشی کو معیار کمال پر پہونچا دیا۔ آج بھی نقاد ان فن اطراف وجوانب سے آتے ہیں اور ان مصوروں کے حسن کمال اور رفعت تخیل پر غور کر کے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ سیلون۔ چین۔ تبت۔ جاپان۔ نیپال۔ جہاں کہیں بودھ مذہب کی روشنی پہونچی تصویر کشی کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔

بودھوں کا زمانہ ۵۰۰ سنہ ق م سے ۸۰۰ء تک سمجھنا چاہئیے۔ فی الحقیقت یہ ہندوستان کا زریں زمانہ تھا اور گوتم بدھ کے مذہب کے اصول اور واقعات فن تصویر کشی کے ترقی کے لیے خاص طور پر موزوں تھے۔

گوتم کا اصلی نام سدارتھ تھا۔ اس کی تلقین مذہب یہ تھی کہ دنیا رنج اور تکلیف کا مقام ہے انسان کی اولین اور بہترین کوشش اس امر کی ہونی چاہئیے کہ اعمال درست کرے تاکہ اس کو نروان یا نجات دوامی حاصل ہو کر تکالیف ہستی سے رستگاری نصیب ہو۔ صحیح نظر۔ صحیح رائے۔ راست گفتاری راست کرداری۔ بے لوث نیکی۔ راست خیالی اور استغراق حقیقت ہی سے انسان صعوبات ہستی سے نجات ابدی حاصل کر سکتا ہے۔

بودھ مذہب کے حامیوں نے تلقین اصول کا بڑا رکن تصویر کو قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا دور دراز مقامات پر سفر کر کے انھوں نے شبیہہ کے ذریعہ سے اپنے پیمبر گوتم کے واقعات زندگی اور نصائح مذہبی کو نہ صرف زبان سے ادا کیا بلکہ سامنے مجسمہ دکھلا دیا جس سے گوتم کا مذہب چار دانگ عالم میں نور آفتاب کی طرح پھیل گیا۔ اور آج صدیوں کے بعد بھی خلقت عالم کا ⅓ حصہ اسی مذہب کا پیرو ہے

اس وقت تک ان تصاویر کے تین خاص مرکز دریافت ہوئے ہیں۔

۱۔ اجنتا کے غار

۲۔ مقام سگیریا واقع سیلون یا لنکا۔

۳۔ ریاست گوالیار میں مقام باغ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پہاڑی چٹانوں کو کاٹ کر ان کے خول کے اندر عمارات پیدا کی جاتی ہیں اور اس خول کو غار کہتے ہیں۔

اجنتا۔ یہ ایک مقام ہے جو حیدرآباد دکن کی ریاست میں مقام فردپور سے چار میل کے فاصلہ پر جانب جنوب و مغرب واقع ہے۔ فردپور جی آئی پی ریلوے اسٹیشن جلگاؤں سے ۳۵ میل کے فاصلہ پر ہے۔

بودھ مذہب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پیروان دین مناظر قدرت اور مشاہدات فطرت کے دلدادہ تھے۔ اجنتا جہاں بودھ مذہب کی بہترین تصاویر ہیں یا ایلورہ جہاں بودھ مذہب کی بہترین سنگتراشی کے نمونے ہیں ایسے مقامات پر واقع ہیں جہاں قدرت کی گلکاریاں رنگا رنگ نظر آتی ہیں۔

بودھ مذہب کے پیروں نے تصاویر سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک اپنے مذہب کے پھیلانے کا کام بکثرت لیا۔ ان کے جھنڈوں پر گرد گوتم کے زندگی کے سبق آموز حالات کی بے شمار تصویریں ہوتی ہیں اور اسی طرح مختلف مفید روایات کا بھی خاکہ تصویروں میں دکھایا جاتا ہے۔

اجنتا میں کل ۲۹ غار ہیں۔ سب سے پہلے ان کا پتہ نقادان مغرب کو سنہ ۱۸۱۹ء میں لگا یہ غار مختلف اوقات میں آراستہ کیے گئے۔ مثلاً غار نمبر ۹ اور ۱۰ سنہ ۱۰۰ء میں بنائے گئے تھے۔ اور غار نمبر ۱۶ و ۱۷ سنہ ۵۰۰ء میں بنائے گئے تھے غار نمبر ۱ و ۲ سنہ ۶۲۵ء سے سنہ ۶۴۰ء میں بنائے گئے تھے۔ ابتداً ان تمام غاروں میں فن تصویر کے بیش بہا اور لاثانی نمونے ہوں گے۔ لیکن سنہ ۱۹۱۰ء میں صرف ۱ و ۲ و ۹ و ۱۰ و ۱۶ و ۱۷ میں تصاویر باقی تھیں۔ باقی تمام غاروں کی تصاویر دستبرد زمانہ سے ملیا میٹ ہو گئیں۔

یہ تصاویر دو حصص میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ اول وہ جو اس زمانہ کے تواریخی واقعات کا جز ہیں۔ دوم وہ جو گوتم بدھ کے مختلف اوتاروں کے حالات کا نقشہ ہیں۔

مصوروں کا ہمہ گیر تخیل۔ اجزا تصویر کی غیر معمولی لمبائی چوڑائی طرز تکمیل کی سادگی اور مختلف تصاویر کے مجموعہ میں باہم۔ ربط اور تصویر مکمل کی اثر اندازی رنگوں کی خوشگوار اور لطیف آمیزش اور افراد تصاویر کی عظمت و شوکت یہ چند باتیں ہیں جن سے اجنتا کی تصاویر مایہ ناز ہیں۔ لیکن ان تمام اوصاف سے بالاتر مصوروں کی مشق خاکہ کشی اور خطاطی ہے خطا پر بودھ مصور کو وہ قدرت حاصل ہے اور اس کے فراز و نشیب سے وہ جو کچھ کر دکھاتا ہے۔ وہ مصوران مغرب باوجود اپنے عظیم الشان اور کثیر التعداد تصاویر کے نہیں کر سکتے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دوسری بڑی خصوصیت جو قابل ذکر ہے ہاتھوں کا انداز ہے۔ محض کلائی۔ ہاتھ کی انگلیوں اور انکی پیچ و خم سے جذبات کا اظہار کرنا بودھ تصاویر کی ایک لاجواب صنعت ہے۔ تصاویر بول نہیں سکتیں لیکن خیالات کا اظہار مختلف حالتوں سے کرتی ہیں اور مصور کی قابل داد کامیابی یہ ہے کہ ناظرین بے زبانوں کی زبان بے کم و کاست سمجھ لے۔

سگریا کی تصاویر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہ تصویریں دو غاروں میں ہیں۔ تصویر بڑی اور نہایت صاف ہیں قریب قریب دو درجن عورتوں کی تصویریں ہیں جن میں جذبات کا اظہار گردن کے خم۔ ہاتھوں اور انگلیوں کی کشش اور جھکاؤ بڑھاؤ سے کیا گیا ہے۔ تصویروں کی دلکشی اور ادا قابل داد ہے۔

ماہران فن کا اندازہ ہے کہ سگریا کی تصویریں اور اجنتا کے بعض غاروں کی تصویریں ایک ہی زمانہ کی ہیں۔ بلکہ بعض بودھوں کا خیال ہے کہ وہ راجہ کاسیاپ کی رانیوں کی ہو بہو تصویریں ہیں۔

جس طرح اجنتا یا سگریا کی تصویروں کے زمانے معین کئے گئے اُس طرح "باغ" کے تصاویر کا زمانہ معین نہیں کیا جا سکا۔ یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس بادشاہ کے وقت کی بنی ہوئی ہیں۔ اور ان کا مقصد اعلیٰ کیا ہے۔ بظاہر وہ تصاویر مذہبی قسم کی نہیں معلوم ہوتیں۔ لیکن بودھ مذہب کا اثر ان پر بیّن طور سے نمایاں ہے۔

اب تک یہ تصویریں بودھ مذہب کی یاد دل میں تازہ کرتی ہیں۔ فاہین۔ اور ہیون سانگ کی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بودھوں کے زمانہ میں ہندوستان میں بہت سے اور تصویر خانے بھی تھے جو اب باقی نہیں ہیں۔ شاید یہ چند یادگاریں بھی غارتگری سے محفوظ نہ رہتیں۔ اگر وہ پامال راستوں سے ہٹ کر واقع نہ ہوتیں۔

بودھوں کے فن تصویر پر تارانا تھ مورخ ایک دوسرے نقطۂ خیال سے روشنی ڈالتا ہے تارانا تھ لکھتا ہے کہ ابتدًا بودھوں کے فن تصویر کشی کے تین خاص اصناف تھے۔

اول۔ دیو۔ یعنی وہ طرز تصویر کشی جو مگدھ دیس میں رائج تھا۔ اور جس کا زمانہ سنہ عیسوی سے ۳۰۰ سے ۶۰۰ سال پہلے تک ہے۔

دوم۔ یاکش۔ یعنی وہ انداز جو شاہ اشوک کے وقت میں رائج تھا۔

سوم۔ ناگا یعنی یکم صدی عیسوی سے تیسری صدی عیسوی تک۔

کسی قدر ضعیف الاعتقادی کے ساتھ تارانا تھ اول الذکر دو اصناف کو مافوق العادت طاقتوں کا نتیجہ بتلاتا ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بدھوں کے زوال کے بعد ایک بہت عرصے تک ہندوستان میں مصوروں کا قحط سا ہو گیا اجنتا کے آخری دور سے تصویروں کے بعد ہم اکبر کے زمانے تک کوئی قابل الذکر تصویر نہیں پاتے سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں البتہ مصوری کا بجھتا ہوا چراغ پھر روشن ہوا ۱۳۹۸ء میں تیمور لنگ کا حملہ ہندوستان پر ہوا۔ تیمور کے بعد خاندان تیموریہ کے زیر سایہ فن تصویر کشی نے معراج کمال حاصل کیا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخری حصہ میں سلطان حسین خراسانی کے دور میں بہزاد نے اس فن کو اس کمال تک پہونچایا جو آج بھی دنیا کے کاملان فن کے رشک کا باعث ہے۔

مغل بادشاہوں کو تصویر سے خاص مذاق تھا۔ آئین اکبری میں ابوالفضل اکثر مصوروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ عبدالصمد شیرازی۔ میر سید علی تبریزی۔ فرخ کلماتی وغیرہ وغیرہ۔ جہانگیر کے زمانہ میں سمرقند کے مصور دربار میں حاضر تھے۔ اس زمانہ میں بھی اہل ہند غیر ہندی صنف مصوری کے تحصیل کمال میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ دربار اکبری کے مصوروں میں بساون۔ وسونت کیشو داس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حتیٰ کہ اکبر نے نظامی کے تصنیفات کو با تصویر بنانے کی خدمت ہندو مصوروں کے سپرد کی تھی۔

چونکہ اس زمانہ کے فن تصویر کی نشو و نما بادشاہوں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اس لیے تصویریں یا تو بادشاہوں کے تفنن طبع کے لیے یا ان کے کارناموں کی یادگار میں کھینچی جاتی تھیں نہ اس زمانہ کی تصویروں کو مذہب سے زیادہ لگاؤ ہے نہ حرم سرا کے واقعات سے زیادہ بحث۔ لہو لعب کی تصاویر پیش کرنا اس دور کے مصوروں کا فخر تھا۔ واقعات درباری کی جیتی جاگتی تصویریں کھینچنے میں مصوروں کا کمال صرف ہوتا تھا اور اس زمانہ کی یادگاریں ایسی ہی تصویریں ہیں۔

ایرانی قلم جس سے دور مغلیہ کی ابتدائی مصوری سے مراد ہے اس کی حسب ذیل خصوصیات ہیں۔

۱۔ یہ کہ مصور زمین تصویر کو بیل بوٹوں اور فطرتی کیفیات سے مزین کرتا ہے۔

۲۔ طلائی جدولوں اور رنگارنگ حاشیوں کا استعمال۔

۳۔ پوشاک اور دیگر آرائشات تصویر میں سونے کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔

۴۔ خاکے نہایت صاف اور روشن ہوتے ہیں۔

۵۔ تصویروں کے دامن میں مصور کا نام ضرور ثبت ہوتا ہے۔

علاوہ اس انداز کے کشمیر قلم۔ پٹنہ قلم۔ اصناف مصوری میں مرجح و ممتاز ہیں۔

تمام شاہان مغلیہ میں سے جہانگیر تصویر کا خاص طور پر دلدادہ تھا۔ اور اسی کے زمانہ میں مصوری اعلیٰ ترین منازل ترقی پر پہونچی۔ شاہجہاں کے وقت میں اس فن کا بدیہی زوال نظر آتا ہے۔ تصویریں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی جگہ اس بادشاہ کے دور میں سنگتراشی اور تعمیرات نے لی ۔ اور اورنگ زیب کے عہد میں اس اکبری اعزاز اور جہانگیری افتخار کو میت نصیب ہوئی ۔ اس کے بعد مغل انداز تصویر کشی یا مفقود ہو گیا یا ایسی حالت میں باقی رہا جس کا ہونا نہ ہونے سے بدتر ہے ۔ کچھ شاہی نظر عنایت کی بے رخی کے باعث پیروان فن کے دل ٹوٹ گئے ۔ کچھ مغرب کی موج ہند آشوب نے جہاں اور مشرقی چیزوں پر پانی پھیر دیا مصوری کو بھی بہا لے گئی

راجپوتوں کے فن تصویر کے عروج کا زمانہ مغلیہ فن مصوری کے زمانہ سے ہم قدم ہے فرق یہ ہے کہ اس کی روح ہندی ہے اور اس کی روح غیر ہندی ۔ راجپوتوں میں بودھوں کی سی مذہبی عقیدتمندی باقی نہ تھی لیکن مذہب سے ان کو مس ضرور تھا ۔ اس انداز مصوری کی خصوصیات میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

۱ ۔ نہ مغلوں کی طرح راجپوتوں کی نقاشی محض صورت نگاری اور حالات دربار و سیر و شکار ہی تک محدود تھی اور نہ بودھوں کی طرح مذہب سے ہٹ کر مشق کرنے سے ان کو انکار تھا ۔ ان کا دائرہ عمل ان دونوں کی ترکیب ہے ۔

۲ ۔ عام دلچسپیوں کی چیزوں کی تصویریں راجپوتوں کو بے حد عزیز تھیں ۔ بازار سڑک ۔ میلے خوشی کی محفل ۔ ماتم کا جماؤ ۔ ایسی تصویروں نے زمین تصویر کشی میں ایک بے بہا اضافہ کر دیا ۔

اس دور کے اصناف تصویر مختلف مقامات کے نام سے موسوم ہیں ۔ مثلاً کانگڑا قلم جے پور قلم ۔ دکنی قلم ۔

بودھوں کے زوال کے بعد ایک بار پھر برہمنوں کا ستارہ چمکا ۔ پھر بت پرستی ترقی پر ہوئی اور صورت پرست ہندوں کو محض تصویروں سے تسکین نہ ہوئی ۔ بلکہ پتھر کی مورتوں کی خواہش ہونے لگی ۔ امتداد زمانہ نے نتیجہ یہ دکھلایا کہ صورت نگاری کو زوال ہوا اور صورت تراشی کو ترقی نصیب ہوئی ۔

راجپوتوں کے زمانہ کے مختلف قلموں کی بنیاد اُن میں جز مذہب کی کمی یا زیادتی پر ہوئی ۔ کہیں کہیں اثر اور مقامی خصوصیات سے بھی نام پڑ گئے ۔

ان مصوروں میں کوئی جدت یا تخیل کی بلند پروازی نہیں پائی جاتی ۔ ہاں خاکہ اور خط کشی میں انکو خاص مشق ہے ۔ غرضکہ دور راجپوتوں میں جہاں روحانیت کا رنگ ہے وہاں روزمرہ واقعات کا بھی فوٹو کھینچا جاتا ہے ۔ سونار ۔ لوہار ۔ جولاہا ۔ گاڑی ہانکنے والا ۔ ہل جوتنے والا کسان ۔ وغیرہ وغیرہ راجپوتوں کی مصورانہ توجہ کے مستحق قرار پائے ۔ دور شاہجہانی اور راجپوتی کے بعد موجودہ زمانہ تک کوئی خاص ترقی اس فن نے نہیں کی کہیں کہیں راجپوت یا مسلمان مصوروں کے چند خاندان باقی تھے ۔ جو کس مپرسی کے عالم میں اپنے اجداد کے پیشہ کے انتخاب اور اپنی ناگفتنی حالت کو رو رہے تھے ۔ میسور یا تنجور میں چند مصور اس فن کی مشق قائم رکھتے تھے لیکن ان کی تصویریں مشرقی اور مغربی اثرات کی ترکیب سے نقادان تصویر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی نگاہوں میں کھٹکتی تھیں۔ ان مصوروں نے ہاتھی دانت پر تصویر بنانا شروع کیا لیکن وہ قابل قدر ترقی نہ کر سکے۔ انجام یہ ہوا ۱۸۶۸ء کے قریب یہ چند خاندان بھی فنا ہو گئے۔

اتفاقات زمانہ کہیے یا قوم کی قسمت سمجھیے جس مغربی اثر نے ہندوستان کے فن تصویر کو تخریب اور تباہی کے عالم میں ڈال رکھا تھا اسی مغربی اثر نے ہندی فن تصویر کے جسم مردہ میں تازہ روح پھونک دی۔ پہلے سے زیادہ پاک اور پہلے سے زیادہ ممتاز۔

کوئی پندرہ سولہ سال ہوئے کلکتہ کے فنون لطیفہ کے پرنسپل اے. بی. ہیول نے اپنے چند ہونہار شاگردوں کو یہ مربیانہ نصیحت کی کہ ہندوستان کے قدیم فن مصوری کی اگر تجدید کی جائے اور گذشتہ زمانہ سے موجودہ وقت تک روحانی اور طبعی ترقی قدیم معلومات کے ساتھ شامل کر دی جائے تو ہندوستان کا فن تصویر پھر قابل قدر ہو جائے۔ جس طرح زرخیز زمین میں ہونہار دانہ کو صرف ذرا سی نمی کا انتظار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہیول صاحب کے شاگرد بھی گویا اس نیک رائے ہی کے منتظر تھے۔ منجملہ اور شاگردوں کے ابانندرو ناتھ ٹیگور بھی تھے جو سر رابندرو ناتھ کے بھتیجے ہیں اور جو اب اپنے استاد ہیول کے بجائے پرنسپل ہیں۔

ابانندرو ناتھ ٹیگور کی کوشش سے بنگال میں ایک طبقہ نوجوان طباع اور جوشیلے بنگالیوں کا ایسا پیدا ہو گیا جس نے مغربی خصوصیات تصویر کو نسبتاً برطرف کر کے ہندوستانی اصول و موضوعات ملحوظ رکھ کر تصاویر کھینچنا شروع کیا۔ ہر زمانہ کے لوگوں کو دور ماضی کی معلومات وراثتاً ملتی ہیں اور ہر دور کے لوگ اس میں اپنے طور پر کچھ کمی بیشی کر کے نسل آیندہ کے لیے بطور ترکہ چھوڑ جاتے ہیں۔

مغرب کی فوٹوگرافی واقعات پیش نظر کا صحیح نقشہ پیش کرتی ہے اور ہندوستان کے اس انداز کے مصور راجہ روی ورمانے کوتاہ نظر پبلک کی آنکھوں کو مدتوں سے خیرہ کر رکھا تھا۔ لیکن دور جدید کی خصوصیت یہ ہے کہ مصور اشیاء افراد زیر نقش کی غلامانہ نقل نہیں کرتے بلکہ تصویر میں اپنے دل۔ اپنے جذبات اپنے احساسات کی روح پھونک دیتے ہیں۔ ان کی کامیاب کوشش یہ ہے کہ نقش کے ساتھ نقاش بھی نظر آئے۔ نقاش کاغذ کے ساتھ ساتھ اسی کی محسوس نقاش ازل کو نقش میں دکھلاتے ہیں۔

مناظر فطرت کی صحت۔ سفیدی سیاہی کا تناسب۔ رنگوں کی شگفتگی اور دلکشی سب کچھ جو اگلے مصوروں میں تھا یہاں موجود ہے۔ اسی فرق سے کہ اگلے زمانہ کے مصور مناظر قدرت پر نظر ڈال کر رہ جاتے تھے اور ٹیگور اسکول کے مصور مناظر فطرت کے مشاہدوں میں فاطر ہستی کا احساس کرتے ہیں اور اسکو اپنے تصویروں میں دکھا دیتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ہر ناظر تصویر اس اثر سے فیضیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہندوستان کے نوجوان مصور کے ہم خیال ہو کر تصویر پر نظر ڈالنے کے عادی نہیں ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دورِ جدید کے مصور بھی اگلے ماہرانِ فن کی طرح اکثر ہندوستان کی قدیم کتابوں سے جنس تصویر کا انتخاب کرتے ہیں۔ لیکن ان کا انتخاب یہیں تک محدود نہیں ہے۔

ایک خاص بات قابل ذکر یہ ہے کہ اس زمانہ کے اہلِ کمال زیادہ تر انسانی زندگی کے روشن حصے کی تصویر کھینچتے ہیں۔ ان کا خیال تاریک رخ کی جانب کم جاتا ہے یہ ماہرانِ فن جذبات خاموشی کے ممتاز مصور ہیں۔

اس دور کے آئندہ ترقی کی بابت صحت کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی البتہ اگر جاپان کے ناقابل قبول اثرات اور نقادانِ مغرب کی گمراہ کرنے والی تعریفوں کے خطرے سے اس زمانہ کے مصور محفوظ رہے اور عوام الناس کے مذاق تصویر شناسی نے بھی ترقی کی تو امید ہے کہ ایک عرصۂ دراز کی کس مپرسی اور زاویہ نشینی کے بعد پھر ہندوستان فن تصویر آسمان کمال پر پہونچے گا اور اس آسمان ترقی پر ابانندرو ناتھ ٹیگور کا نام آفتاب ہو کر چمکے گا۔

⁂

حضرت داغ دہلوی　مطبوعہ زمانہ جولائی ۱۹۰۵ء

کے ابتدائی حصہ میں شاعری کے مفہوم پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"شاعری وہ جادو یا اعجاز ہے جس کا کرشمہ یہ ہے کہ انسان کے خیالات اور احساسات اسکے جذبات دلی کے سانچے میں ڈھل کر زبان سے نکلتے ہیں اور ایک عالم تصویر پیدا کر دیتے ہیں اور چونکہ شاعر کے کانوں کی فضا میں سلاستِ زبان کا نغمہ قدرتی طور پر سمایا ہوا ہوتا ہے لہذا وہ اپنے الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیتا ہے کہ ان میں علاوہ عالمِ تصویر کے ایک تاثیر موسیقی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کلام ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں اس کے خیالات اور احساسات کا عکس نظر آتا ہے جو اس کے جذباتِ دلی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اس کی زبان سے نکلتے ہیں غرضکہ جذبات شاعری کی روح رواں ہیں اور چونکہ دل کو دل سے راہ ہے لہذا جس قسم کے جذبات کے رنگ میں شاعر کا کلام ڈوبا ہوا ہوگا وہ اسی قسم کے جذبات سامع کے دل میں بھی جوش لائے گا گران جذبات وخیالات وغیرہ کی دو قسمیں ہیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ۔ اعلیٰ جذبات وخیالات سے بحیثیت مجموعی فطرت انسانی کا روحانی حصہ مراد لیا جاتا ہے اور ادنیٰ جذبات وخیالات سے حیوانی حصہ۔ جب شاعر کی فطرت میں اعلیٰ جذبات وخیالات ترقی پر ہوتے ہیں وہ پاکیزہ نظری اور بلند خیالی کی ہوا میں اڑتا ہے اور اس کا کلام دوسروں کے دل میں بھی اعلیٰ جذبات کو جوش میں لاتا ہے۔ برعکس اس کے جس شاعر کی فطرت میں ادنیٰ جذبات وخیالات کا دریا موجزن ہوتا ہے اس کے اعلیٰ جذبات وخیالات ریگ تہ نشیں کی طرح پامال رہتے ہیں اور اس کی شاعری سننے والے کے دل میں بھی ادنیٰ جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔"

برج نرائن چکبست

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رفتارِ خیال

نیاز فتحپوری

زمانہ جنوری ۱۹۲۱ء

گرمیوں کی وہ راتیں، جب طلوعِ قمر کے ساتھ ہی ساری کائنات کھِل کھِلا کر ہنس پڑتی ہے، جب پہاڑوں کی چوٹیوں سے چاندنی برف کی طرح پگھل پگھل کر تمام وادی کو رقیق چاندی سے لبریز کر دیتی ہے، جب اس روشن سکون میں نوامیسِ فطرت کے فرشتے اپنی خاموش پرواز سے اڑتے پھرتے ہیں، مجھے کیوں اچھی معلوم ہوتی ہیں؟ ان کی ملیح روشنی کیوں مجھے وارفتہ بنا دیتی ہے؟

میں ایک سنسان ساحل پر بیٹھا ہوا اسی خیال میں مستغرق ہوتا ہوں کہ چاند، کامل چاند، یعنی حسینِ فطرت کا پورا چہرہ "اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا" دور کے افق سے نکل کر اپنی تشنہ کرنوں کی پیاس پھیلے ہوئے سمندر سے بجھاتا ہوا، نمودار ہوتا ہے اور میرا خیال، خیالِ حال کو مغلوب بنا لیتا ہے

ساری دنیا پر پڑا ہوا یہ تاریک پردہ کس نے سمیٹ لیا؟ یہ تمام کائنات پر پھیلی ہوئی سیاہی چشم زدن میں کیونکر دھل گئی؟ خلاءِ عالم میں وہ کونسی وسیع جگہ ہے جہاں یہ بسیط ظلمت پناہ گزیں ہو گئی؟ میں ہر چاندنی رات میں ان مسائل پر غور کرتا ہوں، میں ہر کامیاب روشنی کو دیکھ کر مغلوب و مفتوح تاریکی کی جستجو کیا کرتا ہوں، لیکن اپنی کوشش میں اس سے زیادہ شکوہ نہیں ہوتا کہ دفعتہً آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے، دماغ ایک کرہ کی طرح گردش کرنے لگتا ہے اور میں آنکھ بند کئے اسی پھیلی ہوئی روشنی میں ہزیمت خوردہ تاریکی کو اپنے پپوٹوں کے اندر دعوت دیتا ہوں اور پھر گھبرا کر آنکھ کھول دیتا ہوں۔

آج بھی میں نے یہی کیا۔ اس وقت بھی تھوڑی دیر تک روشن کرنوں پر اپنی نگاہوں کو دوڑا کر میں اسی خیال میں مستغرق ہو گیا۔ یہاں تک کہ سمندر کی لہروں میں جوش، یعنی پانی کے رقیق ساز میں آہنگ خروش پیدا ہونے لگا اور وہ کیفیت جس سے اس وقت تک صرف میری آنکھیں آشنا تھیں، میرے سامعہ تک بھی پہونچی اور میرے لیے سخت دشوار ہو گیا کہ ان دونوں میں سے کس کی لذت پر اپنے حواس کو قربان کر دوں۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں نے ... حسن سے متعلق ہونے والی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دو مختلف کیفیتوں کے امتیاز میں دشواری محسوس کی ہو۔

نور و ضیاء کی یہ فراوانی اور صرف ایک میری نگاہ سازِ فطرت کی یہ نغمہ سامانی! اور صرف ایک میرا سامعہ! قدرت کے یہ انعامات اور اعترافِ کرم میں صرف ایک میرا دھڑکنے والا دل! یہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان و زمین، شجر و حجر، کوہ و ہامون، خزان و بہار، شمس و قمر، بحر و بر اور جو کچھ اس عالم میں نظر آتا ہے۔ شاید میرے ہی لیے عالم وجود میں آیا ہے اور جس وقت میں نہ ہوں گا تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اب میں مابعد الطبیعت کی بھول بھلیاں میں پھنس گیا۔

"جب میں نہ ہوں گا" یعنی میں مر جاؤں گا! یہ خیال بھی کس قدر عجیب و غریب ہے۔ باوجود اس یقین کے کہ ایک دن مجھے دنیا سے رخصت ہونا ہے، یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ واقعی یہ امر وقوع میں بھی آجائے گا۔ اور اگر ایسا ہو بھی جائے تو یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا کا نظام کیونکر میرے نقدان کو برداشت کرے گا۔

میرے مکان کے پاس کل ایک شخص مر گیا ہے، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آج بھی آفتاب اسی طرح طلوع ہوا جس طرح اس کے سامنے ہوا کرتا تھا۔ آج بھی اسی انداز کے ساتھ شام رونما ہوئی جسے وہ دیکھا کرتا تھا۔ یہ تاروں کا چمکنا، یہ دریا کی روانی، یہ شور و ہنگامہ، یہ لطف و تفریح، یہ غروب آفتاب کے بعد دور سے مندروں کا اپنے گھنٹوں کے دلکش آواز کو ہوا میں منتشر کرنا، یہ شام کے وقت چڑیوں کا درختوں پر بیٹھ کر بسیرا لیتے ہوئے، دنیا کو اپنی آخری موسیقی سنانا۔ یہ نسیم سحر کا گلوں کے آغوش میں مچل کر انھیں گد گدا کر ہنسا دینا، یہ پہاڑوں کی پر فضا بلندی، یہ وادیوں کا دلکش عمق یہ دنیا اور دنیا کا سارا انتظام، یہ تمام آبادی اور اس کے جملہ ہنگامہ آرائیاں آج بھی اسی طرح نظر آتی ہیں۔ جس طرح کل مرنے والے کے سامنے۔ اس لیے مجھے سمجھنا چاہیے کہ میرے بعد بھی یہ سب کچھ اسی طرح رہے گا۔ اور جس طرح ایک حباب کے پھوٹ جانے سے فوارہ کی روانی، پانی کا تموج، اور حبابوں کی نمود بند نہیں ہوئی۔ اسی طرح دنیا اپنی کسی ادا کو زمین اپنی کسی گردش کو میرے نہ ہونے سے کبھی نہ بدلے گی۔

آہ فطرت بھی کیسی ظالم چیز ہے

یہ سوچتے ہوتے میرے اندر ایک جذبۂ انتقام پیدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں نفرت و اکراہ کی کیفیت رونما ہوتی ہے، کہ دفعۃً چکور کا جوڑا میرے سر کے اوپر سے گذرتا ہوا ہوا میں روشن ہوا میں، چاندنی کے پھیلے ہوئے سمندر میں بلند ہوتا ہے اور اپنی آواز سناتا ہوا گویا مجھے تنبیہ کرتا ہے کہ اپنی شاہراہ حیات اس کے نشانِ پرواز پر قائم کر دوں۔ میں چند منٹ تک دیکھتا رہتا ہوں اور خواہش کرتا ہوں کہ کاش میں بھی طائر ہوتا اور نہایت آزادی سے جہاں چاہتا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اڑتا پھرتا۔ اس خیال کے زیر اثر میں دنیا کے ایک ایک طائر کا جائزہ لیتا ہوں۔ کبھی گرمی میں ایک گھنے املی کے درخت پر بولنے والی فاختہ پہ مجھے رشک آتا ہے۔ اور کبھی لب جو تیرنے والے سرخاب پر۔ کبھی یہ جی چاہتا ہے کہ کاش میں کبوتر ہوتا۔ اور کبھی یہ خواہش ہوتی ہے کہ قمری بن جاتا۔ کسی وقت کوئی گانے والی چڑیا بننے کا ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ اور کسی وقت کوئی طائر خاموش۔ میں گھنٹوں سوچتا رہتا ہوں کہ یہ طیور و حیوانات بھی کوئی نفس، کوئی قوت شعور رکھتے ہوں گے یا نہیں اور وہ بھی کیا دنیا کو اسی ہیئت و صورت اسی آب و رنگ میں دیکھتے ہوں گے جس طرح میں دیکھ رہا ہوں۔ جس طرح میں سمجھ رہا ہوں۔ میں ہنوز اس خیال کے آخری حد تک نہیں پہنچتا کہ سامنے سے ایک برہمن کی لڑکی۔ تھالی میں چراغ رکھے ہوئے سمندر کی لہروں پر تیرانے کے لیے آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور قریب آکر مجھ سے اپنی نازنین آواز میں پوچھتی ہے کہ "یہاں پانی گہرا تو نہیں ہے" میں یہ سنتا ہوں اور میری روح میرا خیال میرا تمام کارگاہ تصور و قیاس کسی ایسے عمیق سمندر میں ڈوب جاتا ہے، جہاں سے ابھر کر میں اپنی گذشتہ زندگی کو بالکل اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے روشنی کا مینار بیچ سمندر سے دور ساحل کی روشنیوں کو دیکھا کرتا ہے۔

∴ ∴ ∴

میں دولت کی زیادتی کو دولتمندی نہیں کہتا اور دولت کی کمی کو بھی مفلسی نہیں کہتا۔ یہ دراصل ان دونوں کی حالتوں کا نام ہے جس کے دل میں ان قابلیتوں کی کمی ہے جو واقعی زندگی کا سکھ عطا کرتی ہیں۔ میں اس کو مفلسی مانتا ہوں یہ سچ ہے کہ روپے پیسے کی کمی مصیبت کا سامنا ہے۔ پیٹ کا دکھ بڑا دکھ ہوتا ہے لیکن مجھے افلاس کی اصلی صورت وہاں نظر آتی ہے جہاں دل کے سچے جذبات کو ابھرنے اور دنیوی مناظر سے خوش ہونے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ ایشور نے تمھیں دنیا میں پیدا کیا۔ سورج چاند تارے سب کے سب تمھارے غلام ہیں۔ دریا اور پہاڑ کے دامن تمھیں اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھا رہے ہیں۔ ہاتھ پاؤں کان ناک آنکھ جیسے اعضا ہیں۔ دل و دماغ عطا ہوئے ہیں اگر تم ان کے جائز استعمال سے قاصر ہو۔ ممکن ہے بنک میں تمھارے کروڑوں روپے جمع ہوں لیکن اگر تم کو شانتی نصیب نہیں تو تم دولتمند نہیں مفلس ہو تمھاری حالت قابل رحم ہے۔ سچی دولت وہ ہے جو دل کی قابلیتوں کو بڑھاتی جائے علم و عقل کو وسعت دے، رحم محبت، جوش اور ہمدردی تمھارے حصے میں آئیں، انسانیت کا مقصد پورا ہو۔

مہرشی شیوبرت لال ورمن

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ادب الکاتب

نواب حیدر یار جنگ طباطبائی

زمانہ، جنوری ۱۹۲۶ء

زبان کیونکر بنتی ہے اور کون بناتا ہے۔ اس مسئلہ کو تاریخ نہیں حل کر سکتی۔ یہ بات ظاہر ہے کہ زبان کو قوم بناتی ہے۔ شخص نہیں بنا سکتا۔ قوم اسی طرح زبان کو بنا لیتی ہے جس طرح بھڑیں اپنا چھتہ یا چیونٹیاں ریگ تودہ بنا لیتی ہیں۔ جس قوم نے جو زبان بنائی ہے اسی کے افراد اس زبان کے اہل زبان ہیں ان کے ہمسایہ لوگوں نے انھیں سے ان کی زبان کو سیکھا ہے۔ وہ بے شک ان کے مقلد ہیں۔ اس زمانہ کے آزاد خیال تقلید کو ناجائز سمجھتے ہیں اس بات پر غور نہیں فرماتے کہ تقلید اگر امور عقلیہ میں ہو تو آزادی کے خلاف ہو سکتی ہے زبان تو بالکل سمع سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں تقلید سے چارہ نہیں۔ ایک ہندی عمر بھر عربی فارسی انگریزی پڑھتا رہے تو کیا وہ محاورہ عرب و فارس و انگلستان کی تقلید سے آزاد ہو سکتا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا

ہندی اپنی زبان کا مالک ہو گا۔ سیکھی ہوئی زبان اس کی فطری زبان نہیں ہو سکتی مرزا بیدل اہل بہار میں سے ایسا نازک خیال شاعر پیدا ہوا جس کا مثل ایران میں نہیں نکل سکتا۔ مگر ان کی قابلیت فارسی اعتبار سے ساقط سمجھی گئی ہے۔ حالی مرحوم کے یہ الفاظ ہیں کہیں کہیں بیدل کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ بیدل نے فارسی ترکیبیں بنانے میں مالکانہ تصرف کیا ہے جسے ایران کے شعرا نہیں مانتے۔ لیکن بیدل پھر بیدل تھا۔ اس کی تقلید میں اردو کہنے والے بہت ہی بگڑے۔ یہ سمجھے گئے کہ فارسی زبان میں ہم نے عمر صرف کی ہے۔ کیا اب بھی ہم اس میں تقلید کیے جائیں اب جو ہمارے قلم سے نکلے غلط نہیں ہو سکتا۔ بے زبان اردو پر پہلے یہ آفت نازل ہوئی۔ اس کے بعد کالجوں کے تعلیم یافتہ نوجوان نے قلم اٹھایا۔ ان کے پاس مضامین کا ذخیرہ بے انتہا ہے۔ لیکن زبان سے بیگانہ ہیں۔ انہوں نے انگریزی کا تحت اللفظ ترجمہ کر کے اردو کی صورت کو بگاڑ دیا۔ اور نہایت ہی غلط ترکیبیں فارسی و عربی کی بھی اردو میں شامل کیں۔ مثلاً احمد، محمود اور خالد سے اول الذکر نے یہ کیا۔ ثانی الذکر نے یہ اور آخر الذکر نے یہ" دو اشخاص دو امور اور دو کتب" جان توڑ کوشش ان تھک محنت اور ناقابل برداشت مصیبت" اس طرح کا آورد انگریزی زبان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے مخصوص ہے اردو کی نحو میں حرف عطف کا لانا اور ترک کرنا سب کچھ جائز ہے۔

اول الذکر و آخر الذکر بالکل غلط ترکیبیں ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں کہ زید اور عمرو آئے اسے یہ کیا اس نے وہ یا زید نے یہ کام کیا عمرو نے وہ۔ دو اشخاص کی جگہ "دو شخص" کہنے میں آپ کو یہ تردد ہوا کہ شخص تو مفرد ہے۔ مگر اس بات کو بھول گئے کہ اردو میں مذکر کا مفرد و جمع ایک ہی ہے آپ سنتے ہیں دو شخص آئے تو شخص کو مفرد نہیں سمجھتے۔ جان توڑ اور ران تھاپ ہندی دو لفظ ہیں لیکن بنانے کی ترکیب نحو و فارسی سے لی ہے۔ یعنی بنانے والے کو یہ امتیاز نہیں کہ ہم فارسی کی نحو کو ہندی کے الفاظ میں جاری کر رہے ہیں۔ ناقابل برداشت یعنی ناگوارا۔

"مادری زبان" بہت مشہور لفظ ہو گیا ہے۔ جن بزرگ نے انگریزی سے اس کا ترجمہ کیا انھیں یہ خیال نہ آیا کہ "مدر ٹنگ" میں لفظ مدر اور ہی معنی رکھتا ہے جیسے "مدر کنٹری" "مدر چرچ" میں مدر کے معنی ہیں ویسے ہی "مدر ٹنگ" میں بھی ہیں آپ نے مادری زبان کا ترجمہ کر دیا یہ نہ دیکھا کہ اس کے کیا معنی ہوئے۔ آخر باپ دادا کی تمام بزرگوں کی تمام خاندان کی وہی زبان ہے نہ پھر مادری کہنا کیا معنی۔

اوقات بسر ہوئی نہایت صحیح و بے غش اردو ہے۔ اس کے تصرفات جو اس زمانہ کے اہل قلم نے کئے ہیں عجیب و غریب ہیں۔ بسر اوقات۔ اوقات بسری۔ قوت بسری یہ تینوں صورتیں غلط ہیں۔ احمد محمود سے لڑا۔ برسرپیکار ہوا۔ نبرد آزما ہوا۔ اس مضمون کو یہ حضرات اس طرح ادا فرماتے ہیں "احمد نے محمود کے خلاف جنگ کی" ہرگز یہ اردو نہیں ہے۔

اس نے نفی میں جواب دیا" انگریزی میں۔ یہ طرز بیان محاورہ میں ہو تو ہو۔ اردو میں تو ایک طفل مکتب کی شوخی معلوم ہوتی ہے۔ زبان میں نفی و اثبات کہاں اس نے نہ مانا۔ اس نے کہا میں نہیں جانتا۔ بس یہ نفی میں جواب ہوا۔ اگر وہ کہتا میں جانتا ہوں تو اثبات میں جواب ہو جاتا۔

"اس حال پر روشنی پڑی۔ یعنی یہ حال روشن ہو گیا۔ روشنی ڈالی یعنی روشن کر دیا۔

"اس بات کو زور سے کہا" یعنی اس بات پر زور دیا۔

"عملی دلچسپی لی" یعنی سرگرمی یا مستعدی کی۔

"عملی جامہ پہنایا" یعنی عمل میں لایا۔

"ملکی بے چینی" ملک کی بے اطمینانی اہل ملک کی تشویشیں۔

"مالی امداد کی" مال سے امداد کی۔ بمقتضائے محاورہ۔

"جنگ میں حصہ لیا" یعنی شریک ہوا۔

"کافی بدنام ہوا" یعنی بدنام ہونے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔

"حیات و موت کا سوال" جان جوکھوں کا معاملہ۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"دوران ملاقات و دوران گفتگو" یعنی اثنائے گفتگو۔ دوران سر و دوران فلک اور اس کے علاوہ جہاں جہاں لفظ دوران محاورہ میں ہے۔ غلط نہیں ہے۔ مگر دوران ملاقات میں یہ لفظ اپنے محل سے سرکا ہوا ہے۔

"مستقبل تاریک ہے" یہ استعارہ انگلش کے کسی بڑے انشاپرداز کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان کا گریجویٹ طبقہ اسے اپنا مال سمجھتا ہے۔ ترجمہ کے علاوہ بھی اپنی عبارت میں یہ نہ لکھیں گے کہ نجانے اب کیا ہوگا۔ یہی لکھیں گے کہ مستقبل تاریک ہے۔ خیر حرج نہیں ہے۔

"یہ میرا واحد مقصد ہے" یعنی بس یہی تو میرا مقصد ہے۔

"کمانڈر فوج" کمانڈر کا ہند یا مفرس بنا لیا ہے مضائقہ نہیں لیکن زیر کمان کہنا تو ستم ہے

"بیس ہزار سپاہی لاپتہ تھے" یعنی پتہ نہ لگا کہ کیا ہو گئے۔ لاپتہ غلط ہے۔

غرض مجھے جن اہل قلم سے سابقہ پڑا ہے ان کے ترجموں میں یہ رنگ عام ہے دوسری بحث علمی اصطلاحات کی ہے۔ حکمائے یورپ نے لاطینی و یونانی سے علمی اصطلاحات گڑھ لیے۔

ہر ہر فن میں سیکڑوں لفظ ایسے بنائے کہ نہ وہ لاطینی میں اپنے معنی کے اعتبار سے نہ یونانی و انگریزی اور یہ ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ غریب لفظ مخل فصاحت ہوتا ہے غرض اہل ادب نے یہ غرابت دیکھ کر فن بلاغت کی کتابوں میں یہ وصیت کی کہ ان اصطلاحات کا استعمال کرنا اہل ادب کو جائز نہیں۔

یورپ کے اس واقعہ پر جن لوگوں کو تنبہ ہوا انکی یہی رائے ہے کہ علمی اصطلاحات با معنی الفاظ میں ہونے چاہیے مثلاً شریان بصر۔ محور شبکیہ۔ کن بھیری۔ میانہ سیلی۔ مرکزہ (منوکلیس) عدسی مرکزہ۔ دم دار مرکزہ۔ مرکزہ دار جھلی خلیہ۔ (سیل) اہرامی خلیہ۔ مخروطی خلایا۔ مادہ اولی (پروٹوپلازم) وغیرہ۔ لیکن ہماری جماعت کے بعض احباب یہ رائے رکھتے ہیں جیسے بکر بدیں بکری کی ی، اور عبد کا عین گرا کر لفظ بنا لیا اسی طرح اصطلاحات کو بنانا چاہیے۔ مثلاً (پٹیازوا) نخستین حیوان (پروٹوپلازم کی دوسری ارتقائی صورت اور حیوان کی پہلی صورت) اس کی لیے یہ لفظ بنایا گیا۔ نخسیوان۔ گو عربی میں عبدالشمس والوں کو عبشمی عبدالدار والوں کو عبدری کہتے ہیں۔ لاشی سے متلاشی بلاکیف سے بلکیف بنا لیا ہے۔ اور اسی طرح کے عتر بود سے یہ الفاظ بنائے گئے ہیں لیکن قوم نے اسے بنایا ہے شخص نے نہیں بنایا میں نخسیوان کو مہمل ہی کہوں گا۔ مگر غلبہ آرا سے یہاں کام چل رہا ہے اگر ایک شخص نے اختلاف کیا تو کیا۔

منطق تو قدیم فن ہے اور ہم لوگ ہزار برس سے اسے پڑھتے آئے ہیں اور آج تک پرانے ہی اصطلاحات سے کام چل رہا ہے۔ اب منطق میں بھی نئے اصطلاحات گڑھ لیے گئے۔ مثلاً نعیوقر۔ نطاطیس۔ ان الفاظ سے یہ حضرات اردو کو مکمل کرنا چاہتے ہیں اور ڈکشنری کو ضخیم لیکن اس اہم چیز کی پیشین گوئی اس باب میں ضرور پوری ہونے والی ہے کہ یہ سب زحمت ہبار منثور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہونے والی ہے۔ اردو کو اس سے تو ضرر نہیں پہونچے گا۔ ہاں پہلی صورت سے بہت ضرر پہنچ رہا ہے۔ اس وقت مجھے جتنی مثالیں یاد آئیں لکھ دی ہیں مجھے امید ہے کہ کوئی اردو کا ہوا خواہ ایسا اٹھ کھڑا ہوگا کہ اس کام کو تمام کردے گا۔

⁂

مہرشی شیوبرت لال صاحب ورمن زمانہ جون ۱۹۳۹ء کے چند پیراگراف:۔

فخر قوم مہرشی شیوبرت لال صاحب ورمن ایم۔ اے کی ذات بابرکات سے ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ بخوبی واقف ہے۔ ہندوستان میں عموماً اور پنجاب اور یو۔ پی میں خصوصاً شاید ہی کوئی ایسا ضلع ہو جہاں آپ کے لٹریچر کے شائقین موجود نہ ہوں۔

آپ قوم کے کائستھ تھے۔ آپ کا وطن مالوف موضع پورہ قانون گویاں ہے جو راج بنارس ایس کونڑہ ڈ اسٹیشن سے ڈھائی میل کے فاصلے پر جانب مغرب واقع ہے۔ شروع شروع میں آپ چنار اور بریلی آریہ سماج اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ منشی بلدیو پرشاد صاحب بریلوی اور پنڈت کامتا پرشاد صاحب ترویدی (پنڈت رگھوناتھ پرشاد صاحب ترویدی سابق سول جج گورکھپور کے والد بزرگوار) آپ کے ہمعصر تھے۔ آپ نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے اس زمانہ میں کام کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ کا مزاج آزادی پسند تھا۔ اور قدرت نے آپ کو کسی خاص کام کے لیے مخصوص کیا تھا چنانچہ ملازمت میں رہتے ہوئے بھی آپ نے "دبدبۂ قیصری" نامی اخبار بریلی سے نکالا جو تھوڑے ہی دنوں تک مقبول خاص و عام رہا۔ زمانہ کا اجرا بھی جو اب مکرمی منشی دیا نرائن نگم کی زیر ایڈیٹری نکل رہا ہے آپ ہی کا رہین منت ہے۔ فروری لغایت اکتوبر ۱۹۰۳ء یہ آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں آپ نے اُسے منشی صاحب کے سپرد کر دیا۔

اس کے بعد جب "آریہ گزٹ" لاہور کی ایڈیٹری کے لیے ایک قابل شخص کی ضرورت محسوس ہوئی تو سماج کے برگزیدہ اصحاب کی نگاہیں آپ ہی پر پڑیں۔ چنانچہ آپ نے جس خوبی و کامیابی کے ساتھ "آریہ گزٹ" کی ایڈیٹری کے فرائض انجام دئے وہ محتاج بیان نہیں۔ شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے مرحوم، فدائے قوم مہاتما ہنس راج جی شہید وطن سوامی شردھانند جی آپ کے سچے مداح اور قدردان تھے۔ (موتی لال مختار۔ ایڈیٹر ستسنگیت گورکھپور)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اسلاف ہند کے تمدنی کارنامے

ٹھاکر جے۔ آر۔ رائے

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

اسلاف ہند قدیم اور ان کے موجودات جانشینوں میں بعد المشرقین ہے۔ مدت ہوگئی ہمارے بلند ہمت اولوالعزم بزرگوں کے اوصاف حمیدہ ہم سے رخصت ہوگئے بلکہ ان کے برعکس زمانہ حال کے ہندوؤں میں ایسی مذموم عادتیں اور ادنیٰ خصلتیں پیدا ہوگئی ہیں جو ان کے واجب الاحترام اسلاف کے سوکوس کبھی قریب نہ کھٹکی تھیں۔ یہ بے مثل امتیاز اسلاف ہند ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے ملک گیری کے مقبول عام دستورالعمل سے دانستہ انحراف کرکے اپنے ہمجنسوں کی لوٹ مار روا نہ رکھی۔ بلکہ ان کی تمدنی ترقی کے خیال ہی کو مد نظر رکھا۔ اور دنیا میں اپنی اولوالعزمیوں کے غیر فانی نشانات چھوڑ گئے۔ جو زمانہ کی دستبرد سے اب تک نیست و نابود نہیں ہو سکے۔

زمانہ قدیم کے بلند نظر ہندوؤں نے بلاشبہہ غیر ملکوں پر پرامن چڑھائیاں کیں مگر دوسروں کے زر و مال سے مستفید ہونے کے مقصد سے نہیں۔ انسانی خون سے زمین رنگنے کے ارادہ سے نہیں بلکہ بنی نوع انسان کے اخلاقی اور تمدنی حالت درست کرنے کے خیال سے انھوں نے ترک وطن کیا اور تمدن سے ناآشنا قوموں کے درمیان بستیاں بنائیں جو ترقی کرتے کرتے شاندار سلطنتیں بن گئیں انھوں نے متعدد ممالک میں اپنا دھرم رائج کیا۔ لوگوں کو اپنے علوم و فنون سکھائے اور رفتہ رفتہ مختلف ممالک کے باشندوں کو لوازم تہذیب سے کماحقہ روشناس کرا دیا۔

اشاعت تمدن اور اقتصادی ترقی اسلاف ہند کا دستورالعمل اور ان کی معاشرتی حکمت عمل کا اولین اصول تھا۔ جس کی بدولت ہند تمام دنیا کا محور ہوگیا تھا۔ یہ محض دعوے اور میرا قیاس ہی نہیں ہے بلکہ تاریخ عالم کا ایک زبردست واقعہ ہے۔ جس سے کوئی صاحب فہم (جسے تاریخی واقعات کی تحقیقات سے سطحی دلچسپی ہو) کسی طرح انکار نہیں کرسکتا ہے۔ سنہ عیسوی کے آغاز سے تھوڑا عرصہ پہلے یا پیچھے بلند ہمت ہندو اپنے ملک سے روانہ ہو کر ساحل جاوا پر وارد ہوئے۔ اسی طرح اولوالعزم آبادکاروں کا ایک [illegible] مشرق میں ہند چینی کی طرف بڑھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور کمبوڈیہ میں ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی۔ اور ایک دستہ اسی زمانہ میں وسطی ایشیا کی طرف گیا۔ جس کے قدیم کے نشانات ابھی تک صحرائے ختن میں تین سو میل تک ریت کے تودوں کے نیچے دبے ہوئے ہیں سنہ عیسوی سے ڈیڑھ دو سو سال پیشتر قنوج کے دو شہزادوں نے ایک زبردست بستی آرمینیا میں قائم کی تھی جو کئی سو برس تک نہایت تزک و احتشام کے ساتھ برقرار رہی۔ وادی دجلہ فرات اور نیز وادی نیل میں ہندو تمدن کے نشانات برآمد ہوئے ہیں مگر ان کی نسبت صرف استدلال تمثیلی سے مماثلت قائم کی گئی ہے وہاں ہندو تہذیب کی ایسی شاندار یادگاریں نظر نہیں آتی ہیں جیسی جاوا اور کمبوڈیا میں سیاحان مغرب کی حیرت و تحسین کی مرکز بنی ہوئی ہیں۔

تمدن ہند کی قدامت و عظمت

ہندوؤں کو یہ فخر ہے کہ وہ سب سے پرانی قوم ہیں۔ انھوں نے اپنے معصر قوموں کی عظمت شوکت آسمان تک پہنچتے ہوئے دیکھی اور پھر اسے شہاب ثاقب کی مانند نیستی میں نیست ہوتے بھی دیکھا ان کے سامنے قومیں بنیں اور بگڑیں۔ بلکہ یہی راس (آسوریہ کی مردانہ صفت حملہ آور) کی یورش اور سیس طرس اعظم (شاہ مصر) کی یلغار بھی دیکھی۔ اسیر ہنی پال اور بنوکد نصیر کے ہمقوم اور نیز محکوم جہان سے مٹ چکے ہیں اور اب ان کے کارنامے محض افسانہ ہیں دارا اور سکندر کی نسل پردہ نیستی میں مستور ہو گئی ہے۔ حضرت ابراہیم کی اولاد زندہ ہے۔ مگر من حیثیت قوم نہیں۔ غرض ہزار ہا تاریخی انقلابات ہوئے۔ قومیں ہستی سے نیستی میں پنہاں ہو چکی ہیں مگر یہ خود تاریخ جدیدہ کے تغیر و تبدل دیکھنے کو اب بھی دنیا میں موجود ہیں جو لوگ ابھی زمانہ حال تک ہندوؤں کی قدامت کے دعوے کو شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ بھی اب ان روایات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں درحقیقت اس دعوی کی تائید و تصدیق میں جو ثبوت بہم پہنچے ہیں۔ ان سے علمی دنیا میں عظیم تہلکہ برپا ہو گیا ہے۔ اور مغربی محققین اپنے نصف صدی کے مفروضات کے ترمیم و تنسیخ پر مجبور ہو گئے ہیں اور جو مسائل برسوں سے ارباب فکر کی دماغ سوزی کے موضوع بنے ہوئے تھے۔ اب خود بخود حل ہو گئے ہیں۔ ہڑپہ (ضلع منٹگمری) اور موہن جو دارو (لاڑکانہ سندھ) کے حیرت انگیز کھنڈروں نے جن کی کھدائی کا کام جو سنہ ۱۹۲۲ء سے جاری ہے۔ محکمہ اثریات (آرکیالوجی) کے ڈائرکٹر۔ سر جان مارشل اور دیگر مغربی محققوں کو اس صداقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ ہڑپہ اور موہن جو دارو کے درمیانی علاقہ کے باشندے اس تمدن کے مخترع اور موجد ہیں جس کے قابل قدر نشانات وادی دجلہ اور فرات مغربی ایشیا۔ وسطی ایشیا۔ اور جزیرہ کریٹ تک پائے جاتے ہیں پروفیسر سیس ماہر آثار قدیمہ آسوریہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور مسٹر لٹن اسمتھ نے جو عجائب خانہ لندن کے شعبہ آثار باقیات کے مہتمم ہیں۔ ہڑپہ اور موہن جوداڑو کے آثار قدامت کی بنا پر تمدن ہند کی قدامت چھ ہزار سال قرار دی ہے۔ سر جان مارشل موصوف کی یہ بھی رائے ہے کہ ہڑپہ اور وادی سندھ کے قدیم زمانہ باشندے عمدہ شہروں میں رہتے تھے۔ ان کا تمدن نسبتاً نہایت بلند پایہ تھا۔ ان کے صنعت و حرفت درجہ کمال پر پہنچ گئی تھی۔ اور ان کا رسم الخط بھی اعلےٰ درجے کا مکمل تھا۔ ان کھنڈروں میں پختہ مندر اور اچھے اچھے مکانات پائے گئے ہیں۔ نالیوں پر سنگ مرمر کے تختے جڑے ہوئے ہیں۔ بدرووں کا نہایت عمدہ انتظام معلوم ہوتا ہے۔ بہت سکے بھی نکلے ہیں جو دنیا میں بے نظیر اور سب سے پرانے قرار دیے گئے ہیں غرض ان دونوں مقاموں سے سیکڑوں چیزیں برآمد ہوئی ہیں جن سے ہزار سال کے تمدن ہند پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ کی رائے ہے وادی سندھ کے اسلاف ہند بلوچستان نیز براستہ بحر سوپوطامیہ میں پہنچے اور وہاں بھی اپنی بستیاں قائم کرتے ہوئے ایشیائے کوچک تک چلے گئے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل ہند قدیم ہی سے اغیار کے درمیان تمدن پھیلانے کا مستحسن کام کر رہے ہیں۔ اب سے تین چار ہزار سال پہلے وادی دجلہ و فرات کے درمیان تمدن ہند کی اشاعت استدلال تمثیلی یعنی آثار قدیم کی باہمی مشابہت ثابت ہے اور اب سے دو ہزار سال پہلے ہندوؤں نے جو بستیاں غیر ممالک میں بسائی تھیں ان کے کوہ پیکر نشانات اس وقت بھی باقی ہیں اور زبان حال سے ہندو تمدن کی عظمت کی لازوال داستان بیان کر رہے ہیں۔

غیر ملکوں میں ہندو بستیاں

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے وادی ہائے دجلہ و فرات اور نیل میں ہندو نو آبادیوں کے ثبوت صرف تمدنی آثار میں پائے جاتے ہیں۔ مگر جنوب مشرقی ایشیا کی ہندو بستیوں کے شاندار نشانات اب بھی سنگلاخ عمارتوں اور کتبوں کی شکل میں موجود ہیں۔ وہاں کے لٹریچر اور معاشرت پر بھی ہندو طرز بود و باش کا نہ مٹنے والا اثر نمایاں ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جاوا اور سماترا اور بلی کی ہندو بستیوں کا ذکر ہوگا پھر ہند چینی اور ترکستان کی ہندو آبادیوں پر بحث کی جائے گی۔

جاوا میں ہندو تمدن کے آثار

کرنیل ٹاڈ صاحب نے اپنی "راجستان" میں لکھا ہے کہ

"مجمع الجزائر ہند سورج بنسیوں نے آباد کیا تھا جن کے کارنامے اور دیو برتانت وہاں کے کہنہ سال عمارتوں پر منقش اور کتابوں میں قلم بند ہیں" مشہور مورخ الفنسٹن صاحب بھی رقم طراز ہیں کہ "تاریخ جاوا سے بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ کالنگ دیش کے بہت سے تارکان وطن جزیرہ جاوا میں وارد ہوئے اور وہاں کے باشندوں کو ہندو تمدن کا سبق سکھایا اور اپنا سن جاری کیا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جو اب تک رائج ہے" جاوا کے انگریز گورنر اور مورخ سر اسٹامفرڈ رفلز کی رائے ہے (جس سے پروفیسر ہیرن نے بھی اتفاق کیا ہے) کہ جاوا کے مشرقی ساحلوں کو برہمنوں نے آباد کیا تھا۔ سیول صاحب مسٹر فرگیوسن کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۶۰۳ء[1] میں ایک راجہ گجرات سے پانچ ہزار ہمراہیوں کے ساتھ جاوا میں وارد ہوا اور ماتا رام میں ایک بستی قائم کی اس قسم کی رائیں دیگر مغربی عالموں نے بھی اب سے چالیس پچاس سال پہلے ظاہر کی تھیں اور گذشتہ چوتھائی صدی کی انوکھی تحقیقات سے ان خیالات کی صحت ثابت ہو گئی ہے۔ غرض جاوا اولوالعزم ہندو آباد کاروں کی شاندار نو آبادی اور زمانہ بعد کی پُر شوکت ہندو سلطنت تھا۔

جزائر مجمع الہند میں جاوا سب سے بڑا اور نہایت گنجان ہے۔ اس کا رقبہ معہ جزیرہ مدورا پچاس ہزار چار سو مربع میل اور آبادی تین کروڑ سے متجاوز ہے۔ تقریباً سو سال سے ڈچ حکومت ہے آج کل اہل جاوا کا مذہب اسلام ہے۔ گو روزانہ زندگی پر اب بھی قدیم ہندو خیالات اور رسم و رواج کا تسلط ہے۔ جاوا کا سنسکرت نام یاد رہے۔ جس کے معنی " جو اور منڈوے کا ملک " ہے۔ جنوبی ہند کے شہر مدورا کے نام پر جاوا کے پاس بھی ایک جزیرہ کا نام مدورا رکھا گیا ہے جاوا کے جغرافیائی نام سنسکرت سے مستعار ہے۔ وہاں کے مشہور آتش خیز پہاڑ کا نام سمیرو ہے۔ کہ جس کا ذکر اکثر پرانوں میں آیا ہے۔ چنڈی ارجنو۔ چنڈی بھیمو یعنی ارجن اور بھیم کی یادگاریں۔ مکٹ بومی (سکھ بھومی)۔ "سرزمین راحت" پرم بن وغیرہ بھی سنسکرت ہی کے نام ہیں۔ اہل جاوا کی زبان میں بھی سنسکرت الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اور جاوا کا ادبیات ہندو لٹریچر کا عکس ہے۔ مثلاً بارت یُدھ (بھارت یدھ) نیتی مہابھارت" ارجن یوره" وغیرہ۔ مہابھارت اور گیتا کا بڑا رواج ہے۔ اکثر تقریبوں پر اب بھی انھیں کی تلاوت کی جاتی ہے۔ دار الصدر بٹاویہ سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں راجہ پورن ورمن کی بہت تعریف لکھی ہوئی ہے۔ دیگر کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی ہندو آباد کار وشنو مت کے پیرو تھے۔ بعد کی تاریخ نہیں ملتی جب ہندو وسطی اور مشرقی حصوں میں آباد ہو گئے، تو ظاہر ہوتا ہے کہ وشنو مت کی جگہ شیو پوجا نے لی ۴۱۲ء میں چینی سیّاح فاہیان جاوا میں گیا۔ وہ ہندو آباد کاروں کے عروج اور خوش حالی کا ذکر کرتا ہوا لکھتا ہے کہ ہندوؤں کو اس جزیرہ کے اصلی باشندوں کے درمیان اپنا مذہب رائج کرنے میں حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوئی ہے اور انھوں نے اپنے نئے وطن کو اپنی بے نظیر صنعت اور شائستگی کے دائمی نشانات سے مزین کر دیا ہے۔ وہانگ اور اہانگ کے کتبوں سے ثابت ہوتا ہے کہ

---

[1] قبل مسیح

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مغربی اور وسطی حصوں کے ہندو مت باہم دگر پیوست تھے اور ان کا زور ۹۲۹ء تک رہا۔ ۱۰۷۸ء کے کتبوں سے جو کشن اور جے جے کرنا سے برآمد ہوئے ہیں ظاہر ہوتا ہے کہ بودھ مت اور شیومت آپس میں شیر و شکر ہو گئے تھے۔

یہاں پر مغربی عالموں کے تازہ ترین رائیوں کا اقتباس خالی از لطف نہ ہو گا۔

جاوا میں ہندو اقتدار پانچویں صدی سے شروع ہوا تھا اس جزیرہ کے مذہب اور لٹریچر طریقہ حکومت اور زبان رسم الخط اور فنون پر ہندو عظمت کا دائمی اثر نمایاں ہے ہندو آباد کاروں کی مساعی حسنہ سے شاندار سلطنتیں معرض وجود میں آئیں۔ جاوا کے ہندو تمدن کی شوکت کا اثر سماٹرا۔ بورنیو۔ اور جزائر ملایا تک پہونچا۔ بعض عالموں کی رائے میں ہندو اقتدار کا اثر پایا اور آسٹریلیا تک نمایاں پایا گیا ہے۔ (ماخوذ از نیو انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۱ صفحہ ۱۵۴)

ذیل کا اقتباس انسائیکلوپیڈیا برطانیکا گیارہواں اڈیشن جلد ۱۵ صفحہ ۲۵۲ سے دیا جاتا ہے۔

تاریخ جاوا کا سب سے پہلا باب ہندو شوکت سے شروع ہوتا ہے جو تین زمانوں پر منقسم ہے۔ اول بودھ مت کا عہد۔ دوم شیو پرستی کے غلبہ کا زمانہ سوم ان دونوں کے باہمی ملاپ کا قرن ہے۔ جاوا میں جتنی ہندو سلطنتیں قائم ہوئی ہیں ان میں سب سے زبردست اور مشہور وہ ہے جو پندرہویں صدی تک رہی۔ اور کئی حکومتیں بھی اس کی باجگزار تھیں اور اسی کی شوکت کا اثر دور افتادہ جزائر تک بھی پہونچا تھا جہاں ہندوؤں کی بہت سی عظیم الشان یادگاریں ابھی تک پائی جاتی ہیں۔ ان کی تعمیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ محرابوں اور ستونوں کے بنانے میں چونہ سے کام نہیں لیا گیا۔ وسطی خطہ کے مندر آٹھویں اور دسویں صدی کے ہیں۔

ہندو سلطنت کی عظمت ساتویں صدی سے لے کر بارہویں صدی تک رہی۔ اس کے بعد پندرہویں صدی میں جاوا میں اسلام کی ابتدا ہوئی۔ جاوا اور بالی کی موجودہ حالت کیا ہے؟ اس دلچسپ سوال کے جواب میں ملک الشعراء ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے خیالات کا خلاصہ بیان کرنا بیجا نہ ہوگا۔

جولائی ۱۹۲۷ء میں آپ دو چار اور بنگالی احباب کے ساتھ جاوا۔ بالی۔ ملایا۔ سنگاپور اور سیام کی سیاحت کو گئے تھے۔ جہاں سے آخر اکتوبر گذشتہ میں آپ واپس آئے۔ چنانچہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ڈاکٹر موصوف نے اخبار "اسٹیٹسمین" کلکتہ کے ایک نمائندہ سے دوران مکالمہ میں یہ فرمایا کہ "ہندو فلسفہ اور ہندو خیالات کا جیسا خوشنما اظہار جزائر جاوا اور بلی میں ہوا ہے، ویسا ہم نے اور کہیں نہیں دیکھا۔ خصوصاً اہلِ بلی کی معاشرت میں تو ہندو تہذیب و تمدن کا اکھی تک سکہ بیٹھا ہوا ہے۔ چنانچہ مہابھارت اور رامائن کا تو وہاں کے لوگوں کی روزمرہ کی زندگی میں بہت بڑا اثر ہے۔ حتی کہ خود ہندوستان میں مہابھارت و رامائن عوام کے زندگی پر اس طرح مسلط نہیں ہیں جیسے کہ جاوا اور بلی میں ہیں۔ وہاں کی صناعی اور موسیقی ناچ رنگ اور نقاشی کو ان دونوں کتابوں سے تحریک حاصل ہوئی ہے۔ غرض جو مقبولیت سنسکرت کی رزمیہ شاعری کو وہاں حاصل ہوئی ہے وہ ہندو فلسفہ کو بھی نصیب نہیں ہو سکی۔"

جاوا میں ہندو تسلط کی غیر فانی یادگار بورو بدر کا وہ پیکر مندر ہے جو سطح مرتفع دہانگ پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی ساڑھے چھ ہزار فٹ بلند ہے اور اس کے اوپر آنے جانے کے لیے عمدہ سڑک بنی ہوئی ہے۔ جس کے دو ہزار سات سو زینے ہیں۔ اوپر کے پانی کے اخراج کے لیے جو نہر بنی ہوئی ہے وہ اگلے زمانے کے ہندوؤں کی صناعی کا قابل تعریف نمونہ ہے۔ اسی خطہ میں مندر واقع ہے اور اس کی بلندی ارد گرد کے میدان سے ڈیڑھ سو فٹ ہے۔ اس کی چار منزلیں ہیں اس کے بیرونی حصہ میں لاوے کے سنگلاخ ڈھیلے صاف کر کے پیوست کیے گئے ہیں جو بہت بڑے اور وزنی ہیں۔ سنگ تراشی کی نازک اور دلفریب صنعت کاریوں سے اس مقدس مندر کو آراستہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔ اعلیٰ ترین دستکاری کے ہزارہا نمونے در و دیوار فرش اور چھت اور پہلوؤں میں موجود ہیں۔ صدہا آرائشی مورتیاں اور زیبائشی بیل بوٹے۔ انسانی اور حیوانی نباتاتی شکلیں منقش ہیں ماہرین کا یہ اندازہ ہے کہ اگر ان تمام مورتیوں کو پہلو بہ پہلو آراستہ کیا جائے تو ان کے لیے تین میل لمبا میدان درکار ہوگا۔ ان کا کل شمار دو ہزار ایک سو اکتالیس ہے۔ بورو بدر کی ابتدائی منزل کا ہر ایک ضلع چار سو ستانوے فٹ اور بلندی پچاس فٹ ہے۔ سب کے اوپر ایک بڑا گنبد ہے جس کا قطر باون فٹ ہے۔ اس کے ارد گرد اور سولہ گنبد ہیں جو سب کے سب بڑے گھنٹے کی مانند ہیں۔ پرم بن کے مندر بھی گذشتہ ہندو عظمت کی زندہ یادگار ہیں۔

جاوا اور بلی کے باشندوں کے طور و طریقے ہندوانہ ہیں۔ چنانچہ جزیرۂ بلی میں اب تک ستی کا رواج ہے۔ وہاں کے لوگ اسلام کے دائرہ میں نہیں آئے ہیں دونوں جزیروں کے لوگ ہندو رسم رواج کے پابند اور ہندو تیوہاروں کے معتقد ہیں۔ مسجدوں میں نماز خاص موقع ہی پر پڑھی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر اہل جاوا صرف نام کے مسلمان ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کمبوڈیہ میں قدیم ہندو شوکت کے نشانات

سنہ عیسوی سے کچھ عرصہ پیشتر ہندوستان کے مشرقی ساحل۔ غالباً ساحل بنگال سے کئی مقتدر روسا، اپنے وفادار ساتھیوں کے ساتھ کہ جن میں براہمن کشتری۔ ویش وغیرہ قوموں کے افراد تھے۔ ہند چینی کو گئے، اور ایک بستی قائم کر لی۔ کہ جس سے کمبوڈیہ میں رفتہ رفتہ ہندو سلطنت قائم ہوگئی۔ اس ملک کی روایات کے رو سے ابتدائی ہندو آبادکاروں کا سردار مہاراجہ دتی کار اگنبار پر بیہ سنگھ تھا۔ اور ناگ ان کا خاص قومی نشان تھا۔ اسی وجہ سے ان کے مندروں اور قلعوں اور دیگر عظیم الشان عمارتوں پر سانپ کی مورت بنی ہوتی تھی۔ جو اب تک کمبوڈیہ کی تاریخی عمارتوں پر پائی جاتی ہے۔ کمبوڈیہ کے پرانے باشندے تہذیب سے بالکل بیگانہ تھے۔ اس لیے انھوں نے مذہب اور ہندو تمدن کو قبول کر لیا۔ جدید اثری تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی میں یہاں پر ہندو دھرم کا عام رواج تھا۔ اور ہندو ادبیات نے یہاں کے اصلی باشندوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ دیگر علوم و فنون بھی مقبول عام ہو گئے تھے۔ پرانے باشندے اپنی قومی روایات کو فراموش کر کے ہندو مذہب اور دیگر باتوں پر دل و جان سے قربان تھے۔ شترو ورمن کے زیر کمان ہندو آبادکاروں کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ مگر ساتویں صدی میں شترو ورمن کے شاہی خاندان کا نام مٹ گیا، اور ہندو سلطنت دو حصوں میں بٹ گئی۔ اور دو حکمران حکومت کرتے تھے۔ نویں صدی کے آغاز میں ان دونوں خاندانوں میں پھر اتفاق و اتحاد ہو گیا۔ اور جے ورمن سوم کے شاہی خاندان کی حکومت شروع ہوئی کہ جس کے دوران میں ہندو تہذیب کو غیر معمولی عروج حاصل ہوا۔ اسی مبارک عہد میں وہ شاندار عمارتیں تعمیر ہوئی کہ جو اب تک ہندو صنعت کی بہترین یادگاریں سمجھی جاتی ہیں۔ انک کر راجدھانی قرار پایا۔ جس کی تعمیر کی تکمیل جشو ورمن نے سنہ ۹۰۰ء میں کی تھی۔ جب ہندو سلطنت کا اقبال بلند ہوا تو ہندو دھرم راج دھرم قرار پایا اور دسویں صدی تک مروج رہا پھر بودھ مت پھیلنا شروع ہوا تھا انک ورکا مشہور مندر بارھویں صدی کے پہلے حصہ میں تعمیر ہوا تھا پنڈت دیوکر مہاراجہ کا میر عمارت اور کار مختار تھا کہ جس کے زیر ہدایت یہ عظیم الشان مندر تعمیر ہوا وہ اپنے زمانہ کے تمام ہندو حکمرانوں کا منظور نظر تھا۔ اس زمانہ میں چمپہ کا راج کو چین چائنا اور جنوبی انام پر حاوی تھا۔ کہ جے ورمن ہشتم کے عہد میں بارھویں صدی کے اخیر میں مفتوح ہو کر کمبوڈیہ کی ہندو سلطنت میں شامل ہو گیا موجودہ سیام اور چین کے جنوبی صوبے بھی ہندو راج کے زیر نگیں تھے۔ یہ سلطنت ایک وقت میں موجودہ ہند چینی پر مستلط تھی۔

موجود الوقت کمبوڈیہ میں ابھی پرانے ہندوؤں کی اولاد اب بھی بستی ہے۔ راجہ بھی ہندو

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نسل سے ہے جو کئی برس سے فرانس کے زیر سایہ راج کرتا ہے۔ ہندو دوران آشرم صدہا سال سے وہاں پر قائم چلا آتا ہے۔ گو لوگوں کا عام دھرم بودھ مت ہے۔ مگر رسم و رواج اور خیالات اور ادبیات اور دیگر فنون پر ہندو تمدن کا استمراری اثر منقش ہے۔ براہمنوں کا زور ہے۔ ہندو توہمات بھی عام ہیں زبان پر بھی سنسکرت الفاظ کا تصرف ہے۔ راج دربار کے فرائض براہمنوں کی اولاد انجام دیتی ہے۔ شاہی نسل کے لوگ "بڑہ ونش" کہلاتے ہیں۔ ولیعہد "اپ راج" کہلاتا ہے۔ دریا کو اہل کمبوڈیہ "میگان" کہتے ہیں جس کے معنی گنگا ماتا کے ہیں شہر کو وہ نگر کہتے تھے۔ جو بگڑ کر اب انگر رہ گیا ہے۔ ملک کا نام کمبوڈیہ کمبوج سنسکرت سے مستعار ہے جس کا ذکر مہابھارت اور پورانوں میں آیا ہے۔ غالباً اس ملک کا پہلا فرمانروا کمبو تھا جس کی وجہ سے اس کا نام قرار پایا۔ کمبوڈیہ میں ہندو عظمت کی سب سے بڑی یادگار انگرورت کا عظیم الشان مندر ہے جو جنوبی ہند کے مندروں کے طرز پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی دیواروں پر سینکڑوں نفیس مورتیاں اور نقش و نگار کندہ ہیں۔ جنمیں کرشن جی۔ رامچندر جی۔ راون اور گرڑ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں "اننت سرپ" کی مورتی ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ اور سینکڑوں دیویاں دیوتے بھی ہر جگہ کندہ کیے گئے ہیں۔ مندر کا وسطی گنبد ایک سو اسی فٹ بلند ہے اور اس کی پرکرما کا ایک پہلو نصف میل لمبائی میں ہے اس سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مندر کی چار دیواری سنگلاخ ہے اور ہر طرف دو دو میل تک پھیلی ہوئی ہے۔ دیواریں بیس اور تیس فٹ بلند ہیں اس کے اندر جانے کے لیے پانچ عظیم الشان دروازے ہیں۔ شاہی محلات اور مندر دونوں اسی وسیع احاطہ کے اندر واقع ہیں مندر کے پچاس بڑے بڑے میناروں پر برہما کی چوکھٹی مورتیاں ہیں جو صنعت و صناعی کا بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں۔

کمبوڈیہ کے میدانوں جنگلوں اور پہاڑوں میں اب تک پرانے شہروں مندروں اور قلعوں کے نشانات پائے جاتے ہیں علاوہ بریں پرانے ہندو آباد کاروں نے آمد و رفت کی عمدہ سڑکیں بنوائی ہیں دریاؤں اور ندی نالوں پر پختہ اور مستحکم پل بنوائے تھے جن کے کھنڈر اب تک پائے جاتے ہیں۔ سلسلہ انہار بھی قائم کیا تھا۔ جو ہندو انجنیروں کی ہنرمندی پر دال ہے۔ ابھی یہ نہیں معلوم ہوا ہے کہ ہند چینی میں ہندو شوکت کو کیونکر زوال لاحق ہوا۔ لیکن آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر کوئی آفت ناگہانی نازل ہوئی۔ زلزلہ یا پلیگ وغیرہ۔ جس سے چشم زدن میں ساری عظمت ہت و نابود ہو گئی۔ فرانس کا محکمہ آثار قدیمہ بھی تحقیقات اور پرانی عمارتوں کی شان بحال کرنے پر مصروف ہے۔

وسطی ایشیا میں ہندو تمدن کے آثار

پچاس ساٹھ سال سے مغربی عالموں کا یہ خیال ہے کہ وسطی ایشیا یعنی ترکستان و ختن میں بھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہندو آبادیاں تھیں۔ ٹاڈ صاحب اپنی "راجستھان" میں لکھتے ہیں "عبد الغازی تمساک کا ذکر کرتا ہے کہ جو ترک کا بیٹا تھا پورانوں میں اسے ترشک بیان کیا گیا ہے۔ اس کی اولاد نے اس ملک کو تورک استھان یعنی ترکستان کا نام دیا تھا" میکس مولر کی رائے ہے کہ "ترو اور اس کی اولاد جو تورانیوں کی نمائندہ ہے۔ زمانہ بعد کی رزمیہ کتابوں میں مذکور ہے۔ اسے ملون لکھا ہے جو اپنے ورثہ سے محروم ہونے سے ترک وطن کرنے کو مجبور ہوئی تھی"۔ ایک مسلمان مورخ بقول ہندو سپریا رٹی راوی ہے۔ "ملک خطا کو ابتدا میں ہندو آبادکاروں نے آباد کیا تھا"۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ نصف صدی پہلے کے خیالات اور پورانوں اور مہابھارت کے حوالوں کی تائید و تصدیق سر آرل اسٹائن اور کرین ہیڈن کی تحقیقات سے بخوبی ہوتی ہے کہ جو موجودہ صدی کے آغاز سے ہوتی چلی آئی ہے اور اس بارے میں سر آرل موصوف نے ہند پر جو احسان کیا ہے اس سے سبکدوش ہونا امر محال ہے۔

ترکستان کے مشرقی حصہ میں ہندوؤں کی جو بستی تھی اس کے نشانات صحرائے ختن میں پائے گئے ہیں۔ کتبے۔ سکے۔ مسودے اور بیسیوں چیزیں برآمد ہوئی ہیں۔ جن سے ہندو آبادکاروں کی تمدنی ترقی پر متعدد بہ روشنی پڑتی ہے۔ سنگ تراشی کے نمونے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ جو ہندو صناعی کا قابل قدر نمونہ ہیں سر آرل اسٹائن نے ۱۹۰۰ء اور ۱۹۰۱ء میں صحرائے ختن کے مدفون کھنڈروں کی کھدائی کی تو سینکڑوں پرانی چیزیں برآمد ہوئیں۔ پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی نقاشی اور کار چوبی کے نمونے ہاتھ آئے ہیں تحریریں ہندی رسم الخط میں ہیں۔ بعض سنسکرت میں اور پراکرت بھاشا میں بھی ہیں۔ اسی راستہ سے بودھ مت چین میں پہنچا تھا۔ سر آرل اسٹائن کا اندازہ ہے کہ مشرق سے مغرب تک تین سو میل کی لمبائی میں اڑتی ریت کے نیچے مدفون شہروں کے کھنڈر پائے جاتے ہیں۔ غرض موصوف کی رائے میں "ہر چیز پر ہندو تمدن کا نقش نظر آتا ہے"۔

چوبی لوحوں اور چرمی پرزوں پر صدہا تحریریں دریائے تیہ کے آگے کی سرزمین سے ہاتھ آئی ہیں جو خروشتی حروف میں ہیں ایک تختی پر پراکرت پائی گئی ہے کہ جس سے بظاہر ہوتا ہے کہ دوسری تیسری صدی عیسوی میں پنجاب سے لے کر ختن تک یہی ہندوؤں کی عام بولی تھی۔ پروفیسر راپ سن کا خیال یہ ہے کہ خط تو خروشتی مگر زبان پراکرت تھی۔ جس میں سرکاری احکام نافذ ہوتے تھے۔ ختن کے ملک کو ٹیکسلا کے ہندوؤں نے سن عیسوی سے دو سال پہلے فتح کیا تھا۔ سر آرل موصوف اس امر کی نسبت حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ روزمرہ کی معاشرت کے حالات ہندوستانی زبان میں قلم بند پائے جاتے ہیں بہر حال ان واقعات سے واضح ہو گیا ہے کہ ترکستان میں بھی ہندو آبادکاروں نے اپنا دھرم اور تمدن رائج کیا اور پھر حکومت قائم کر دی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چھوٹی لین

رام سرن نگم - ایم. ایس. سی

زمانہ فروری ۱۹۲۸ء

جناب میرا مطلب ریلوے کی چھوٹی لین سے ہے، جس کو انگریزی میں METER GAUGE کہتے ہیں۔ خدا رکھے اس چھوٹی لین میں بہت سی خوبیاں ہیں پولیس کی طرح اس میں گورنمنٹ کے تلنگے نہیں ڈھلتے نہ بڑی لین کی طرح روپیہ کمایا جاتا ہے اس کا اصلی مقصد صرف خلق اللہ کو آرام پہونچانا ہے۔ مثل مشہور ہے "کم کھانا و غم کھانا" یہی اس کا مدعا ہے۔

یوں تو ہر شخص کے چار دوست چار دشمن ہوتے ہیں مگر سچ پوچھئے تو چھوٹی لین کا دل سے کوئی بدخواہ نہیں ہے۔ آپ اس پر نہ جائیے کہ اخباروں میں آئے دن لوگ اس کے دکھڑے رویا کرتے ہیں۔ یہ تو آج کل کے اخباروں کی معمولی شعبدہ بازیاں ہیں۔ اور نامہ نگار اصحاب کے ادنیٰ کرشمے ہیں۔ جب کبھی کونسلوں کی کارروائیوں۔ ممبروں کے سوال و جواب۔ ملکی۔ قومی صوبہ داری و پیشہ وری کانفرنسوں کی روئداد اور متعدد یونیورسٹیوں کے امتحانات کے نتائج سے جگہ بچی تو بیچارے ایڈیٹران اخبارات کے لیے اس کے سوائے اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ ادنے ادنے معاملات کو بڑھا گھٹا کر اپنے ناظرین کے تفننِ طبع کا سامان مہیا کریں جھوٹے قصے فرضی افسانے چھاپیں۔ من گھڑت کہانیاں اور مصنوعی شکایتیں شائع کریں۔ بیچاری چھوٹی لائن بھی اسی خوئے بد کا شکار ہے۔ اور جب اخباروں کو اور کچھ چھاپنے کو نہیں ملتا ہے تو اس غریب ریل کے متعلق گمنام شکایتی خطوط چھاپنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ذرا غور فرمائیے اگر یہ خطوط اصلی نامہ نگاروں کے لکھے ہوئے ہوں یا ان کی شکائتیں سچ اور درست ہوں تو پھر نامہ نگاروں کو اپنے نام پوشیدہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آئے اور یہ تحریریں یتیم خانہ کے بچوں کی طرح گمنام کیوں رہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ان خطوط کے اوپر صاف اور واضح طور پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ اڈیٹر اخبار نامہ نگاروں کی رائیوں کا ذمہ دار نہیں میں پوچھتا ہوں کہ ایسے گمنام مراسلوں کے شائع کرنے والے صاحب بری الذمہ پھر ان

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تحریروں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ آخر ریلوے کمپنی کیوں ان کا لحاظ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈائرکٹر صاحبان ان تحریرات پر مطلق دھیان نہیں دیتے اور اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے آخر بڑے بڑے بادشاہوں تک کے مخالف ہوا کرتے ہیں۔ بغض و حسد رنج و کینہ کا جواب ہی کیا ہو سکتا ہے۔ جواب جاہلاں باشد خموشی یہی طرز عمل چھوٹی لین کے افسران کا ہے۔ آپ خدانخواستہ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ الخاموشی نیم رضا اور کمپنی کے سکوت سے کہیں یہ قیاس نہ کر لیجئے گا کہ حکام چھوٹی لین نے کبھی کسی معاملے میں اپنا قصور تسلیم کر لیا ہے۔ نہ جناب یہ نہ ہوگا۔ اول تو چھوٹی لین میں کوئی نقص ہی نہیں ہو سکتا ہے اور پھر خدانخواستہ کوئی قصور بھی ہو تو افسران اس کی طرف توجہ دیکر کب تک بات کا بتنگڑ بنانے لگے۔ لیکن سچ پوچھئے تو آج تک جتنی شکایتیں ہوئی ہیں سب غلط اور بے بنیاد اسی لیے میں بے زبان و معصوم ریلوے کی حمایت کے لیے مستعد ہوں۔

آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ جب کبھی کسی وجہ سے کسی دفتر کا کوئی ملازم برخاست کر دیا جاتا ہے تو اس کے متعلق بیسیوں گمنام خطوط اخباروں میں نکلنے لگتے ہیں مگر یہ سب خطوط اسی برخاست شدہ ملازم کے لکھے ہوتے ہیں اسی سے ان کی وقعت نہیں ہوتی اور ہونا بھی نہ چاہیے۔ اسی طرح ایک صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ اس ریل کی بے توجہی موجودہ تہذیب کے لیے باعث شرم ہے۔ مگر میں اس شرمیلے نامہ نگار سے صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ اس کا یہ لکھنا سراسر فضول ہے۔ کمپنی اب بھی بے توجہ ہے اور رہے گی۔ اگر کسی کا یہ خیال ہے کہ اس طرح دھمکانے سے کمپنی مرعوب ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے خیال کے مطابق اس کو ترقی پر مائل کر سکے گا۔ تو وہ صریحاً غلطی پر ہے۔ جس کو آپ "ترقی" یا "ریفارم" سمجھتے ہیں وہ کمپنی کے نزدیک تنزلی ہے۔ آپ ان خیالات خام کو دل سے نکال دیجئے، چھوٹی لین میں شروع ہی میں انتہائی ترقی ہو چکی ہے اور اب اس میں کسی ترمیم و تنسیخ کی گنجائش نہیں ہے۔ این خیال است و محال است و جنوں۔ آفرین ہے کمپنی کی بلند ہمتی اور مستقل مزاجی پر کہ وہ ان بزدلانہ حملوں کا مطلق خیال نہیں کرتی بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ایک لطف اور ہے۔ شکایتیں تو ہندوستان کے اخباروں میں نکلتی ہیں مگر ڈائرکٹران سات سمندر پار انگلستان میں رہتے ہیں۔ درحقیقت وہ اس شرط سے منتخب کیے جاتے ہیں کہ کبھی کوئی ہندوستانی اخبار نہ دیکھیں گے اب رہے ملازمان وہ اس بارے میں کوئی خط و کتابت نہیں کر سکتے۔ غرض یہ تمام فضول شکائتیں یوں ہی رہ جاتی ہیں۔ کوئی فیصلہ ہوتا ہے۔ نہ قصہ جس طرح شب ہجر کے فرضی مصائب کی معشوق کو خبر نہیں ہوتی ہے اسی طرح ڈائرکٹران کمپنی بیکار باتوں پر کان نہیں دیتے ہیں۔

بعض اصحاب کو یہ شکایت ہے کہ چھوٹی لین کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں نکلتا۔ لیکن ذرا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

غور فرمائیے تو آپ اس اعتراض کو غلط بلکہ سراسر غلط پائیں گے۔ ہر اسٹیشن پہ اردو ہندی میں نہ سہی انگریزی میں ضرور کسی نہ کسی وقت ٹائم ٹیبل آویزاں کیا گیا ہے۔ پھر بتلائیے ٹائم ٹیبل کی کیا ضرورت ہے؟ چھوٹی لین کو آئے دن کی تبدیلیوں سے نفرت ہے اس کے اوقات مستقل ہیں جو کافی غور و فکر کے بعد ہمیشہ کے لیے قائم کیے گئے ہیں اور ہر شخص کو ان سے واقف ہونا ضروری ہے۔ ورنہ لاعلمی کا علاج تو قانون کے پاس بھی نہیں ہے۔ خیر کچھ ہو چھوٹی لین شروع سے اخیر تک ایک وضع پر قائم ہے۔ وہ دوسری ریلوں کی طرح لوگوں کا روپیہ فضول برباد کرنا گناہ سمجھتی ہے۔ آخر بار بار نئے ٹائم ٹیبل چھاپنے سے سوائے اس کے اور کیا فائدہ ہے کہ وقتاً فوقتاً آپ کے ردی کی ٹوکری کے لیے سامان مہیا ہوتا رہے۔ یہ فعل عبث ہے اور چھوٹی لین کے افسران فضول نمود و نمائش کے خلاف ہیں۔ وہ پبلک کو لوٹنا نہیں چاہتے اور نہ تلون طبع واقع ہوئے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ان کا رویہ بالکل درست ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر جنتریوں اور پتروں میں طلوع و غروب آفتاب کے اوقات درج رہتے ہیں مگر آپ نے کبھی کسی شخص کو ان معلومات سے فائدہ اٹھاتے بھی دیکھا؟ لوگوں کو معلوم ہے کہ سرکاری کارڈ آدھ آنہ اور لفافہ ایک آنہ کو ملتا ہے بلا ٹکٹ خطوط بیرنگ ہو جاتے ہیں اور ان کا دوچند محصول ڈاک دینا پڑتا ہے۔ بیس روپیہ سے زائد روپیہ کے داد و ستد پہ ایک آنہ کا ٹکٹ لگانا ضروری ہے۔ آپ ہی فرمائیے کہ ان معلومات کے واسطے کتنے لوگ پوسٹل گائیڈ یا اسٹامپ ایکٹ کی ورق گردانی کرتے ہیں پھر چھوٹی لین سے ٹائم ٹیبل کی اشاعت کا لوگ کیوں مطالبہ کرتے ہیں؟

اس کمپنی کے اغراض و مقاصد اشتہاری نہیں ہیں اور روپیہ کمانے کی ادنیٰ تدبیریں اس کو بالکل پسند نہیں جس طرح اور بہت سے مقررہ پیمانے ہیں اسی طرح چھوٹی لین کے اوقات آمد و رفت بھی سمجھ بوجھ کر معین ہو چکے ہیں جب ان میں کوئی تبدیلی ہی نہیں ہوتی تو پھر ٹائم ٹیبل کی کیا ضرورت ہے؟

ایک شکایت یہ بھی سننے میں آئی ہے کہ جنکشنوں میں چھوٹی لین کا دوسری ٹرینوں کے وقت سے میلان نہیں ہوتا ہے۔ خوب! یہ الزام بیچاری چھوٹی لین کے سر فضول لگایا جاتا ہے۔ درحقیقت مسافروں کو جنکشن تک پہونچا دینے کے بعد چھوٹی لین کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ اب یہ اور کمپنیوں کا کام ہے کہ اپنے مسافروں کے آرام و آسائش کا لحاظ رکھیں وہاں تو ہر ماہ وقت تبدیل ہوا کرتے ہیں جس طرح چاہیں اپنے ریلوں کے اوقات درست کر لیں اور مسافروں کو ناحق پریشان نہ کریں۔ مگر غور کیجئے تو اس میں بھی ایک مصلحت مضمر ہے لوگ اسی طرح کان پور۔ لکھنؤ وغیرہ کی سیر اور کاشی پراگ وغیرہ کے اشنان کر سکتے ہیں۔ دوسرے اس سے یکہ تانگہ والوں کی بھی پرورش ہو جاتی ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اگر مختلف ریلوں کے اوقات ملا دیئے جائیں تو اسٹیشن پر مسافروں کا ہجوم ہی نہ ہونے پائے اور صدہا دوکاندار و خوانچہ والے جن کی معاش کا دارومدار صرف مسافروں کے سودا سلف پر ہے بھوکوں مر جائیں۔

کبھی کبھی اخباروں میں یہ بھی مطالبہ کیا جاتا ہے کہ چھوٹی لین کو بڑا کر دیا جائے مگر مجھ کو اس بیجا مطالبے پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ یہ کوئی سرکاری پوسٹ کارڈ یا لفافہ نہیں ہے کہ کل چھوٹا تھا آج بڑا ہو گیا آپ پہلے گنگا جمنا کے پاٹ کو ذرا کم و بیش کر دیجئے۔ یا گیندے یا تلسی کے پودھے کو پیپل کے درخت کے برابر اونچا کر دیجئے۔ یہ ناممکن ہو تو اتنا ہی کر دکھائیے کہ روپیہ کے سولہ آنہ کے بجائے بیس آنے ملنے لگیں اس کے بعد چھوٹی لین کے توسیع و ترقی کا مطالبہ کیجئے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ کبھی ہماری چھوٹی لین کو بڑی لین بننا پڑے۔ تو پھر دیکھئے گا لوگ چھوٹی لین کا نام لے کر خون کے آنسو روئیں گے۔ آپ چھوٹی لین کے چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ جائیے پھر دیکھئے آپ کو اپنے مکانوں کا لطف آئے گا۔ مجھے تو اس بات کا دلی افسوس ہے کہ معترضین اس لین کے محاسن پر غور نہیں کرتے ہیں۔ قد و قامت کی بحث چھیڑ دیتے ہیں۔

بوٹا سا قد تو شاعروں کو بھی پسند ہوتا ہے۔ پھر معلوم نہیں کہ لوگ اس لین کا قد و قامت بڑھانے کے کیوں درپے ہیں یہ تو یگانگی ریل یا فینسی ریل ہے۔ اس کی خوبصورتی اسی میں ہے کہ یہ چھوٹی لین ہے۔

بعض لوگوں کا ایک اور اعتراض ہے کہ اس کی رفتار سست ہے مگر یہ اس کی وضعداری ہے کہ اب تک آہستہ خرام بلکہ مخرام کی قائل ہے اور اس کی رفتار بال بچوں بڈھوں بیماروں سب کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ آخر جلدی کیا ہے اس میں بیٹھ کر سفر کر کے آپ قدرتی نظاروں کی مفت میں سیر کر سکتے ہیں۔ یہ رئیسوں کی سواری ہے اس طرح چلتی ہے کہ پیٹ کا پانی بھی ہلنے نہیں پاتا ہے۔ جناب یہ کوئی آندھی ردگ نہیں ہے۔ چھوٹی لین ہے اور میں تو طوفان میل کی تیز رفتاری کا سخت مخالف ہوں۔ اس کے رفتاری کی بدولت آپ محض کیمرہ سے چلتی ہوئی ٹرین کا فوٹو بھی لے سکتے ہیں۔ اور اگر آپ کو واقعی تیز رفتار سواری کی ضرورت ہے تو ریل کا سفر ہی ترک کیجئے اور موٹر کے خطروں کا مقابلہ کیجئے ہوائی جہاز پر سیر و تفریح کا بندوبست کیجئے اور ہفتہ میں دو بار ولایت کیا بہشت بریں کی سیر کر آئیے۔ آخر یہ چھوٹی لین ہے۔ کوئی گھوڑ دوڑ کی گھوڑی نہیں ہے اور یہ بھی تو سوچئے کہ اس بیچاری ریل کو روزانہ کتنا طول و طویل سفر کرنا پڑتا ہے تھوڑا فاصلہ ہو تو بلا سے اپنی رفتار تیز ہی کر دے۔ دوسری ریلوں میں دیکھئے کہ مسافروں پر ہر وقت رعشہ طاری رہتا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کر سکتے ریل کاہے کو ہے زلزلہ ہے آپ گھڑی کے پنڈلم کی طرح ادھر ادھر جھوم رہے ہیں۔ چھوٹی لین کو دیکھئے کہ مسافروں کو حرکت

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ اسی وجہ سے سال گذشتہ کے جلسہ ڈائرکٹران میں یہ مسئلہ درپیش تھا کہ جب کبھی چھوٹی لین ٹھہرے تو ہر درجہ میں مسافروں کو اس کی اطلاع دینے کے لیے ایک بجلی کی گھنٹی بجا کرے تاکہ لوگوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ گاڑی واقعی کھڑی ہے چلتی نہیں۔

بہرحال یہ بات تو چھوٹی لین ہی کو نصیب ہے کہ مسافر چاہیں تو چلتی ہوئی گاڑی پر آسانی سے چڑھ اتر سکتے ہیں اسی لیے اس کے پائیدان خاص طور پر نیچے بنائے گئے ہیں۔ اور پختہ سڑک کے کنارے کنارے تار وغیرہ کی حدبندی کے بغیر اس کی ریل دوڑائی گئی ہے۔ گویا لائن بھر میں اس کا پلیٹ فارم موجود ہے یہ رعائتیں اور ریلوں میں کہاں میسر ہیں؟

دنیا میں ناشکروں کی کمی نہیں ہے چنانچہ یہ شکایت بھی سننے میں آتی ہے کہ چھوٹی لین اکثر لیٹ ہو جاتی ہے مگر اس میں کسی کا کیا قصور ہے۔ یہ شکایت سخت بیجا ہے۔ بات یہ ہے کہ اس معاملے میں اس نے ہندوستانی طرز عمل کو مدنظر رکھا ہے۔ وقت کی پابندی نہ رئیسوں سے ہو سکتی ہے اور نہ غریب دیہاتیوں سے ممکن ہے۔ پھر تھوڑی تاخیر تو شانِ امارت میں داخل ہے۔ بہرحال اس سے عوام کی آرام و آسائش ہی مقصود ہے اور جو لوگ وقت پر یا وقت کے پہلے آئیں وہ شوق سے مسافر خانے اور ویٹنگ روم میں آرام کریں کمپنی اس کے لیے ان سے کوئی کرایہ طلب نہیں کرتی۔ اگر آپ کو اسٹیشن آنے میں دیر ہو جائے تو آپ دو چار میل دوڑ کر بھی چھوٹی لین پر بیٹھ سکتے ہیں۔

چھوٹی لین میں حفظانِ صحت کا خیال رکھا ہے کون نہیں جانتا کہ چلتی ہوئی سواری میں پڑھنا آنکھوں کے لیے مضر ہے۔ اسی وجہ سے یہ اپنے گاڑیوں میں رات کے وقت بہت مدھم روشنی کرتی ہے تاکہ مسافر فضول کتب بینی سے اپنی آنکھیں خراب نہ کرلیں۔

کمپنی ایک اور معاملے میں بھی پبلک کا بڑا خیال رکھتی ہے۔ اسی کے گودام ایسے ہیں جہاں عرصہ تک آپ کا مال بلا کرایہ رکھا جاتا ہے یہ بات اور کسی ریل میں ممکن نہیں کہ آپ کچے پھل بھیجیں اور وہ مقام مقصود پر پختہ ہو کر پہونچیں۔ اس پر لطف یہ کہ اس کے ملازمین جگہ جگہ کر یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ پھل خراب تو نہیں ہو گئے ہیں۔

غرض اس غریب پرور لین کی کہاں تک تعریف کی جائے اس کی وضعداری دیکھئے اب تک ایک ہی رنگ پر قائم ہے۔ یہ نہیں کہ اور ریلوں کی طرح آج سرخ رنگ رنگ لیا۔ کل سبز رنگ چھوٹی لین کو اس تصنع سے سخت نفرت ہے۔ اس کو اپنی یک رنگی پر ناز ہے۔ اور لوگ کچھ کہیں یہ اسی رنگ پر قائم رہے گی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رسم الخط

مولوی محمد عبدالحق صاحب بی۔اے۔ایل۔ایل بی جوڈیشل نمبر مونگہ

زمانہ ستمبر ۱۹۳۰ء

ماہ مئی سنہ ۱۹۳۰ء کے زمانہ میں ہندوستانی زبان کے رسم الخط کے متعلق رائے طلب فرما کر ایک ایسے مسئلہ کی جانب قوم و ملک کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ جس پر مستقبل قریب میں ہندوستانیوں کو ایک ممکن العمل رائے قائم کرنا ضروری ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بدقسمتی سے یہ مسئلہ بھی منجملہ ان مسائل کے ہے جن کی بابت ہندوستانیوں میں شدید اختلاف ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اتحاد و اخوت کی وہ لہر جو واقعات حاضرہ کی باعث ہندوستانیوں کے دلوں میں موجزن ہے اس مسئلہ میں اس قسم کی حرارت نہ پیدا ہونے دے جیسی کہ گزشتہ مباحث کے مواقع پر رونما ہوئی تھی۔

ایک قوم کے لیے ایک زبان کا ہونا ضروری ہے۔ زبان درحقیقت گزشتہ تمدن اور طرز بود و باش کا نتیجہ ہے۔ قانونِ قدرت نے زبان و تمدن کو کچھ ایسے طریقے سے آمیز کیا ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اس سے کسی اہل نظر کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مشترکہ زبان مشترکہ تمدن و مشترکہ خیالات کی گود میں پرورش پاتی ہے اور پھولنے پھلنے پر مشترکہ تمدن کی بالیدگی کا ذریعہ بنتی ہے۔

جہاں تک کسی زبان کا تعلق ہے اس کا نشوونما ماحول اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے ہوتا ہے یہ ایک خودرو شے ہے اور کوئی فرد یا قوم حتیٰ کہ گورنمنٹ تک کسی زبان کو کسی ملک میں جبراً رائج نہیں کر سکتی۔ گورنمنٹ اور حکومت کو بھی ایک خاص زبان رائج کرنے کے واسطے ایسے ماحول پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی جس میں وہ سرسبز ہو سکے۔ حالات گرد و پیش میں یہ کیفیت پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ مسلمہ ہے کہ ہمارے اور چند دیگر صوبہ جات میں ایک ہی زبان بولی جاتی ہے جس کا نام اردو ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کے رسم الخط دو ہیں یعنی عربی طرز اور ہندی طرز اول الذکر میں عربی اور آخر الذکر میں سنسکرت حروف تہجی مستعمل ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حروف محض آواز کے زیر و بم کے نام ہیں جو انسان کے منہ سے نکلتی ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

آواز کے مختلف اجزاء کو ضابطۂ تحریر میں لانے کی غرض سے مختلف ناموں سے منسوب کر دیا ہے جو حروف تہجی کہلاتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری دنیا کی مروجہ زبانیں دو اقسام پر تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

اول وہ جن میں حروف سے اور ان کے مفہوم سے مناسبت ہے یعنی اجزاء آواز کا نام وہی رکھا گیا ہے جو زبان سے نکلتی ہے۔ ان زبانوں کی بنا علم الاصوات پر قائم کی گئی ہے لاطینی حروف اور ایک حد تک ہندی حروف اس کی مثالیں ہیں۔

دوم وہ زبانیں جن میں حروف کے ناموں سے اور ان کی آواز سے کوئی مناسبت نہیں ہے مثلاً عربی۔ انگریزی۔ فارسی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ روسی وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کی تعلیم کی بہ نسبت آخر الذکر میں کسی قدر دقت و زحمت رونما ہوتی ہے اور اسی وجہ سے ماہرین فن تعلیم کے دل میں وقتاً فوقتاً یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ آخر الذکر قسم کی زبانوں کے طرز تحریر میں تبدیلی کر دی جائے۔ اور وہ بھی علم الاصوات پر مبنی کر دیئے جائیں۔

قبل اس کے کہ کسی زبان کے رسم الخط میں تغیر کیا جائے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا اس تبدیلی سے زبان کی ضروریات پوری ہوتی ہیں یا نہیں، اگر رسم الخط کی تبدیلی سے زبان کی ضرورتیں نہ پوری ہو سکتی ہوں تو ایسی تبدیلی سخت مصیبت انگیز ہوگی۔ اور رسم الخط کی تبدیلی کے معنی زبان اور تمدن کی تبدیلی ہوگی۔ لہٰذا قبل اس کے کہ ہم اردو رسم الخط کی تبدیلی کا خیال کریں اس امر پر غور کرنے کی شدید ضرورت ہے کہ آیا اس تبدیلی سے ہماری ضروریات پورے طور پر رفع ہو سکیں گی یا نہیں۔ محض دقت و آسانی کی بنا پر ہم طرز تحریر کی تبدیلی کو گوارا نہیں کر سکتے مسئلہ زیر غور کو بحث کی سہولت کی غرض سے ہم دو اجزاء پر تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ آیا اردو زبان کو لاطینی۔ رومن یا ہندی رسم الخط میں تبدیل کرنے سے ہماری ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں یا نہیں۔

۲۔ آیا اردو۔ طرز تحریر میں ایسے نقائص ہیں جن سے تعلیم میں بہت ہرج واقع ہوتا ہے اور یہ نقائص کسی اور تدبیر سے باستثنار تبدیلی رسم الخط رفع نہیں ہو سکتے؟

پہلے مسئلہ کے متعلق یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ لفظ اردو کے معنی لشکر کے ہیں، شاہان مغلیہ کے زمانہ میں ہندوستان کے ہر صوبہ کے باشندے جن کی زبانیں مختلف ہوتی تھیں فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے اور ان کو ایک ہی مقام پر رہنا پڑتا تھا باہمی ارتباط بغیر ایک عام زبان کے مشکل تھا۔ اس دقت کو رفع کرنے کی غرض سے قوانین قدرت کے تحت میں اردو زبان کا وجود رونما ہوا جس کے ذریعہ سے مختلف صوبوں اور قوموں کے افراد ایک

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دوسرے سے بات چیت کر سکتے تھے۔ اس لشکری زبان نے ترقی کرنا شروع کی۔ اور رفتہ رفتہ ایسی رائج ہوئی کہ ہندوستان خاص یعنی صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ پنجاب و دکن میں علی الخصوص اور ہندوستان میں علی العلوم ذریعہ گفت و شنید قرار پائی۔

ہمارے ملک میں اردو زبان کم و بیش ہر گوشہ میں سمجھی جا سکتی ہے۔ برخلاف اس کے دیگر زبانیں جو دوسرے صوبوں میں رائج ہیں۔ سارے ملک میں ذریعہ ارتباط و تبادلۂ خیالات نہیں ہو سکتیں۔ ایسی صورت میں وہ فدائیان قوم جو سارے ہندوستان کو قومیت کے ایک سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اس مشترکہ زبان کو ہندوستان کی قومی زبان قرار دیں

چونکہ اردو زبان کی نشو و نما ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ ہندوستانی تمدن نے عربی اور فارسی تہذیب سے ملکہ ایک خاص صورت اختیار کر لی تھی اور فارسی عدالتی زبان تھی اسلئے اس نے عربی و فارسی طرز تحریر کا جامہ اختیار کیا۔ اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو میں عموماً اور علمی اردو میں خصوصاً عربی اور فارسی کے الفاظ بہ نسبت دیگر زبانوں ـــــــ کے زیادہ ہیں اور سارا علم ادب فارسی لٹریچر کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اب کچھ دنوں سے انگریزی۔ برج بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ بھی وسیع پیمانہ پر استعمال ہونے لگے ہیں۔ اردو کی ترتیب کچھ ایسے طریقہ پر ہوئی ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے آغوش میں لینے کی قدرتی قابلیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ وہ زمانہ دور نہیں کہ یہ جملہ الفاظ بھی اردو کے اجزا قرار پائیں۔ اس امر کی تصریح کی ضرورت نہیں کہ عربی اور فارسی الفاظ کا کسی دوسری زبان میں تحریر کرنا محض دشوار ہی نہیں بلکہ غیر ممکن ہے۔ ث۔ س۔ ص۔ ز۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ میں جو فرق ہے وہ دوسری زبانوں کے حروف سے ادا نہیں ہو سکتا۔ چند حروف ایسے ہیں جو دوسری زبانوں میں پائے نہیں جاتے مثلاً غ۔ ق۔ وغیرہ علاوہ بریں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ان کے مادہ اور املا سے معلوم کیے جاتے ہیں۔ مادہ اور املا کا فرق رسم الخط کی تبدیلی سے مفقود ہو جائے گا۔ اور مفہوم تک پہونچنے میں دقت ہوگی، اس لیے ہندی حروف میں نقطے یا دو تین حروف کا ادغام یا اور دیگر حروف کا اضافہ کرنے سے اردو زبان کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں۔

شاید بعض ناظرین کو معلوم ہو کہ ایک مرتبہ نہایت شدید دقت بھوپال میں اس قسم کے تصرف سے پیدا ہوئی تھی کلکتہ سے کسی صاحب نے انگریزی میں تحریر فرمایا کہ KHAZI-NA TOLA GHAT. فوراً بھیج دو۔ کسی شخص کے سمجھ میں نہ آیا۔ بہت دقت کے بعد یہ مسئلہ حل ہوا کہ خزینۃ اللغات مطلوب ہے،

لٹریچر در حقیقت ایک خاص قسم کے تمدن کی ترجمانی کرتا ہے، اور ہر زبان کے الفاظ و محاورات۔ خیالات و احساسات کی ایک دنیا اپنے ماحول میں وابستہ رکھتے ہیں۔ جو صدیوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہیں ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ ان الفاظ و محاورات کو دوسری زبان کا لباس پہنانا
دراصل ان کو ماحول سے الگ کرنا۔ لٹریچر کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دینا اور علم
انسا کو تباہ کر دینا ہے۔ شائستہ زندگی میں لٹریچر کے غائب ہو جانے کے بعد کیا باقی رہتا ہے؟ اس
کا اہلِ نظر خود فیصلہ کریں گے۔

یہ امر محتاج دلائل و ثبوت نہیں کہ اردو زبان کی ضروریات رومن۔ ہندی۔ یا لاطینی طرز
تحریر سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اخباروں کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے اپنے یہاں رسم الخط
تبدیل کر کے لاطینی طرز تحریر اختیار کیا ہے۔ اس تبدیلی کی تفصیل سے ہم ناواقف ہیں۔ ان جملہ امور
کے جانے ہوئے بغیر ہمارے لیے ان کے اس فیصلہ کے متعلق کسی قسم کی رائے قائم کرنا غلطی ہے علاوہ
بریں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ترک ایک خود مختار قوم ہے ان کے اوپر کوئی غیر قوم حکمراں نہیں۔ ان کا
رہنما ایک ایسا شخص ہے جو اس وقت ساری دنیا میں معزز و ممتاز اور اپنے ملک میں اس درجہ ہر
دلعزیز ہے کہ جس کی مثال دنیا میں کم ملتی ہے۔ اس کے احسانات سے قوم اتنی گراں بار ہے کہ اس کا کوئی
فیصلہ بنائے مخاصمت نہیں بن سکتا۔ ترکوں نے ہر خیال یعنی مذہب وملت تک کو حب الوطنی اور
استحکام قومیت کے خیال پر قربان کر دیا ہے برخلاف اسکے ہمارے یہاں کا کیا حال ہے عظیم بہ صدہا ہزار ان مذاہب ہیں جو ہر
لمحہ رسوم و رواج کی بنا پر ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے ہیں سیاسی امور میں جتنے کارکن ملک کے سب لیڈر ہیں اور
لیڈر بھی مختلف مذاہب کے جنکے دلمیں حب الوطنی کے خیال نے ابھی تک اتنا گھر نہیں کیا کہ وہ اکم مذہب کے مقابلہ میں
ملک کے سیاسی مفاد کو مدنظر رکھ سکیں ایسی فضا میں قائد اعظم مصطفےٰ کمال پاشا کے احکامات کا اتباع
ہم پر کسی طرح لازم نہیں ہو سکتا قبل اس کے کہ ترکی کے طرز عمل کی پیروی کریں وہاں کا سا ماحول پیدا
کر لینا ضروری ہے۔ تاکہ تبدیلی مزید اعتراضات کا باعث نہ ہے۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا کے بیشتر ممالک جو ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ یعنی انگلستان
امریکہ، فرانس۔ جرمن۔ روس۔ وغیرہ وغیرہ نے اب تک موروثی رسم الخط کو تبدیل کرنے کا خیال نہیں
کیا ان سب ممالک میں حروف تہجی علم الاصوات پر مبنی نہیں ہیں۔ ابتدائی تعلیم میں اس کے باعث
جو دقتیں رونما ہوتی تھیں اس کا انھیں پورا احساس تھا۔ چنانچہ بجائے رسم الخط کی تبدیلی اور
صدیوں کے اندوختہ لٹریچر کو برباد کرنے کے انھوں نے دقتوں کے خیال کو پیش نظر رکھ کر ایسے
طریقے ایجاد کیے ہیں کہ جن کی امداد سے جملہ مشکلیں رفع ہو گئیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دیگر تدابیر سے
ہماری زبان کی تعلیمی دقتیں رفع ہو سکتیں ہیں یا نہیں۔

۳۔ اردو طرز تعلیم اب تک پرانے اور بوسیدہ طریقہ پر رائج ہے۔ ہمارے ملک میں اب تک کوئی علمی
اور سائنٹیفک کوشش سہولت پیدا کرنے کی نہیں کی گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ حروف تہجی کی تعلیم دو طریقوں
پر ہو سکتی ہے یعنی تحلیلی ANALYTICAL و ترکیبی SYNTHETICAL ترکیبی طریقہ تعلیم

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہ ہی طریقہ ہے جو ابتدائے تاریخ تعلیم سے اب تک جاری رہا۔

اس طریقہ میں تعلیم کا آغاز حروف تہجی کے سکھلانے سے ہوتا ہے۔ سب سے پہلے بچہ یا طالب علم کو حروف یاد کرائے جاتے ہیں حروف کی صورت اور ان کے مفہوم کے یاد ہو جانے کے بعد دو یا زیادہ حروف ملائے جاتے ہیں اور انکی آواز ذہن نشین کرائی جاتی ہے۔ اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد الفاظ تک نوبت آتی ہے۔ الفاظ کے بعد جملے اور اسکے بعد عبارت کا پڑھنا سکھلایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ طریقہ فلسفی سائینٹفک اور فطرتی اصول کے خلاف ہے۔ انسان کا سارا علم تجربات پر مبنی ہے۔ جو واقعہ اس کے احساسات کے روبرو آتا ہے اس کا نقش صفحۂ شعور پر ثبت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو نیا واقعہ پیش آتا ہے انسانی فطرت گذشتہ تجربات سے چند مقتدبہ اصول کے تحت میں اس کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور بعدہٗ صفحۂ شعور پر اس کا بھی اندراج ہو جاتا ہے۔ اس طرح ہر ایک تجربہ جو صفحۂ شعور پر موجود ہے دیگر آیندہ تجربات کے حل کرنے اور اس کے اندراج میں مدد کرتا ہے اور اس طریقہ پر انسانی علم کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر نامعلوم شے یا واقعہ کا علم معلوم شدہ واقعات و اشیا کی بنا پر انسانی صفحۂ شعور پر قائم ہو جاتا ہے اور ایک نئی اور نامعلوم شے و واقعہ معلوم شدہ واقعات و اشیا سے حل ہوتے ہیں۔ مندرجہ بالا طریقہ تعلیم اس کے برعکس ہے۔ یعنی نامعلوم شے کے ذریعہ سے جانی ہوئی شے سکھائی جاتی ہے۔ بچہ کو جس وقت حروف تہجی سکھائے جاتے ہیں وہ ان سے بالکل غیر مانوس اور ان کے مفہوم سے ناواقف ہوتا ہے چنانچہ الف۔ الفا۔ اے۔ کے معنی ہے۔ بیٹا۔ بی کے معنی ب۔ اسکے سمجھ میں نہیں آتے اور طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ گذشتہ تجربات اور موجودہ علم سے اس کو مدد نہیں ملتی جس کی وجہ سے دلچسپی کا جزو جو توجہ مبذول کرانے کا واحد ذریعہ ہے مفقود ہوتا ہے۔ بچہ محض مشین کی طرح حروف رٹ کر یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کی باعث اس کی قوت تحقیقات پر مضر اثر پڑتا ہے۔ اور وقت ضایع ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کے توضیح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ توجہ کے ذریعہ سے قواے دماغی نشو و نما ہوتا ہے۔ کوئی طریقہ تعلیم جس میں توجہ کے ماؤف ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ انسان کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ زندہ اقوام یورپ اور امریکہ نے ان دقتوں کو محسوس کر کے مختلف طریقے جاری کئے جو اس مشکل کو رفع کرتے ہیں۔

مختلف تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر حروف تہجی سے شروع کرنے کے بجائے الفاظ یا جملوں سے جن سے طالب علم واقف ہوتا ہے، تعلیم کی ابتدا کی جائے تو اس قسم کی کوئی دقت جس کا تذکرہ کیا گیا ہے باقی نہیں رہتی۔ جملوں سے تعلیم کو شروع کرنا اور پھر ان کو تشریح کر کے الفاظ اور حروف تک پہونچنا ہمارے ملک کی تعلیمی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت مشکل ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

یہ ان ماہرین فن کے امکان میں ہے جنھوں نے عمر کا معتد بہ حصہ علم تعلیم کے حاصل کرنے اور بچوں کے دماغی حالات کی تحقیقات میں صرف کیا ہے ایسے آدمی ہمارے ملک میں معدوم ہیں۔ علاوہ بریں بدلے ہوئے حروف کے سکھانے اور ان کی تشریح میں بھی دقت ہوگی۔

راقم الحروف ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ عرض کر سکتا ہے کہ اگر تعلیم کی ابتدا الفاظ سے کیجائے تو یہ دقت رفع ہو سکتی ہے، میں نے اپنے دو چھوٹے بچوں اور ایک ملازم کی تعلیم اسی طرح شروع کی اور تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ جن دقتوں کی بنا پر رسم الخط کی تبدیلی کا خیال کیا جاتا ہے وہ بغیر تبدیلی کے آسانی سے رفع ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ طریقہ تعلیم میں تبدیلی کر دیجائے۔ میرے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ساڑھے چار سال کا بچہ اردو باآسانی لکھ پڑھ سکتا ہے اور ایک نوعمر ہندوستانی کو اردو سکھلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ دو تین ہفتہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

چونکہ اس طریقۂ تعلیم کی تشریح ہمارے موضوع سے باہر ہے، لہذا نظر انداز کی جاتی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

مثنوی کا پرانا اور نیا انداز

زمانہ جولائی ۱۹۳۹ء کا ایک پیراگراف۔

مثنوی کے لیے واقعہ نگاری بھی ایک بڑا وصف ہے جس کا کمال یہ ہے کہ جس چیز کا بیان کیا جائے اس طرح کیا جائے جس طرح ایک ماہر فن کرتا ہے یعنی اس کی تمام اصلی خصوصیتیں بیان کی جائیں۔ اکثر شعرا جب دو پہلوانوں کی لڑائی باندھتے ہیں تو زمین اور آسمان کو ہلا دیتے ہیں لیکن یہ نہیں بیان کرتے کہ دونوں کس طرح بڑھے، کیونکر وار کیا اور کیا کیا داؤں پیچ کئے۔ تلوار کے کیا کیا ہاتھ نکالے، نیزے کے بند کیونکر باندھے، کمان کیونکر چڑھائی، تیر کس طرح جوڑا، ڈھال کیونکر سر پر لی وغیرہ وغیرہ۔ شاعر جب کسی بات کو واقعہ کی حیثیت سے لکھے تو اگرچہ وہ فرضی ہو لیکن اس کا فرض ہے کہ بیان میں کوئی ایسی بات نہ آئے جس سے واقعہ ناممکن یا مشکوک ہو جائے۔ یہ نقص مختلف اسباب سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی تو جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے حقیقتاً ناممکن ہوتا ہے مثلاً یہ واقعہ کہ جب رستم چلتا تھا تو گھٹنوں تک زمین میں دھنس جاتا تھا۔ کسی خاص موقع پر ایسا ہونا ناممکن نہ ہو لیکن قوت کی زیادتی اور زور کی وجہ سے ناممکن معلوم ہوتا ہے یا مثلاً یہ واقعہ کہ کیکاؤس نے عقابوں کے ذریعہ آسمان پر چڑھنا چاہا۔ کیکاؤس کے جو حالات اور واقعات مذکور ہیں ان سے وہ اس قدر احمق ثابت نہیں ہوتا کہ ایسی بیہودہ کوشش کا ارادہ کرتا۔ غرض واقعہ نگار کا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ واقعے کو اس صورت میں ظاہر کرے کہ دل میں اتر جائے۔

احسن مارہروی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شاعری اور خود ستائی

حامد اللہ افسر بی اے

زمانہ نومبر ۱۹۳۰

شاعری میں خود ستائی کا رواج اس قدر عام ہے کہ اخلاقیات کے احاطہ میں کبھی اسکو معائب کی فہرست میں داخل نہیں سمجھا جاتا اور فن شعر کے دربار میں تو اس کا شمار محاسن میں ہونے لگا ہے۔ شعراء کی خود ستائی اصل میں شعر کی قدر اور شعراء کی عزت و وقعت سے شروع ہوئی، اچھے شعر پر ہر خاص و عام کا متاثر ہونا اور صاحب شعر کی تعریف و توصیف کرنا رفتہ رفتہ اس حد کو پہنچ گیا کہ شاعر محض اس لیے کہ وہ شاعر ہیں خود کو تعریف و توصیف کا مستحق سمجھنے لگے اور جب ان کے نزدیک ان کے اشعار کی کماحقہ داد نہ ملی تو انھوں نے یہ فرض بطور خود انجام دینا شروع کر دیا، اس کے علاوہ دوسرے ہمعصر شعراء سے مقابلہ بھی شعراء کی "تعلّی" کا بڑا سبب ہوا۔ یہ امر شبہے سے خالی نہیں کہ حریف کا مقابلہ فنون لطیفہ میں یا حقیقی تخلیقی ادب کی پیداوار میں کچھ مفید ثابت ہوا ہے، لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اشعار میں تعلّی کا اظہار ایک بڑی حد تک حریفانہ تقابل کا ممنون منت ہے۔

مبالغہ ایشیائی شاعری کا زیور ہے تعلّی کے خدوخال کو بھی دل کھولکر اس زیور سے سجایا گیا اور پھر ایسا سجایا گیا کہ دیکھنے والے مبہوت رہ گئے۔

عرفی کہتا ہے:-

منم آں سحر بیاں کز مددِ طبع سلیم — نبرد ناطقہ نام سخنم بے تعظیم
منم آں بحر لباب ز معانی کہ بود — قطرۂ آب ز شرم سخنم دُرِّ یتیم
گر بہ بادِ سخنم عود بر آتش مانند — حشر اصوات شود ہر طرف از نشرِ نسیم
فوج فوج است معانی بدلم در پرواز — ہمچو مرغانِ اولی اجنحہ در باغ نعیم
غنچہ از نسبت سحباں بہ سخن عار کند — گر کنم طرزِ سخن بادِ صبا را تعلیم

فیضی اپنی مشہور مثنوی "نل دمن" میں کہتا ہے:-

بانگ قلمم دریں شبِ تار — بس معنیِ خفتہ کرد بیدار
گر بد گہرے دمے کشد طعن — معنی زندش طمانچہ بر لعن
کلکم ز صریرِ [illegible] — طغرا کشِ قادر الکلامی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

فخر الحکما نمط جبینم — ختم الشعراء گلِ نگینم
بکشود کلید آسمانی — در فکرت من در معانی
طرز دگراں وداع کردم — طرز دگر اختراع کردم
زگنبد چرخ بر صد ایم — ششش مجلس کون بر نوایم
ایں نغمہ فسونِ ہر زبان نیست — ایں زمزمہ سحرِ ہر بیاں نیست
زیں نکتہ کہ دلپذیر دارم — صد بتکدہ در ضمیر دارم

ناصر علی سرہندی اپنی مثنوی میں اس قدر آگے نکل گئے کہ شاید مولویوں کا طبقہ تو انھیں کبھی معاف نہ کرے گا۔

سخن را آفریدم جان دمیدم — بہ اقرارِ خدائی برگزیدم
الست سر زد از من او بلیٰ گفت — منم یا عبداد یا ربّنا گفت

تخیل کی اس بے لگام روش کا ایک سبب خود اپنی شاعری پر ضرورت سے زیادہ ایمان اور اعتقاد بھی ہے، تخیل اور جذبہ جس پر شعر کی بنیاد ہوتی ہے اس قدر غیر محدود اور غیر معین ہے کہ اس کے کسی جزو کا غیر مکمل طور پر بھی الفاظ میں ادا ہو جانا ایک ایسی کامیابی ہے جس پر فخر کرنا ایک حد تک خلافِ فطرت نہیں ہے، انسان اگر کوئی ایسی مہم سر کرے جس پر قابو طلب ہونا اس کے نزدیک اس کے دوسرے ہم جنسوں کے لیے مشکل ہو تو اس کا فخر کرنا حق بجانب ہے بشرطیکہ اس کا اثر اسکے عام اخلاق پر نہ پڑے، لیکن اس امر کا فیصلہ کہ شاعر حقیقت میں کسی اچھوتے خیال کو مؤثر طریقہ پر الفاظ میں ادا کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں خود شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جس خیال کو وہ اچھوتا اور نادر سمجھ رہا ہو وہ پامال ہو اور جس طرز ادا کو وہ ایک خاص وقت میں کسی خاص کیفیت کے زیر اثر بہت مؤثر سمجھتا ہو وہ دوسروں کے لیے اپنے اندر کوئی کشش یا کوئی جذب اور کوئی اثر نہ رکھتا ہو، یا ممکن ہے کہ خیال بھی نادر ہو اور نظم بھی اچھی طرح ہوا ہو لیکن پھر بھی شعر عام احساسات سے متعلق نہ ہو اور سوائے شاعر کے بہت ہی کم لوگ اس سے کیف اندوز ہوتے ہوں، اس حالت میں اگر شاعر کو اپنے اس شعر پر فخر ہے تو اس فخر کا وہ مستحق نہیں ہے اور کیونکہ زیادہ یہی صورت نمایاں ہوتی ہے اس لیے اس کا اثر اخلاقی حیثیت سے اچھا نہیں پڑتا۔

اردو زبان کے شعراء میں اپنے کلام کے متعلق اس قسم کی غلط فہمی کا امکان اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ ہمارے یہاں تنقید بہ حیثیت فن کے قریب قریب معدوم رہی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نہ خود شعراء اپنے کلام کے معائب و محاسن سے آگاہ ہو سکے اور نہ پبلک ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کر سکی اور جب بے لاگ اور صحیح تنقید کا عام طور پر چرچا ہی نہیں ہے تو شعر کی خوبی کا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

انحصار تمام تر مشاعرے کی واہ واہ پر رہ گیا جو عموماً "تحسین ناشناس" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اس حالت میں اگر شاعر کے کسی ایسے شعر پر جو اس کے لیے مایۂ ناز تھا لیکن حقیقت میں اس قابل نہ تھا داد نہیں ملی ہے تو وہ اسے سامعین کی عدم توجہی یا عدم استطاعت سے تعبیر کر سکتا ہے۔ بس اس شعر پر اس کا افتخار گو حقیقت میں بلا استحقاق ہے لیکن خلاف عقل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی غلط فہمی ہنوز باقی ہے۔

ہماری زبان کے شعراء میں تعلّی اور خود ستائی کے رواج کا ایک ذریعہ ہمارے مشاعرے بھی ہوئے ہیں، میں نے دیکھا ہے کہ مشاعروں کی داد سے اچھے خاصے صائب الرائے اصحاب غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شعر کے محاسن کا صحیح اندازہ عموماً مشاعروں میں نہیں ہوتا، اگر شعر واقعی موثر ہو تو مشاعرے کی داد سے شاعر کے احساس افتخار میں جو اضافہ ہوگا وہ گو بعض اوقات ضرورت سے زیادہ سہی لیکن حق بجانب ہوگا۔ لیکن اگر شعر اس قابل نہیں ہے (اور عموماً نہیں ہوتا) تو اس شعر پر شاعر کا فخر، جو ممکن ہے محض مشاعرے کی داد سے ظہور میں آیا، جو غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کا اثر اس کے اخلاق پر ہرگز اچھا نہ پڑے گا۔

مشاعرے کی دلچسپی اور رونق کا دار و مدار جس قدر اشعار پر ہے اسی قدر "داد" پر بھی ہے اگر مشاعرہ میں اشعار پر داد نہ دی جائے تو وہ مشاعرہ نہیں رہتا کچھ اور بن جاتا ہے۔ شعر کا اثر قبول کرنے کے بعد بے اختیار زبان سے کلمات تعریف و تحسین نکل جاتے ہیں یہی داد ہے لیکن ہمارے بعض شعراء کی خود پرستی سامعین کے اس آزادانہ اظہار تحسین کو بھی جبر کے حدود میں کھینچ لائی، شاعر کا بار بار اس طرح داد کا مطالبہ کرنا جیسے کوئی قرضخواہ قرضدار سے اپنا روپیہ طلب کرتا ہے اس درجہ عام ہو گیا ہے کہ باوجود عجیب ہونے کے ہمارے کانوں کو برا نہیں معلوم ہوتا، میں نے تو ایک مشاعرے میں ایک معمر شاعر صاحب کو دوسرے شاعر سے یہاں تک کہتے سنا ہے کہ "بھائی داد لو اور داد دو" من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو، کی اس سے زیادہ اور کیا عملی تفسیر ہو سکتی ہے، ایک صاحب جو افسوس کہ اب بقید حیات نہیں ہیں سامعین کو قسمیں دلا دلا کر داد "وصول" کیا کرتے تھے، ہماری زبان کے شعراء میں بدقسمتی سے ایسے لوگوں کی کثرت ہے جن کی علمی قابلیت نہ ہونے کے برابر ہے، ایسے لوگوں پر مشاعرے کی داد کا اور بھی زیادہ برا اثر پڑتا ہے اور انھیں اپنی قابلیت کے متعلق خطرناک غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی خود ستائی جو ہمیشہ مغالطہ کا نتیجہ ہوتی ہے ان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔

خود ستائی اخلاقی حیثیت سے ہمیشہ مذموم ہے اور اس کا شمار بری خصلتوں میں ہوتا ہے شعراء میں مبالغہ کے ساتھ شامل ہو کر اس کا برا اثر اور زیادہ ہو جاتا ہے لیکن جو شعراء علم کی دولت کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سرمایہ دار ہیں اور جنھیں خدا نے کشادہ طبعی اور فراخ حوصلگی کی نعمت عطا فرمائی ہے وہ اسے جائز حدود سے نہیں بڑھنے دیتے، لیکن جو ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں ان کے اخلاق و عادات پر اور ان کی روزانہ زندگی پر اس کا نہایت مذموم اثر پڑتا ہے، وہ بد خلق ہو جاتے ہیں، مہذب لوگوں کی صحبت کے قابل نہیں رہتے، مغرور ہو جاتے ہیں، تمکنت اور خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے، ہر شخص سے اپنی تعریف کے متمنی رہتے ہیں اور زندگی کے معمولی معاملات اور واقعات میں تصنع سے خود کو نہیں بچا سکتے۔ شعر کا اعلیٰ مقصد روح کی جلا ہے، جذبات میں لطافت اور حسن پیدا کرتا ہے، دل و دماغ کی کیفیات سے لبریز کر دیتا ہے۔ اور ان سب باتوں کا نتیجہ اخلاق کی بلندی، اطوار و خصائل کی خوبی اور ہمدردی ہے، گویا حقیقی شعر شاعر کو انسانیت کا اعلیٰ نمونہ بنا دینے کا ایک ذریعہ ہونا چاہیئے نہ یہ کہ اس کے اندر بہیمیت پیدا کر دے اور اسے اس قابل نہ رکھے کہ لفظ "انسان" کا اس پر اطلاق ہو سکے۔

⁘ ⁘ ⁘

لکھنؤ اسکول کی شاعری مطبوعہ زمانہ اگست ۱۹۴۱ء کا ایک پیراگراف۔

اصلاح معاشرت اور شاعری:۔ جب سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ شاعری کا کام صرف دل کو بہلانا نہیں بلکہ نوع انسانی کے لیے فائدہ پہونچانا بھی ہے۔ اس وقت سے کئی شاعروں نے معاشرتی اصلاح پر دھیان دینا بھی شروع کیا ہے۔ معاشرت کی اصلاح اسی فلسفہ کے ماتحت کی جا سکتی ہے جو سوسائٹی کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہو۔ اگر معاشرت میں اصلاح کی جگہ انقلاب پیش نظر ہو تو شاعر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سماج کے مروج فلسفہ کی پابندی کرے۔ وہ آزاد ہے کہ جس فلسفہ کی چاہے تلقین کرے۔ ہندوستانی شعرا میں عام طور سے یہ ہمت مفقود رہی ہے۔ اِدھر سات آٹھ برس سے البتہ زمانہ کی بدلی ہوئی ہوا نے انھیں کچھ جری بنا دیا ہے مگر اب بھی ان میں پوری طور پر جرأت نہیں آئی ہے۔ وہ ایک مستثنیات ضرور ہیں مگر اس سے کوئی عام قاعدہ نہیں بن سکتا۔

معاشرتی اصلاح کا بیڑا سب سے پہلے حالی اور آزاد نے شعر کے ذریعہ اٹھایا تھا۔ ان کا میدان عمل بہت تنگ تھا۔ رفتہ رفتہ متاخرین اس دائرہ کو وسیع کرتے گئے اور چکبست کے زمانے تک گویا رُت ہی بدل چکی تھی۔

سید علی جواد زیدی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شیخ و برہمن

ڈاکٹر اعظم کریوی سابق مدیر "اکسیر" الہ آباد

زمانہ، اگست سنہ ۱۹۳۱ء

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کی دوستی صرف ان کے گاؤں کچھنا ہی میں نہیں بلکہ دور دور تک مشہور تھی۔ شیخ جی کے پاؤں میں کانٹا چبھتا تو پنڈت جی کے دل پر چوٹ لگتی اور اگر پنڈت جی کو کوئی تکلیف ہوتی تو شیخ جی بے چین ہو جاتے۔ جب تک دونوں آپس میں مشورہ نہ کر لیتے کسی کام میں ہاتھ نہ لگاتے۔ پنڈت جی کے یہاں جب ست نرائن کی کتھا ہوتی تو شیخ منیر کے ہاتھ میں سارا انتظام رہتا اور شیخ منیر کے یہاں میلاد شریف کی مجلس ہوتی تو پنڈت جی انتظام کرتے۔ گھر بھی دونوں کا ملا ہوا تھا سامنے ایک نیم کا درخت تھا اسی کے نیچے چبوترہ پر دونوں کی نشست رہا کرتی۔ رات کو گاؤں کے اور دو چار کسان وہاں آ جاتے اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ صبح کے وقت گاؤں کے اکھاڑے میں پہونچ جاتے دونوں اکھاڑے کے خلیفہ تھے۔ جوانی میں بڑی بڑی کشتیاں ماری تھیں لیکن اب ضعیفی کا عالم تھا شاگردوں کو کشتیاں لڑاتے اور داؤں پیچ بتاتے تھے۔ کبھی دل میں آ جاتا تو زور بھی کرا دیتے۔ جب کہیں دنگل ہوتا تو شاگردوں کے ساتھ ضرور جاتے ان کے دم قدم کی برکت سے کچھنا کے پہلوان جس دنگل میں گئے فتح مند واپس آئے۔ شیخ جی اور پنڈت جی کا شمار گاؤں کے بڑے کاشتکاروں میں تھا، دونوں کے پاس اتنی موروثی کاشتکاری تھی کہ بخوبی بسر اوقات ہو جاتی تھی۔ مختلف مذاہب کے پیرو ہوتے ہوئے بھی ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ وہ پریم کے پجاری تھے محبت نے ان کے دلوں سے شیخ و برہمن کی تفریق دور کر دی تھی۔ ظاہر میں وہ دو لیکن باطن میں ایک تھے، اسے اتفاق سمجھئے یا خدا کی قدرت کہ دونوں کی صرف ایک ایک ہی اولاد ہوئی۔ شیخ جمن اور جٹا شنکر بھی اپنے والدین کی طرح آپس میں لنگوٹیا یار تھے۔ دونوں ایک ساتھ ہی اٹھتے، بیٹھتے، کھیلتے کودتے۔ شیخ جمن کی شادی میں پنڈت دیا شنکر اور جٹا شنکر کے بیاہ میں شیخ منیر گواہ بنے تھے۔ غرض جب تک پنڈت جی اور شیخ جی زندہ رہے ایک جان اور دو قالب بنے رہے اور مرے بھی تو اتفاق سے ایک ہی ماہ میں۔ پہلے پنڈت جی مرگباش ہوئے ان کے پیچھے شیخ جی بھی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

(۲)

شیخ منیر اور پنڈت دیا شنکر کے مرنے کے بعد ایک سال تک دونوں گھروں کے تعلقات بدستور رہے۔ لیکن جب پنڈت دیا شنکر کی برسی ہوئی اور جٹا شنکر نے خلافِ معمول شیخ جمن سے کوئی مشورہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نہ لیا تو اس کو بہت ناگوار گذرا۔ برسی میں جو ست نرائن کی کتھا ہوئی اس میں کبھی جٹا شنکر نے شہر سے کسی نئے پرچارک کو بلایا۔ پرچارک جی بزعم خود جوشیلے اور قوم پرست واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے کتھا کے بعد بات چیت میں سنگھٹن پر خاص طور پر زور دیا اور دانستہ یا نادانستہ کچھ مسلمانوں کے خلاف بھی کہہ ڈالا شیخ جمن کتھا میں موجود تھے۔ ان کے لیے یہ نئی بات تھی۔ بچپن ہی سے ان کے تعلقات ہندوں سے خصوصاً جٹا شنکر سے برادرانہ تھے۔ اگر سنگھٹن کے علاوہ پرچارک جی مسلمانوں کے خلاف کچھ نہ کہتے تو کوئی اعتراض کا موقع نہ تھا۔ جمن پڑھا نہ لکھا اجڈ گنوار تھا، اس نے سمجھا کہ یہ سب جٹا شنکر ہی کے اشارہ سے ہوا ہے ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب ست نرائن کی کتھا ختم ہو جاتی تو جمن بھی پرشاد لے کر اپنے گھر جایا کرتا تھے۔ لیکن اس مرتبہ کتھا ختم ہوتے ہی پرشاد لیے بغیر شیخ جمن منہ لٹکائے گھر واپس ہوئے۔ ان کو واپس جاتے دیکھ کر جٹا شنکر کی ماں نے کہا" بیٹا! ایسی جلدی کیا ہے ابھی بیٹھو پرشاد لے کر جانا۔

"موسی! مجھے آج گھر پر بہت ضروری کام ہے۔ پرشاد میں لے چکا۔" یہ کہتے ہوئے شیخ جمن نکل گئے اگر جٹا شنکر ان کو روکتے تو ممکن تھا کہ شیخ جمن ٹھہر جاتے، لیکن انس کا موقع ہی نہ ملا کیونکہ جٹا شنکر کسی کام میں مشغول تھے اور انھوں نے شیخ جمن کو جاتے نہیں دیکھا۔

اساڑھ کا مہینہ تھا دونگرہ (پہلی بارش) پڑ چکا تھا۔ جتائی شروع ہو چکی تھی، شام کا وقت تھا کہ شیخ جمن اپنے کندھے پر ہل رکھے ہوئے بیلوں کو ہانکتے اپنے کھیت سے گھر واپس آرہے تھے۔ راہ میں ان کی ملاقات اپنے ایک دوست گھسیٹے خاں سے ہوئی۔ گھسیٹے خاں نے کہا" کہو شیخ جی کل تو تم نے ہندوؤں سے مسلمانوں کو خوب گالیاں دلوائیں"

میں اور مسلمانوں کو گالیاں دلواؤں گا۔ جھوٹ بالکل جھوٹ۔ ہاں کل جٹا شنکر کے یہاں کتھا تھی میں وہاں گیا ضرور تھا۔ وہاں جو کچھ بات چیت ہوئی اس میں میری کیا خطا تھی"

"تمام گاؤں کے مسلمان اس کا الزام تم ہی پر رکھتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے سامنے مسلمانوں کو گالیاں دی گئیں اور تم چپ چاپ سنتے رہے۔ خدا کی قسم میں اگر وہاں موجود ہوتا تو خون کی ندی بہا دیتا۔ لیکن میں ایسی جگہ جانے ہی کیوں لگا۔ ہندوؤں کی کتھا اور ان کی دوستی تمہیں کو مبارک ہو۔ ابھی کیا ہوا ہے اگر جٹا شنکر تمہارا دیوالہ نہ نکال دے تو بات ہی نہیں۔

شیخ جمن خود تو جٹا شنکر سے ناراض تھے لیکن اس وقت تک اتنی عقل رکھتے تھے کہ کسی غیر کی زبان سے جٹا شنکر کی برائی سن نہیں سکتے تھے۔ جل کر بولے، میں خود جٹا شنکر سے سمجھ لوں گا کسی غیر کو میرے معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں"

گھسیٹے خاں نے دیکھا کہ شکار تابو سے باہر ہوا جاتا ہے۔ کہنے لگے" ہاں بھئی جٹا شنکر تمہارا سب کچھ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہے۔ ہیں تو غیر ٹھہرا۔ میں نے بھر پایا اب تم سے کبھی کچھ نہ کہوں گا۔"

دونوں باتیں کرتے ہوئے گاؤں کے قریب پہونچ چکے تھے۔ راہ میں مُلّا کمال مل گئے۔ ملاجی نے پوچھا "کہو یارو! کیا باتیں ہو رہی ہیں؟"

گھسیٹے خاں کو سہارا مل گیا۔ کہنے لگے "کل جٹا شنکر کے یہاں مسلمانوں کو خوب گالیاں دی گئیں۔ شیخ جی وہاں موجود تھے، لیکن چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اسی پر میں نے ان سے کہا تو اُلٹے مجھ ہی سے خفا ہونے لگے۔"

مُلّاجی بولے "اس میں بگڑنے کی کون سی بات تھی۔ جمن کو خدا جانے جٹا شنکر نے کیا گھول کر پلا دیا ہے کہ یہ اُسی کی غلامی میں لگے رہتے ہیں، حالانکہ جٹا شنکر سے کسی بات میں کم نہیں ہیں۔ کیوں گھسیٹے میں سچ کہتا ہوں نا؟"

شیخ جمن کے جواب سے گھسیٹے خاں کچھ مایوس ہو چکے تھے مگر ملاجی کے ساتھ دینے سے ان کا دل بڑھ گیا۔ بولے "اجی ان کے سامنے جٹا شنکر کوئی چیز نہیں، ہر بات میں اُس سے بڑھ کر ہیں مگر ان کو سمجھائے کون۔ جب گاؤں کا کوئی مسلمان کتھا میں شریک نہیں تھا تو ان کو وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ جو مسلمان ہندوؤں کی کتھا سنتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ کیوں ملاجی یہ سچ ہے نا؟"

ملاجی کی دوڑ گاؤں کی مسجد ہی تک تھی، اردو کی پہلی کتاب کبھی ختم نہیں کی تھی کہ ملاجی بن گئے کلام پاک کی دو چار آیتیں طوطے کی طرح رٹ رکھی تھیں جس سے وہ خود کو زبردست عالم سمجھنے لگے تھے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں ان کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام تھا۔ گھسیٹے خاں نے اُن سے فتویٰ مانگا تو دل میں خوش ہو کر فرمانے لگے "ہاں حدیث کی بڑی کتابوں میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ جو کافر سے میل جول رکھتا ہے وہ بھی کافر ہو جاتا ہے۔"

شیخ جمن کا کلیجہ کانپ اٹھا، "آہ مجھے یہ پہلے سے کیوں نہ معلوم تھا، میں نے دھوکا کھایا۔" اس نے بڑی حسرت سے ملاجی سے پوچھا "کیوں ملاجی جو مسلمان پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں وہ بھی ہندوؤں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے کافر ہو جائیں گے؟"

ملاجی نے منہ بنا کر کہا "شرعی معاملات میں دلیل و حجت کی ضرورت نہیں جو کچھ حدیث میں لکھا ہے میں نے بتا دیا، آگے تم جانو تمہارا کام۔"

اب سب شیخ جمن کے دروازہ پر پہنچ چکے تھے۔ شیخ جمن نے ہل کندھے سے اتار کر زمین پر رکھ دیا گھسیٹے خاں اور ملاجی کے لیے چارپائی بچھا دی۔ گھسیٹے خاں نے شیخ جمن سے ہمدردی کرتے ہوئے ملاجی سے پوچھا "بیچارے شیخ جی کو کیا معلوم تھا کہ کتھا سننے سے مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ خیر جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب کوئی ایسی ترکیب بتائیے جس سے یہ پھر پکے مسلمان ہو جائیں۔"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ملاجی نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا" ہاں توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے، کیوں جمن تم اپنے باپ کی برسی کب کروگے؟"

"آج کے آٹھویں دن برسی ہوگی"

"برسی میں میلاد شریف کی محفل بڑی شان سے کرواور وعظ کے لیے شہر سے کوئی مولوی بلاؤ کہنے کو تو میں بھی وعظ کہہ سکتا ہوں لیکن بھائی گاؤں کا معاملہ ہے میں دخل نہیں دینا چاہتا شہر سے جو مولوی صاحب بلائے جائیں وہ بھی اپنے وعظ میں ہندوؤں کی خوب خبر لیں۔ اس طرح سے تم جٹا شنکر سے بدلہ لے لوگے۔ پندرہ بیس روپے کا خرچ ہے لیکن تمہارے لیے یہ معمولی بات ہے"

شیخ جمن نے کہا" خیر روپے کی کوئی فکر نہیں، لیکن میں تو شہر کے کسی مولوی صاحب کو نہیں جانتا۔

ملاجی بولے" اس سے تم بےفکر رہو میں سب انتظام کر لوں گا۔

شیخ جمن جال میں پھنس گئے۔ ملاجی نے انھیں کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ چنانچہ جب شیخ جمن کے یہاں محفل میلاد شریف منعقد ہوئی تو شہر سے ملاجی کسی بڑے مولانا کو بلا لائے۔ انھوں نے اپنے وعظ میں فتویٰ دیدیا کہ ہندوؤں سے ملنا جلنا یا ان سے کسی قسم کا تعلق رکھنا کفر ہے۔ وعظ کہہ کر بڑے مولانا تو واپس تشریف لے گئے مگر جو آگ پنڈت جی کے پرچار سے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی وہ اب مولانا کے وعظ سے یکبارگی بھڑک اٹھی اور گاؤں کا امن خطرہ میں پڑ گیا۔

--:(۳):--

صبح کا وقت تھا پنڈت جٹا شنکر چبوترہ پر بیٹھے لالہ بہاری لال پٹواری اور چھوٹے لال بنیئے سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دور پر شنکر واجپائی زمین پر بیٹھا مونج کی رسی بٹ رہا تھا۔ شیخ جمن اپنے گھر سے نکلے ان کو دیکھ کر جٹا شنکر نے کہا" کہو شیخ جی! ہندوؤں کو گالیاں دلا کر اب تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا؟"

شیخ جمن نے تیوری چڑھا کر جواب دیا" جو جیسا کہے گا ویسا سنے گا۔ وہ دن بھول گئے جب تم نے مسلمانوں کو گالیاں دلائی تھیں۔ سچ ہے میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو"۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا"۔

"دیکھا جائے گا" کہتے ہوئے شیخ جمن آگے بڑھ گئے، چبوترے پر بیٹھے نہیں۔

چھوٹے لال بنیئے نے کہا" شیخ جی تو بہت بگڑے ہوئے ہیں"

پٹواری۔" رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی"!

چھوٹے لال۔" شیخ جی کا کسی سے مقابلہ پڑے گا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شنکرو اچمار نے دیکھا کہ وہی سب سے پیچھے رہا جاتا ہے۔ بول اٹھا" چار بگیھ جمین (زمین) پر اتنا اکڑت (اکڑتے) ہیں۔ کہوں جمیدار ہوت تو ہم لوگن کا کچا کھائے جات (کہیں زمیندار ہوتے تو ہم لوگوں کو کچا کھا جاتے)"

اب جٹا شنکر کی باری تھی، کہنے لگے " پرنتو یہاں پرواہ کس کو ہے۔ گاؤں میں گنتی کے تو مسلمان ہیں۔ ہم چاہیں تو ان کو مار کر بھگا دیں گے " وہ لو بھگوان داس مہاراج بھی آگئے، ان کی رائے بھی لے لو۔

بھگوان داس مہاراج گاؤں کے پروہت تھے۔ انہوں نے جب سارا معاملہ سنا تو کہا۔ ان ملکشوں کا کبھی وشواش نہیں کرنا چاہیئے۔ سب کو ان سے اسہوگ کرنا ہی اچھا ہے۔ پرماتما کرے، سب مسلمان گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائیں "

شنکرو اچمار۔ اچھل پڑا " مہاراج! تم نے بڑی اکول (معقول) بات کہی۔ دھن ہے تمہری بدھی کو کہو مہتو تمہار کا رائے ہے (تمہاری کیا رائے ہے)"

چھوٹے لال بنیئے نے جواب دیا " مدا (لیکن) ہمار انکسان (نقصان) ہوگا "

پٹواری نے سنبھالا " نہیں نہیں تم اس کی کوئی فکر نہ کرو "

آخر کار مہاراج بھگوان داس کی رائے سب نے مان لی اور اسی دن سے گاؤں میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ جہاں کبھی ہندو مسلمان آپس میں برادرانہ تعلقات رکھتے تھے وہاں اب نفاق کا بیج بو دیا گیا۔" شیخ و برہمن " کی جنگ سے پریشان ہو کر امن و امان کی دیوی گاؤں سے رخصت ہو گئی۔

(۴)

ایک دن پنڈت جٹا شنکر کے بیلوں کی چری میں شیخ جمن کی مرغی چلی گئی۔ جٹا شنکر نے ڈھیلا مارا، جمن نے دیکھ لیا، پہلے ڈھیلے کا کیا ذکر اگر جٹا شنکر مرغی کو جان سے بھی مار ڈالتے تو شیخ جی کو کوئی صدمہ نہ ہوتا لیکن اب تو لاگ ڈانٹ تھی۔ جمن نے سوچا کہ جٹا شنکر نے جان بوجھ کر ان کی مرغی کو ڈھیلا مارا ہے۔ بگڑ کر بولے " تم نے میری مرغی کو ڈھیلا کیوں مارا؟"

" ہمار انقصان کرے گی تو ہم ضرور ماریں گے "

" آئے کہیں کے بڑے مارنے والے' اب مارو تو بتائیں "

" اچھا یہ بات ہے تو اپنی مرغی بھیج کر دیکھ لو "

" اب اس ضد پر تو میری مرغی ضرور جائے گی' میں بھی دیکھوں گا کہ کون مائی کا لال میری مرغی کو مارتا ہے "

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"شیخ جی، بس زیادہ نہ بڑھو، زبان سنبھال کر بات کرو نہیں تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ تمہاری مرغیاں میرا نقصان کریں اور اگر میں کچھ کہوں تم بجائے شرمندہ ہونے کے الٹا مجھے آنکھیں نہ دکھاتے ہو۔"

"تم کو کچھ کہنا تھا تو مجھ سے کہتے۔ میری مرغی کو مارنے والے تم کون ہوتے ہو، میں تم سے دبنے والا آسامی نہیں ہوں، تم ایک کہو گے تو میں ہزار کہونگا، تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں سمجھا، مجھ سے زیادہ بولوگے تو ساری شیخی خاک میں ملادوں گا۔"

"آہا چیونٹی چلی ہیڑا ئیچ" تمہاری یہ مجال کہ مجھ سے آنکھ ملاؤ، اچھا آؤ بس اب دیر کیا ہے لاٹھی لے کر آجاؤ۔ آج ہی ہمارا اور تمہارا فیصلہ ہوجائے" یہ کہہ کر شیخ جمن گھر سے لاٹھی لینے کے لیے دوڑے ماں نے گھبرا کر پوچھا کیا معاملہ ہے جمن نے غصہ میں کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر بھی جب جٹا شنکر گھر سے لاٹھی لے کر باہر نکلنے لگے تو ان کی ماں نے لڑکا کو روکا مگر وہ بھی بغیر کچھ کہے جلدی سے باہر آگئے۔

اس اثنا میں گاؤں کے اور بھی ہندو مسلمان جمع ہوگئے تھے مسلمانوں نے شیخ جی کا ساتھ دیا اور کہا۔ شیخ جی گھبرانا نہیں ہم سب تمہارے ساتھ ہیں، اگر آج تم دب گئے تو اتنا سمجھ لینا کہ پھر ہندو ہمارا گاؤں میں رہنا دشوار کر دیں گے۔ دوسری جانب ہندوؤں نے جٹا شنکر کو ابھارا "خبردار مسلمانوں سے دبنا نہیں۔ اکڑے رہو۔"

دونوں جانب کے گہار بھرنے مارنے کو تیار ہوگئے۔ اب یہ جٹا شنکر اور شیخ جمن کی لڑائی نہ تھی بلکہ شیخ و برہمن کی جنگ تھی۔ گاؤں میں زمینداروں کا ظلم برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لگان کی وصولیابی کے وقت کارندوں کی مار پھٹکار سہی جاسکتی ہے، پیادوں کی گالیاں کھائی جاسکتی ہیں، حاکم پرگنہ کی بیگار میں کوئی عذر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس وقت شیخ و برہمن کا سوال پیدا ہوگیا تو فاقہ کش ہندو مسلم کسان اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ مگر اس جنگ میں نہ تو کتھا والے پرچارک اور نہ میلاد شریف والے مولانا شریک تھے۔ اس وقت بھس میں چنگاری ڈال کر وہ دور سے تماشا دیکھنے والوں میں بھی نہیں تھے۔ فریقین جوشِ غضب میں پاگل ہو رہے تھے انجام کی کسی کو کوئی فکر نہ تھی، ہندوؤں نے "جے، جے" اور مسلمانوں نے "اللہ اکبر" کا نعرہ مارا دونوں جانب کے سردار شیخ جمن اور پنڈت جٹا شنکر سب سے پہلے لاٹھی سنبھال کر آگے بڑھے، قریب تھا کہ دونوں جانب سے لاٹھیاں چل جائیں کہ اسی وقت جٹا شنکر اور شیخ جمن کی مائیں دوڑتی ہوئی آئیں اور دونوں کے درمیان کھڑی ہوگئیں۔ جوش پر آیا ہوا دریا تھم گیا، اٹھی ہوئی لاٹھیاں جھک گئیں۔

جمن کی ماں نے اپنے لڑکے جٹا شنکر کو مخاطب کر کے کہا "تو میرے جیتے جی جمن پر لاٹھی نہیں چلا سکتا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تجھے مارنا ہی ہے تو پہلے اپنی ماں پر لاٹھی چلا، میں جمن کو تجھ سے کم نہیں سمجھتی ہوں۔ وہ بھی میرا بچہ ہے جس کو تو آج مارنے چلا ہے اسی کو تیرے پتاجی اپنی جان سے بڑھ کر سمجھتے تھے۔ آج تم دونوں بھائیوں کی لڑائی سے ان کی آتما کو کتنا دکھ پہونچ رہا ہوگا۔ ہائے وہ میل ملاپ کے دن کیا ہوئے، تیری تو عقل ماری گئی ہے، تو دوسروں کے بہکانے میں آگیا ہے، مسلمان برسوں سے اس گاؤں میں رہتے چلے آئے ہیں انھوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے، ان سے لڑائی مول لینا اچھا نہیں۔ آپس کی لڑائی سے سارا گاؤں تباہ ہوجائے گا۔ جنھیں تو اپنا دوست سمجھتا ہے وہ وقت پڑنے پر تیرا ساتھ نہ دیں گے۔ فوجداری سے جیو ہتھیا ہوگی، اس کا پاپ کس پر پڑے گا؟ ادھر تو مہاراجن جٹا شنکر کو سمجھا رہی تھیں اور ادھر شیخ جمن کی ماں جمن کو لعنت ملامت کر رہی تھیں" میں جٹا شنکر پر ہرگز کوئی آنچ نہ آنے دونگی، وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، میرا کیا میں تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، آج نہ مری کل مری۔ مارنا ہے تو مجھے مار ڈال، میرے خون سے تیرا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ ایک مرغی کے پیچھے تو جٹا شنکر کی جان لینے چلا ہے۔ توبہ! توبہ! جو لوگ چاہتے ہیں کہ تم دونوں بھائیوں کو لڑا کر تماشا دیکھیں ان کی منشا میری زندگی میں پوری نہیں ہوسکتی۔ جب تک مہاراجن اور میں زندہ ہوں اس گھر میں پھوٹ نہیں پڑسکتی"

اتنا کہہ کر وہ مہاراجن کی طرف بڑھیں، دونوں گلے مل کر رونے لگیں، بہت ہی پر اثر اور حسرتناک نظارہ تھا۔ دونوں ماؤں کی محبت آمیز تقریر اور پاک آنسوؤں نے بغض و عناد کے خس و خاشاک کو بہا دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل صاف ہوگئے۔ جٹا شنکر اور شیخ جمن آگے بڑھے اور دونوں گلے مل گئے۔ سب یکبارگی چلا اٹھے۔

"ہندو مسلمان کی جے"

✣ ✣ ✣

۱۔ مرگ بے ہنگام ایشور کی سب سے بڑی بے رحمی ہے۔ یہ مصیبت ہمارے اعتقاد کی جڑوں کو ہلا دیتی ہے۔ ہم کو منکر و ملحد بنا دیتی ہے۔ ہم مصیبت کے نظارے آئے دن دیکھا کرتے ہیں اور ان کے عادی ہوجاتے ہیں، لیکن ہماری غم نصیب آنکھیں اس سانحہ کی متحمل نہیں سکتیں۔ بے وقت موت ہمارے دلوں پر مشیت الٰہی کا سب سے قاتل وار اور ہماری خدا پرستی پر سب سے بڑا ستم ہے۔

۲۔ جس طرح روشنی کی شعائیں کسی کثیف شئے سے گزر کر منقلب ہوجاتی ہیں۔ اسی طرح نیک ارادے غیر قومی حکومت کی سخت گیری اور حکام کی خود پروری سے مس ہو کر منقلب ہوجاتی ہیں۔ انصاف اور حق پیروں تلے آجاتا ہے۔ اور فرض اور زعم حکومت سر پر جا پہونچتا ہے۔

زمانہ اکتوبر ۱۹۳۹ء — اقوال پریم چند

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میری شہسواری

مرزا عظیم بیگ چغتائی (بی - اے - ایل - ایل - بی)

زمانہ جنوری ۱۹۳۲ء

حماقت پر حماقت تو میری ملاحظہ ہو! .... میری شادی کو مشکل سے بیس پچیس ہی روز ہوئے ہونگے کہ کمرہ میں آیا تو خانم نے اپنی دانست میں ایک عجیب واقعہ سنایا، کہ ایک دفعہ ایک نہایت شریر گھوڑا لایا گیا جس پر کسی سے چڑھا نہ گیا، بھائی صاحب نے کہا کہ ہم چڑھیں گے اور کوشش بھی انھوں نے بہت کی مگر کامیاب نہ ہوئے بالآخر اس کو ایک چبوترے کے پاس لا کر غڑاپ سے زین پر پھاند پڑے لیکن گھوڑے نے جو ٹاپیں ماریں تو بس دیکھتے ہی بنا، الف ہو گیا، بل کھائے، دولتیاں چلائیں۔ چرخ کھایا اور کیا کیا تلملایا ہے کہ خدا کی پناہ مگر بھائی صاحب نے اسے نہ چھوڑا۔ دیکھنے والے ان کی شہسواری کو دیکھ کے واہ واہ کرنے لگے۔ بالآخر بجلی کی طرح وہ ایک دم سے بنگلہ کی دیوار کود گیا اور انھیں ایسا لے بھاگا کہ لوگ گھبرا اٹھے کہ خدا معلوم کہاں لے جا کر پھینکے۔ غرض سب کے چہرے فق تھے۔ بھابی جان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، نانی اماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں البتہ والد صاحب کھڑے ہنس رہے تھے کہ ایک آدھ گھنٹہ بعد کیا دیکھتے ہیں کہ بھائی صاحب ہنستے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ گھوڑے کو انہوں نے بالکل شل کر دیا تھا۔

میں کیا عرض کروں کہ خانم نے شہسواری کی یہ کیفیت کس طرح بیان کی۔ میرا دل کڑھنے لگا کہ ہائے میں بھی کیوں نہ ایسا شہسوار ہوا، جب چھوٹا تھا تو عموماً ٹٹو پر سوار ہونے کی اپنی باری بھائی صاحب کے ہاتھ ایک پیسہ میں فروخت کر ڈالتا تھا، مجھے کیا معلوم تھا کہ تجارت اور یہ منفعت کچھ کام نہ آئے گی خانم نے یہ تمام کیفیت بیان کر کے مجھ سے میری شہسواری کا حال پوچھا تو میں نے پہلے تو خانم کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اس خیال سے کہ ان کی دل شکنی نہ ہو جائے میں نے کہہ دیا کہ "ہاں مجھے گھوڑے پر چڑھنا آتا ہے"۔ اس کے ساتھ ہی دو تین واقعات بھی سنا ڈالے، گھٹنہ پر چوٹ کے نشان تھے وہ کھا کر دیکھو اسی شوق کی بدولت یہ چوٹیں آئی ہیں ایک دفعہ ایک بدمعاش گھوڑے نے گرا کر زخمی کر دیا تھا، حالانکہ اصل واقعہ تو یہ تھا کہ ایک نالائق کتے نے بھونک بھونک کر مجھے گرا دیا تھا۔

کوئی وجہ نہ تھی کہ خانم میرے جھوٹ کو سچ نہ مان لیتیں، خدا کے فضل سے سارا گھر شہسواری کا دلدادہ تھا۔ والد صاحب کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ وہ اپنی سواری کا گھوڑا کسی کو نہیں دیتے گھر بیٹھے دیکھیے اب صرف یہی گھوڑا رہ گیا تھا اس لیے کہ انھیں سواری کی ضرورت پڑا کرتی تھی۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بہر حال مجھے معلوم تھا کہ نہ کبھی والد صاحب گھوڑا دیں گے اور نہ میری شہسواری کا امتحان ہوگا اگر کبھی ایسا کوئی موقعہ آیا بھی تو اس کو ٹال دینا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

⁂

مجھ سے بھابی جان سے کوئی لڑائی نہیں پھر نہ معلوم کیوں انہوں نے میری شہسواری کے افسانوں کو کہنے ہی نہ دیا، اور میرے لیے ایک مصیبت یہ تھی کہ خانم اکثر میری شہسواری کے قصے سنتیں اور بھابی جان ہنس ہنس کر ان کی پرزور تردید کرنا اپنا فرض سمجھتی تھیں۔ اور خانم کا یہ حال ہو گیا کہ بھابی جان کی تردیدوں کو وہ اپنے دق کرنے اور مذاق اڑانے کا بہانہ تصور کر کے آگ ہو جاتی تھیں۔

ان کے دل میں یہ یقین ہو گیا تھا کہ بھابی جان انھیں اپنے مذاق کا تختہ مشق بنا رہی ہیں۔

میں بھی کس سادگی سے بھابی جان کے منھ پر یہ کہہ دیتا تھا کہ کیوں مذاق کرتی ہو؟ مگر وہ حقیقت سے واقف تھیں۔ ہنسی کے مارے دوہری ہو جاتیں اور آنکھیں پھاڑ کر کہتیں "غضب کرتے ہو! ایسا سفید جھوٹ! آخر یہ جھوٹ کئی دن چلے گا؟ بھائی صاحب اس بارے میں کبھی نہ بولے بلکہ جب ذکر آیا فوراً تسلیم کر لیا کہ میں ان سے کہیں اچھا شہسوار ہوں۔ وہ کچھ اس پیرایہ میں کہ کبھی پتہ نہ چلا کہ مذاق کرتے ہیں یا سچ کہتے ہیں۔ نتیجہ اس بحث مباحثے کا یہ ہوا کہ خانم اور بھابی جان نے شرط بدی، بھابی جان نے یہ شرط کی کہ جس گھوڑے پر میں کہوں اگر بھائی چڑھ لیں تو دس روپیہ ہاروں گی ورنہ تمہیں دینا پڑیں گے۔ خانم نے تیہے میں آکر فوراً یہ شرط پختہ کر لی اس کے بعد دو تین مرتبہ میری شہسواری کے امتحان کا موقعہ آیا لیکن ہر دفعہ بہانہ کر کے ٹال گیا۔ ادھر والد صاحب قبلہ کا یہ حال کہ آئے دن چھانٹ چھانٹ کر بگڑے تگڑے اور بد معاش گھوڑے منگوائے، بہر حال کچھ عرصہ تک میری ٹالم ٹال مزہ سے چلتی رہی۔

بھابی جان تو جانتی ہی تھیں کہ میرے لیے کسی گھوڑے پر چڑھنے کی ہمت کرنا ناممکن ہے۔ انھوں نے ایفائے شرط کے لیے خانم سے موٹی موٹی قسمیں لے رکھی تھیں۔

⁂

میں لحاف میں لیٹا ہوا مزے سے ایک کتاب پڑھ رہا تھا اور سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا کہ آواز آئی "ارے میاں منّن ....."

جلدی سے میں نے سگریٹ دیوار سے رگڑ کر بجھایا اور اٹھ بیٹھا کہ پھر آواز آئی۔

"کیا کر رہے ہو؟ ...."

میں باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ والد صاحب قبلہ اس بلا کی سردی میں صرف ایک قمیص پہنے چبوترہ پر کھڑے ہیں اور سائیس ایک گھوڑا لیے سامنے کھڑا ہے، مجھے دیکھتے ہی والد صاحب نے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہو کر بولے :۔

کہو کیسا گھوڑا ہے ؟

میں نے کہا ، کیا آپ لیں گے ؟

یہی سوچ رہا ہوں ۔ مسکرا کر کہا ۔

میں نے کہا ، "کیا کیجیے گا ضرورت تو نہیں ہے" پھر میں نے سائیس سے کہا کہ لیجاؤ یہاں کسی کو گھوڑا ووڑا نہیں لینا ۔

والد صاحب اس پر ہنس پڑے اور کہنے لگے "میاں ٹھہرو کبھی یے تھوڑی رہے ہیں ، ذرا دیکھنے تو دو" میں نے لاکھ کہا کہ دیکھ کر کیا کیجیے گا مگر وہ کاہے کو مانتے ۔ کہنے لگے "ذرا لیو کھیں ہاتھ پر لیکر دوڑا تو سہی" ۔

اب سائیس تو لگا گھوڑا دوڑانے اور میں نے والد صاحب قبلہ کو لکچر دینا شروع کیا ۔ وجہ دراصل یہ تھی کہ آپ خود ہی غور فرمائیں کہ آپ کے والد یا کسی اور بزرگ کو ساٹھ ستر برس کی عمر میں یہ مرض لگ جائے کہ چلبلا سا گھوڑا اکڑ پائیں تو اچھل کر اس کی پیٹھ پر ہو لیں اور روزانہ دس بارہ میل کا چکر لگا آئیں آپ ہی بتائیے کہ وہ کہاں تک حق بجانب ہوں گے ۔ جب تک ملازمت پر رہے چار چار پانچ پانچ گھوڑے رکھتے رہے جب پنشن ہوئی اور آمدنی میں کمی ہو گئی تو دو ہی ایک پر اکتفا کی مگر ہم لوگوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ صرف محض بے ضرورت اور لغو ہے ۔ کیونکہ بدقسمتی سے ادھر گھوڑا عمر بر آیا اور ادھر انھوں نے اسے الگ کر کے پھر کوئی دوسرا نہایت شریر گھوڑا ڈھونڈھنے لگے ۔ ان باتوں سے مجھے گھوڑے سے نفرت ہی نہیں بغض ہو گیا ہے ، آپ بھی غور فرمائیے کہ کس قدر نالائق جانور ہے ۔ دانہ کھلاؤ ، گھاس کھلاؤ اور موقعہ پا جائے تو لات مار دے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر وہ کون حضرت تھے جنھوں نے گھوڑے ایسے نامعقول جانور کو سواری کے لیے منتخب فرمایا تھا ۔ یہ میں بھی جانتا ہوں کہ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے جب کوئی چیز سواری کو میسر ہی نہ تھی تو گھوڑے کا سواری میں رکھنا حق بجانب تھا ۔ مگر آج کل گھوڑے کی کیا حیثیت رہ گئی ۔ اگر کسی موٹر سائیکل ، ریل ، ٹرام یا کسی دوسری سواری میں یہ بات پیدا ہو جائے کہ ادھر مسافر اس کے قریب آیا اور ادھر اس کا پہیہ ٹوٹ کر مسافر کی پسلی میں لگنے لگے تو وہ کہاں تک سواری کے قابل سمجھی جائے گی ، گھوڑے میں یہ عیب موجود ہے پھر بھی وہ سواری کی تعریف میں داخل ہے ! اگر آپ کی موٹر سائیکل میں ایسا انجن لگا دیا جائے جو آپ کے قبضہ میں نہ ہو اور جب زور پر آئے تو جہاں جی چاہے لے کر چل دے مثلاً اگر آپ اسے سڑک کے بیچ میں چلانا چاہیں اور وہ کنارے کسی کھڈ میں لے جا کر ڈال دے اور روکنے پر بھی نہ رکے تو یہ کوئی سواری ہے ۔ گھوڑے میں یہ سب عیب موجود اور جب کبھی اس کے جی میں آتا ہے تو اس زور سے دوڑتا ہے کہ روکے رکتا ہی نہیں اور آپ کو لیے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھاگا جاتا ہے، اگر آپ زیادہ روکیں اور راس تانیں تو وہ کوشش کرکے آپ کو ہوا میں اچھال دیگا اور گرتے گرتے اوپر سے دو لتی بھی جڑ دے گا اور خود ایسا بے تحاشا بھاگے گا جیسے کوئی ریل چھوٹی جا رہی ہے۔ آپ کہیں گے کہ تم اناڑی سوار کی طرح باتیں کر رہے ہو۔ مجھے یہ نامعقول سواری واقعی پسند نہیں ہے مگر بھائی صاحب کو اکثر گھوڑے سے گرتے دیکھا ہے اور جب کبھی انھوں نے آسن جما کر بیٹھنے کی کوشش کی تو گھوڑے نے دوسری ترکیب نکالی یعنی تھوڑا سا الٹا چلا، گھوما اور پھر الف ہو گیا! والد صاحب قبلہ کی ہدایت ہے کہ جب گھوڑا الف ہو جائے تو آگے کو جھکو۔ یوں راس جھٹکو یوں زین پر جمو وغیرہ وغیرہ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ آخر یہ مصیبت مول ہی کیوں لی جائے۔

بہر حال اگر آپ بے حیائی سے زین پر جمے رہے تو گھوڑا آپ کو الٹا پلٹا کرا اور جھٹکا دے کر نت نئی حرکتیں کرے گا اور اگر خدا نخواستہ کمر کے علاقے بھی تو عجیب شان سے چلے گا، اگر منہ پورب کی طرف ہو گا تو دم پچھم کی طرف ہو گی مگر وہ خود جائے گا دکھن کی طرف! یعنی آڑے آڑے کودتے ہوئے چلے گا۔ والد صاحب فرماتے ہیں کہ اس معصوم کا کوئی قصور نہیں۔ ان کی رائے میں پتہ کھڑکا اور گھوڑے کو بدکنے کا حق حاصل ہو گیا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ والد صاحب نے کسی نہ کسی بہانہ سے اپنے گھوڑے کو علیحدہ کر دیا۔ اور علیحدہ کیا کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے انھیں ڈرا دیا کہ اگر آپ کچھ دنوں کے لیے گھوڑے کی سواری ترک نہ کریں گے تو آپ کے اعضا کو نقصان پہونچے گا۔ بہر حال گھوڑا بھی بڈھا تھا بیچ ڈالا جب تک دوسرا خریدا جائے کوچوان بھی جو تیس برس کا ملازم تھا کہیں چلدیا۔ غرض اس طرح کچھ عرصے تک گھوڑے کی خریداری کی نوبت نہ آئی۔ اور والد صاحب ٹینس میں گھوڑے کی کسر نکالنے لگے، روز جا کر کھیلتے تھے مگر جناب بڑھاپا بری چیز ہے، اڑسٹھ سال کی عمر میں اس قسم کی کود پھاند میں ضرور کسی نہ کسی دن نقصان اٹھانا پڑے گا۔ چنانچہ ایک روز جست وخیز کرنے میں گھٹنے میں چمک پیدا ہو گئی اور دوڑنے کی سکت باقی نہ رہی، اب تانگے پر آنے جانے لگے۔ مگر تانگے والے بھی بڑے باتونی ہوتے ہیں۔ ان سے گھوڑوں کی باتیں ہوتے ہوتے ایک روز گھوڑا لانے کو کہدیا گیا۔ بس پھر کیا تھا وہ بیشتر گھوڑا دکھانے کو لے آیا۔ جب اس کو دوڑایا جا چکا تو مجھے بھی حکم ملا کہ ذرا تم بھی چڑھ کے اس پر ڈکی نکالو۔

یہ نہ جانتے تھے کہ نہ کبھی میں گھوڑے پر چڑھا ہوں اور نہ چڑھ سکتا ہوں، ایسی صورت میں ان کا یہ کہنا کہ لو بھئی اب تم چڑھو محض ایک طنز آمیز اور مزاحیہ فقرہ تھا، بھائی صاحب تو ابھی سو کر بھی نہ اٹھے تھے اور میں بھی حشر تک کمرے سے نہ نکلتا اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ باہر گھوڑا آیا ہوا ہے، مگر اب تو پھنس گیا ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے کی طرف خانم اور بھابی جان بھی کھڑی ہیں۔ دل میں سوچا کہ آج ہی بھانڈا پھوٹا، میں بت کی طرح ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ یہ نازک پوزیشن جلدی ہی نازک تر ہو گئی کیونکہ خانم اور بھابی جان میں نہایت زور وشور سے بحث ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دونوں نے اشارے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے بلایا۔ چار و ناچار جانا پڑا مگر میں گھبرایا ہوا پہونچا۔ دم بھر کے لیے دل کو مضبوط کر کے نہایت لاپروائی کے ساتھ دونوں کی باتیں سننے لگا۔ کس اطمینان اور بھروسے کے ساتھ خانم مجھ سے شرط جیتنے کی فرمائش کر رہی تھیں اور بھابی جان کے چہرہ پر گویا انبساط و شادمانی کا دریا لہریں مار رہا تھا وہ جانتی تھیں کہ میرے فرشتے بھی کبھی گھوڑے پر نہیں چڑھے۔ مگر خانم کا جوش قابل دید تھا وہ خود بھی میری شہسواری کے کرتب دیکھنے کے لیے بیچین تھیں۔

بہر حال خوش و بشاش ہو کر خانم نے مجھے چبوترے پر ڈھکیل دیا اور کہنے لگیں کہ جلدی جاؤ چڑھو اور تھکا کر اس کو شل کر دو، بڑی تیزی دکھا رہا ہے، سب بھول جائے تو بات ہے۔ میں ان الفاظ کو سن کر سمجھا کہ موت کے منہ میں جا رہا ہوں۔ مگر یہ سوچ کر کہ مرنا برحق ہے، خیال کیا کہ چاہے کچھ ہو ایک دفعہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ ہی جاؤں، پھر اس کھینچے رہونگا، چمکارتا رہونگا اور تھوڑی دیر میں روک راک کر کسی نہ کسی بہانہ سے اتر پڑوں گا، یہ خیال کر کے ایک دم سے ہمت کی، مڑ کر خانم کے باغ باغ چہرہ کو دیکھا تو اور بھی ہمت ہو گئی۔ پھر کیا تھا سائیس کو حکم دیا کہ لاؤ جی ادھر لاؤ ادھر؛ والد صاحب دیکھ کر مسکرائے حالانکہ وہ جانتے تھے کہ میں کبھی چڑھا نہیں ہوں مگر میرے لیے گھوڑے کی سواری کو اس قدر ضروری سمجھتے تھے کہ خواہ میں گر کر مر ہی کیوں نہ جاؤں لیکن چڑھوں ضرور، بلکہ گھوڑے سے گر کر مرنے کو وہ شہادت سے کم نہ خیال کرتے تھے۔

خیر جب میں گھوڑے کے قریب پہونچا تو ایسا معلوم ہوا کہ میں میدان جنگ میں کود پڑا۔ گھوڑا کمبخت الگ بگڑ رہا تھا مگر میرے بدن سے جرأت کے فوارے چھوٹ رہے تھے یعنی انتہائی جرأت کے باعث سارے بدن میں پسینہ آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کو چمکارنے کی کوشش کی مگر منہ سے آواز نہ نکل سکی، شاید سردی کی وجہ سے! پھر کپکپائے ہاتھوں سے اُس کی باگ پکڑی۔ گھوڑے کے بائیں طرف کھڑا تھا۔ دل میں خدا کو یاد کر رہا تھا، گھوڑا بدمعاش خواہ مخواہ تھر تھرا رہا تھا، میں بیٹھنے کو ہوا؛ نصرٌ من اللہ کہنے سے مجھ میں ایک دم سے تمام جسم کی روحانی قوت عود کر آئی، پھر یاد آیا کہ ایک روز ایک مولوی صاحب نے وعظ کے دوران میں کہا تھا کہ ہر کسم کو بسم اللہ سے شروع کرنا چاہیئے اور جب کہیں کوئی کام کرنا ہو تو بسم اللہ کہہ کر سیدھا پیر رکھے انشاء اللہ فتح ہوگی۔ چنانچہ بسم اللہ کہہ کر میں نے بھی سیدھا پیر رکاب میں رکھا۔ مگر پیر رکھتے ہی ادھر پیچھے سے والد صاحب اور بھائی صاحب نے بھی (جو اب آگئے تھے) زور سے للکارا اور ہیں! ہیں!! کر کے قہقہہ لگایا۔ میں بیٹھ ہی گیا ہوتا مگر گھوڑا چلدیا لہٰذا مجھے پیر نکالنا پڑا۔

والد صاحب ہنس ہنس کر کہنے لگے کہ تم بالکل گدھے ہو، سیدھا پیر رکھ کر کیا دم کی طرف منہ کر کے بیٹھتے؟ گدھے کہیں کے۔

میں نے اپنی حماقت کو محسوس کیا مگر وادری حاضر جوابی میں نے کہا۔ لاحول ولاقوۃ خواہ مخواہ آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں، میں تو تنگ کو دیکھتا تھا کہ کھسکتا تو نہیں ہے۔"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

انھوں نے کہا۔ اچھا اب چڑھو، جلدی چڑھو۔

میں نے پھر گھوڑے کو چمکارا اور بسم اللہ کہہ کر بایاں پیر اس کی رکاب میں رکھا مگر پیر رکھا ہی تھا کہ وہ پھر چمکا جس پر میں نے جلدی سے پیر نکال لیا، لیکن دم بھر بعد پھر چمکا کر پیر رکھا مگر گھوڑا چل دیا اور پھر پیر نکالنا پڑا۔ تو تین دفعہ یہی ہوا۔ والد صاحب گھڑک کر مجھ سے کہنے لگے، پاؤں میں رکاب مار کے ایک دم سے اچھل کر بیٹھ کیوں نہیں جاتے ہو۔ یہ بھی کوئی بہل گاڑی ہے کہ تمہارے لیے کھڑی رہے گی، بھائی صاحب بھی لپک کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر تم انتظار ہی کیوں کرتے ہو، ہلکے پھلکے آدمی ہو پیر رکھتے ہی بجلی کی طرح چماک کے غڑاپ سے زین پر بیٹھ جاؤ۔

اوہو ہو! اب تو مجھے بھی گر معلوم ہو گیا، لاحول ولا قوۃ میں بھی واقعی عجیب آدمی ہوں۔ یہ خیال کرتے ہی میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ ہٹیے مجھے چڑھنے دیجیئے گا یا نہیں۔ میں یہ سب باتیں جانتا ہوں، میں نے یہ فقرہ زور سے کڑک کر کہا تاکہ خانم بھی سن لیں۔

یہ کہہ کر میں نے کچکچا کر ہونٹھ دبا کر اور جست کرنے کی پوری تیاری کر کے بایاں پاؤں رکاب میں رکھ ہی تو دیا، مگر مشکل سے پیر رکھ پایا تھا کہ تڑپ کر بجلی کی طرح اس پار گرا اور اس طرح اوندھے منہ گرا کہ لگام ہاتھ سے چھوٹ کر پیر میں الجھ گئی۔ ادھر اس موذی گھوڑے نے جو دیکھا کہ میری پیٹھ پر بجلیاں کوند گئیں تو وہ طرارہ بھر کے یہ جا وہ جا، میرا پیر جھٹکے کے ساتھ بلند ہوا اور اس طرح گھوما گویا میں پھرکی ہو گیا۔۔۔۔ میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ گھوڑا بنگلے کے احاطہ کو طے کر کے سر پٹ اڑا جا رہا ہے اور والد صاحب اور بھائی صاحب کا ہنستے ہنستے برا حال ہے، بھابی جان کی کیفیت تو بیان سے باہر۔ مارے ہنسی کے دوہری ہو گئیں، حلق میں پھندا پڑ گیا، آنسو نکل آئے۔ خانم کی حالت البتہ قابل رحم تھی، رنج و یاس کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھیں میں نے کہا، میں دیکھتی کیا ہو۔۔۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ کون گھوڑے پر سے نہیں گرتا۔۔۔۔

خانم کا چہرہ ایک دم سے بشاش ہو گیا۔ بھابی جان کی طنز آمیز تکلیف دہ ہنسی پر وہ بگڑ کھڑی ہوئیں جب ذرا بھابی جان کے ہوش ٹھکانے ہوئے تو ہنسی کو روکتی ہوئی آئیں اور بولیں۔

لاؤ بہن میری شرط کے روپے

واہ، واہ، خانم نے کہا۔ خوب! شرط تم ہاریں یا میں۔

ادھر میں نے کہا کہ اگر اتفاق سے گھوڑا اگڑ کر نکل جائے تو کوئی کیا کرے۔ اس کے بعد میں نے دنیا کے مشہور شہسواروں کے گرنے کے واقعات بیان کرنا شروع کیے۔ اور والد صاحب اور بھائی صاحب کے گرنے کے بھی واقعات بتائے۔ بھابی جان تو کیا قائل ہوتیں ہاں خانم کو البتہ اطمینان ہو گیا اور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دونوں میں بڑے لطف کی حجت ہونے لگی۔ ایک طرف بھابی جان کہتی تھیں کہ میری شرط کے روپے ہار لیئے اور قسمیں کھاتی تھیں، دوسری طرف خانم بھی کہتی رہیں، کہ میری شرط کے روپے تم کو ہضم نہ ہونگے۔

بھابی جان پھر شرط لگانے کو کہتی رہیں مگر میں نے خانم سے کہہ دیا ہے کہ جب تک پہلی شرط کے روپے ادا نہ ہو جائیں تم ہرگز ہرگز شرط نہ بدنا، اور میں دعا مانگتا ہوں کہ خدا نہ کرے بھابی جان کبھی شرط کے روپے ادا کریں۔

بہر صورت میں بھی ایک دفعہ گھوڑے پر چڑھا ہوں، کب اور کس طرح، یہ آپ نے خود دیکھ لیا۔

⁂ ⁂ ⁂

نقد دھرم

زمانہ بابت نومبر و دسمبر ۱۹۰۵ء میں عنوان بالا سے ایک اہم مضمون چھپا تھا جس کے ابتدائی جملے درج ذیل ہیں:

"ویدوں میں لکھا ہے کہ ست ہی کی جے ہوتی ہے، جھوٹ کی کبھی نہیں، یعنی راستی کو آنچ نہیں، دروغ کو فروغ نہیں، جہاں کہیں دنیا میں دولت و اقبال ہے دھرم ہی اس کا سبب ہے، ہندو کہتے ہیں کہ لکشمی وشنو کی استری ہے اور وہ پتی برتا ہے۔ یعنی جہاں وشنو جی یعنی ست، راستی ہوں گے وہیں لکشمی ہوں گی۔ ایشور کو کسی شخص کا لحاظ نہیں۔ اقبال حدود جغرافیہ کا پابند نہیں یعنی کسی مقام پر محدود نہیں۔ جو لوگ یورپ اور امریکہ وغیرہ کی ترقی کو وہاں کی سرد آب و ہوا سے منسوب کرتے ہیں (اور بعض اور ملکوں کی پستی کو وہاں کے حدود اربعہ سے متعلق منسوب کرتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ ابھی ہزار سال نہیں ہوئے انگلستان کے باشندے روما وغیرہ میں بردے اور غلام بنے بکتے تھے۔ آج انگلینڈ اتنے بڑے بڑے ملکوں کا راج کر رہا ہے۔ کیا انگلینڈ اپنے حدود اربعہ سے بھاگ کر کہیں آگے نکل گیا ہے؟ پانسو سال پہلے امریکہ زمین کے اسی موقع پر تھا جہاں آج ہے۔ لیکن اس عرصہ میں وہاں کے باشندوں کی حالت میں تفاوت کا اندازہ لگائیے۔ روما یونان، مصر اور ہسپانیہ وہیں تو ہیں جہاں اس زمانہ میں تھے جبکہ تمام دنیا میں ان کے علم و فضل کی دھاک تھی۔ خوشحالی ملکوں اور انسانوں کا لحاظ نہیں کرتی۔ جو لوگ ست یا راستی پر چلتے ہیں صرف انہیں کی فتح ہوتی ہے اور جب تک ست دھرم پر چلتے رہتے ہیں ان کی جے رہتی ہے"

سوامی رام تیرتھ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سہی

مسٹر سلیم جعفر

زمانہ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء

لفظ "سہی" ابھی تک "شرمندۂ تحقیق" نہیں ہوا ہے، مولوی سید احمد صاحب فرہنگ آصفیہ میں ارقام فرماتے ہیں "اصل میں صحیح تھا" اس حکم و وثوق پر مولوی عبدالحق صاحب پہلے یہ کہہ کر کہ "اس کی اصل صحیح بتائی جاتی ہے"۔ رنگ اشتباہ چڑھاتے پھر ایک اور فقرہ لکھ کر کہ قدیم اردو میں اس لفظ کو صحیح ہی کہتے تھے: خیال کو اس طرف لے جانا چاہتے ہیں کہ ایک سند اس قسم کی ضرور ملتی ہے جس سے اس تحقیق کا درست ہونا خارج از امکان نہیں؛

مستشرقین انگلستان محققین ہندوستان کے ہم خیال نہیں۔ ڈاکٹر صاحب فاربز تو تحقیق سے گریز کرتے ہیں، لیکن ڈاکٹر فالن نے جرات کی ہے ان کا قول ہے کہ یہ "متعلق فعل" ہے۔ اور اس کا ماخذ سنسکرت کا مادہ آس (आस) بہ معنی "ہونا" ہے، مسٹر پلاٹس اپنے "لغت ہندوستانی اور انگریزی" میں لکھتے ہیں کہ "اصل" غالباً ستیم (सत्य) بہ معنی "سچ" ہے۔

لفظی تحقیق بیان فرمانے کے بعد مولوی سید احمد صاحب فرماتے ہیں:-

"یہ لفظ جس قدر موقعوں پر بولا جاتا ہے اگر وہ سب مواقع جتائے اور ان کے واسطے الفاظ بنائے جائیں تو کبھی ہم پورا پورا حق ادا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اہل زبان اسے ایسے بہت سے موقعوں پر استعمال کر جاتے ہیں کہ انھیں اہل زبان ہی بول اور سمجھ سکتا ہے دوسرا شخص اگر بولے تو ضرور دھوکا کھائے گا۔ لہٰذا ہم چند مشہور قریب الفہم مواقع زیادہ تر حضرت غالب کی غزل سے بتا کر آگے چلتے ہیں"۔

اور بطور مشتے نمونہ از خروارے، گیارہ محل استعمال بتاتے ہیں مولوی صاحب کا استنباط و استقرا، غور و فکر سے محض فریب نظر معلوم ہوتا ہے، ممدوح نے اپنے دعویٰ کی تائید میں کچھ روزمرہ کے فقرے اور غالب مرحوم کی ایک غزل پیش کی ہے جو درج ذیل ہیں۔

ٹھیک بجا۔ درست جیسے جو تم کہو سو ہی سہی

(۲) برائے ایجاب۔ قبول۔ منظور۔ تسلیم۔ مانا۔ فرض کیا ع

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہم کبھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

(۳) برائے شرط آ تو سہی۔

(۴) تکمیل فعل کے واسطے جیسے۔ میاں کھاؤ تو سہی، پیچھے تکلف کر لینا
یعنی پہلے کھانا تو کھاؤ (مصرعہ رنگین) اس کو یاں لا تو سہی، سوچ میں بیٹھی ہے کیوں؟
یعنی پہلے تو آ۔

(۵) غنیمت ہے۔ مغتنم ہے۔ بہتر ہے ع

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
یارب چھیڑ چلی جائے اسد — گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۶) تسلی خاطر کے واسطے، یہی سمجھیں گے۔ یونہی جانیں گے ع

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام — دل کے خون کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں — نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تیری عادت ہی سہی

(۷) تاکید کے واسطے۔ حصر تاکید کے لئے ع

کچھ تو دے اے فلک ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

(۸) تسلسل کے واسطے۔ جاری رہے چلے جائے۔ برقرار رہے ع

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

(۹) تاکید کلام کے واسطے۔ مانو۔ جانو۔ خیال کرو ع

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

(۱۰) منظور کرو۔ قبول کرو ع

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

(۱۱) ہرچہ بادا باد۔ کچھ ہی ہو۔ کچھ پروا نہیں۔ چلو یونہی سہی، ہم فقیر ہی سہی

پہلے دوسرے اور پانچویں محل استعمال میں نہ تو کوئی بحث اور نہ کوئی باریک فرق ہے
"ٹھیک" ہندی کا لفظ ہے۔ اور بقول خود مولوی صاحب اس کے معنی راست، درست بجا، صحیح ہیں۔
اس کے علاوہ کیا پہلی مثال کے یہ معنی لینا کہ جو کچھ تم کہتے ہو ہم اسے مانتے یا تسلیم و قبول و منظور کرتے ہیں غلط
ہے۔ یہ فقرہ متکلم اس موقع پر بے تکلف بول سکتا ہے جہاں ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کا کہنا
قبول کرتا ہے خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو۔ اسی طرح اگر دوسری مثال کے شعر کا مطلب یوں بیان کیا جائے کہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"یہ ٹھیک سمجھا۔ یا درست ہے کہ غیر کو تم سے محبت ہے مگر ہم بھی تو اپنے دشمن نہیں ہیں" تو معنی میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پانچویں مثال میں بھی صرف لفظوں کا الٹ پھیر ہے۔ اور کچھ نہیں۔ یہاں بھی شعر کے یہ معنی کہے جا سکتے ہیں کہ اگر نغمۂ شادی میسّر نہیں تو کچھ پروا نہیں ہمیں نوحۂ غم بھی منظور ہے گھر کی رونق کا دارومدار "ہنگامہ" پر ہے اس سے غرض نہیں کہ اس کا باعث کون ہے، نوحۂ غم اور نغمۂ شادی دونوں "ہنگامہ" پیدا کر سکتے ہیں۔ اور دونوں میں سے جو بھی میسّر آ جائے گھر کی رونق کے لیے کافی ہے اور اس لئے ہم اسکو قبول کرتے ہیں۔

غالب کا سا 'الم دوست'، حریصِ لذت، آزاد جو 'کفِ افسوس' ملنے کو 'عہد تجدید تمنا' سے تعبیر کرتا ہے۔ نغمۂ شادی میسّر نہ آنے پر نوحۂ غم کو بھاگتے بھوت کی لنگوٹی سمجھ کر قبول کرلے یہ اس کی شوخی اندیشہ کے لیے باعث ننگ ہے، وہ دونوں کو ہم پلہ سمجھتا ہے، اس کے نزدیک دونوں میں سے کسی کی کوئی قدر نہیں اور ہے تو محض اس سبب سے کہ وہ ایک ہنگامہ پیدا کر سکتا ہے، جو گھر کی رونق کا باعث ہے۔

مولوی سید علی حیدر صاحب طباطبائی اس شعر کی شرح ان الفاظ میں فرماتے ہیں: "دنیا کی شادی و غم دونوں ہیچ ہیں۔ اپنی دلگی سے کام رکھنا چاہئیے۔ عارف کی نظر میں شادی و غم دونوں کی ایک ہی صورت ہے" اس سے بھی نہیں معلوم ہوتا کہ غالب نوحۂ غم کو غنیمت اور مغتنم سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔

(۶) اس مد میں جتنے معنی بتائے گئے ہیں وہ سب پورے کے پورے شعر کا حاصل ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ کہنا کہ یہ معنی محض لفظ سہی سے نکلے درست نہیں۔ مثلاً پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اپنی ہی ہستی سفینہ بحر نجات بن سکتی ہے، اگر تم سے ہو سکتا ہے تو اس کی حقیقت کو سمجھ لو، نہیں ہو سکتا تو اسے قطعی بھلا دو۔ درحقیقت ہستی ہی مانع حصول مقصد ہے، اور دفع مانع صرف دو ہی صورتوں سے ممکن ہے یا تو اسے بہت ہی اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے یا پھر اسے اتنا بھلا دیا جائے کہ دل میں اس کا خیال ہی نہ آئے۔ معرفت نفس حاصل ہو تو اور خودی مٹا دی جائے تو دونوں ایک ہی منزل پر پہونچاتی ہے، اس لیے برابر ہیں۔

اسی طرح شاعر دوسرے شعر میں ایک آرزو کرتا ہے۔ تیسرے میں عاشق صادق اور وفا شعار ہونے کا مدعی ہے، اور گوارا اور ناگوار کی پروا نہیں کرتا، اور چوتھے میں یہ قبول و منظور کرکے کہ بے ثباتی تیری "عادت" ہے۔ جس کے ہم اس وقت متحمل نہیں، کہتا ہے کہ اب سے وہ طریق عمل اختیار کریں گے، کہ آئندہ نہیں تیری بے نیازی شاق نہ گذرے اور اس کی وجہ سے جو کچھ پڑے جھیل جائیں۔ بہر صورت وفا ہمارا شعار ہے اور اس سے منھ نہ موڑیں گے؛

ان چاروں اشعار میں لفظ سہی کے استعمال سے شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو صورت واقعات ہو یا پیش آئے اس سے اسے کوئی تعرض نہیں۔ وہ اسے قبول و منظور کرتا ہے۔ بہ لحاظ معانی، پہلا شعر اچھا خاصہ تصوف کا وعظ ہے، دوسرا ایک مجسمۂ آرزو اور تیسرا اور چوتھا نعرۂ وفا پرستی۔ ان سے "تسلی خاطر" کے معانی کہاں نکلتے ہیں؟

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

(۷) اس شعر میں تاکید یا حصر جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے، وہ لفظ "سہی" سے نہیں بلکہ "تو" اور "سے" سے ہوتا ہے، ان میں سے پہلا حرف تاکید ہے اور دوسرا بہ معنی حصر مستعمل ہے، خود مولوی صاحب کی تالیف اس کی شاہد ہے۔

(۸) اس میں کلام نہیں کہ شاعر تسلسل تعلقات کا خواہشمند ہے اور اس کے نزدیک دو شخصوں میں باہم عداوت ہونا بھی دلیل تعلق ہے، کیونکہ دو بے تعلق شخصوں میں دوستی یا دشمنی کچھ بھی نہیں ہو سکتی۔ گویا تعلق ہی ہیولائے منافرت و موانست ہے۔ لیکن لفظ "سہی" میں کون سی بات ہے جس سے یہ استدلال کیا جائے، کہ یہ تسلسل تعلق کی جانب ذہن کو منتقل کرتا ہے، کوئی بھی نہیں۔ شاعر پہلے کہتا ہے ع "قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے" اس مصرع سے صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ لفظ منہ سے نکلے ہیں متکلم و سامع میں پہلے سے ربط و ضبط تھا جسے اب سامع توڑنا اور متکلم قائم رکھنا چاہتا ہے۔ دوسرے مصرع میں یہ صاحب غرض اس کے قائم رہنے کی تدبیر بتاتا اور کہتا ہے کہ اگر کوئی اور صورت پسند نہیں تو عداوت ہی رکھئے۔ اس طرح آپ یاد تو کر لیا کریں گے اور یہی بہت ہے کیونکہ یاد وہی کیا جاتا ہے جس سے تعلق ہوتا ہے۔ اسی مضمون کے دو اور شعر نقل کیے جاتے ہیں پہلے سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعر دشمنی (لاگ) کو تعلق (لگاؤ) سمجھتا ہے اور دوسرا شعر زیر بحث کا ہم معنی ہے۔

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ   جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو   کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

(۹) کسی نے کسی سے عشق کا دعویٰ کیا تھا، جواب ملا "یہ عشق نہیں وحشت ہے"۔ اسے تصفیہ دو، اس کے جواب میں مدعی عشق کہتا ہے "میں مانتا ہوں کہ میرا عشق، عشق نہیں، وحشت ہے۔ لیکن یہ وحشت کوئی بیکار اور فضول چیز بھی نہیں کہ چھوڑ دی جائے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو آپ کے حسن کا شہرہ ہی ہوتا ہے"۔ اس شعر میں "حصر و تاکید" ہی سے پیدا ہوتی ہے، دونوں مصرعوں میں "ہی" کے وہی ایک معنی ہیں یعنی منظور و قبول۔

(۱۰) یہاں ادعائے پاک بازی ہے جلوت ہو یا خلوت روش میں فرق نہیں آ سکتا۔ دوسرے مصرع کے یہ معنی ہیں "مان لیا کہ تم تنہا ہو اور کوئی پاس نہیں"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس شعر میں سہی کے معنی "منظور کردہ قبول کردہ" کیونکر ہو گئے۔ ایک پرانا مقولہ "المعنی فی بطن الشاعر" یہ تو غالب ہی جانیں کہ کون سا منظر سامنے تھا جس کی انھوں نے تصویر کھینچی ہے۔ لیکن شعر سے دو منظر سمجھ میں آتے ہیں وھو ہذا۔

(۱) عاشق اپنے محبوب سے ملنے کی آرزو ظاہر کرتا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ دنیا بھر کے سامنے تمھیں کیسے بلائیں، رسوا ہو جائیں گے، یہ پھر کہتا ہے کہ میں پاک باز ہوں، اندیشہ نہ کرو، تنہائی میں بلا لو اس سے تمہاری رسوائی نہ ہوگی، مجھے تنہا ملنا بھی منظور ہے ۔۔۔۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ب) معشوق تنہا تھا اسے حسن اتفاق کہیئے یا سوئے اتفاق کہ عاشق ادھر جانکلا۔ اب وہ برس رہے ہیں کہ تو یہاں کیوں آیا۔ تیرے یوں آجانے سے ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ عاشق بطور معذرت یوں کہتا ہے کہ میرے یہاں آنکلنے سے کوئی اندیشہ نہیں، مانا کہ آپ تنہا ہیں (خلوت ہے) لیکن میں لچا شہدا نہیں اور آپ پاکباز ہیں۔

(۱۱) اس فقرہ میں بے پروائی کا انداز لفظ سہی نہیں پیدا کرتا بلکہ خود فقرہ محل استعمال اور بالخصوص اس میں لفظ "چلو" کا موجود ہونا محاورہ میں بعض اوقات یہ لفظ اس معنی پر بھی دلالت کرتا ہے:۔ "تمھیں کیا غرض تم ہمارا پیچھا چھوڑ دو"۔

(۳) یہاں "تو" سے محض تاکید پیدا کرنا مقصود ہے لفظ سہی موکدّ ہے۔ یہ جملہ شرطیہ ہی نہیں اور بغرض اتمام حجت مان بھی لیا جائے کہ یہ جملہ شرطیہ ہے تو شرط کی جزا میں حرف "تو" آتا ہے۔ "سہی" نہیں آتا۔

(۴) یہاں "سہی" تکمیل فعل کے معنی میں ہرگز استعمال نہیں ہوا۔ درحقیقت جب ایک شخص کو دو کام بہم کرنا ہے اور ان میں وہ ایک کام بے درنگ کرتا ہے اور دوسرے کے کرنے میں اسے پیش و پیش ہوتا ہے تو سامع اسے دوسرا کام کرنے کی ترغیب دینے کے لیے "تو سہی" استعمال کرتا ہے۔ ان دونوں مثالوں میں "تو" محض تاکید کے لیے اور "سہی" ایک کام کے ساتھ ساتھ دوسرا کرنے کی ترغیب دینے کو استعمال ہوئے ہیں۔

فرہنگ آصفیہ میں جو مثالیں لفظ سہی کا محل استعمال سمجھانے کے لیے لکھی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض دو موقعوں پر بولا جاتا ہے۔ ایک وہ ہے جہاں کوئی بات منظور و قبول ہو دوسرا وہ جہاں دو فعل بہم صادر ہونے چاہئیں۔ اور وہاں ایک کے صدور کے بعد دوسرے کے صدور میں توقف ہو۔ اور متکلم سامع کو اس کے کرنے کی ترغیب دلانا چاہتا ہو یعنی یہ کہنا چاہتا ہو کہ ایک کام کر لیا ہے اسکے ساتھ ہی دوسرا بھی کرنا چاہیئے۔ چوتھی مثال میں مولوی سید احمد صاحب خود فرماتے ہیں کہ "پہلے کھانا تو کھاؤ" یعنی ایک شخص کو دو فعلوں کا مصدر ہونا چاہیئے۔ کھانا کھانا۔ اور تکلف کرنا۔ وہ تکلف کرتا اور کھانا نہیں کھاتا ہے اس لیے اس سے کوئی کہتا ہے کہ تکلف تو کرتے ہو مگر کھانا نہیں کھاتے اس لیے پہلے کھانا کھالو پھر تکلف بھی کر لینا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اس لفظ کا محل استعمال سمجھانے کے لیے مندرجہ ذیل مثالیں لکھی ہیں:

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

(۱) سن تو سہی۔ کہہ تو سہی۔ اکثر "تو" کے ساتھ مل کر آتا ہے۔

(۲) بعض اوقات اپنے اصل معنی کی طرف رجوع کرتا ہے، جیسے ؎

سب کچھ سہی پہ ایک نہیں کی نہیں سہی　　　چین جبیں سہی

بھڑکی سہی، اداس سہی،

(۳) کبھی دھمکی کے معنی دیتا ہے، جیسے آؤ تو سہی، کھاؤ تو سہی،

(۴) (ان معنوں میں ہمیشہ تو کے ساتھ آتا ہے) کبھی آمادگی ظاہر کرتا ہے، تم جاؤ تو سہی پھر دیکھا جائے گا۔

(۵) کبھی استغنا ظاہر کرتا ہے لیکن حرف نفی کے ساتھ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی (غالب)

ان میں سے دوسری مثال میں سہی کے معنی منظور، قبول ہیں، باقی کی مثالوں پر وہی صادق آتا ہے جو فرہنگ آصفیہ کی تیسری اور چوتھی مثالوں کے متعلق کہا جاچکا ہے دھمکی، آمادگی اور استغنا کا مدار "سہی" پر نہیں ہے بلکہ ان فقروں کے خاص خاص مواقع سے بولنے پر ہے،

پلاٹس کے "ستیم" (सत्य) کا بگڑ کر "سہی" ہو جانا بہت ہی بعید از قیاس نظر آتا ہے فالن نے صرف مادۂ لفظ بتانے پر اکتفا کی ہے، دونوں کی تحقیقات پر الگ الگ نظر ڈالی جائے تو حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی۔ لیکن ان کی مدد سے صحیح صحیح نتیجہ نکال لینا دشوار نہیں، پلاٹس نے لکھا ہے کہ ہندی میں "سئی" (सई) مستعمل ہے اور فالن کہتا ہے کہ اس کا مادہ "اَس" (अस) ہے فالن نے اسکے معنی BE IT SO (ایسا ہی ہو) بھی بتائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت میں جو لفظ ان معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ وہی بگڑا ہے۔ سنسکرت میں مضارع सत्यर्थ جہاں بہت سے معنی میں آتا ہے آرزو اور خواہش کے معنی میں بھی آتا ہے۔" اَس" کا مضارع سیات (स्यात्) ہوتا ہے اس کی دو مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں،

(۱) यस्य यो भाद स्यात् (جس کی جو عادت ہو)

(۲) न स्यात् प्राधनि: (وہ تابع غیر نہ ہو)

"سیات" کا بگڑ کر "سئی" ہو جانا عین اصول پراکرت کے مطابق ہے۔ مسٹر آر۔ دی جاگیردار کی ایک تازہ تصنیف[1] سے ظاہر ہوتا ہے کہ "یت" (यति) پراکرت میں "اے۔ ای ئی" ہو گیا ہے انھوں نے مندرجہ ذیل مثال پیش کی ہے۔

---

[1] AN INTRODUCTION TO THE COMPARATIVE PHILOLOGY OF INDO ARYAN LANGUAGES BY R.V. Jahangirdar M.A (LONDON)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پراکرت	پالی	سنسکرت
नासेइ	नासेति	नाशयति
ناسیئی	ناسیئت	ناشئیت

اس تبدیلی کی سند پر یہ نتیجہ نکالنا کہ "سیات" کا ٹکڑا "یات" यात "ای" ई سے بدل گیا تا دیل لایعنی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص اس صورت میں کہ سیات کے لغوی یا مجازی معنی ان تمام موقعوں پر چسپاں ہوتے ہیں جہاں "سہی" مستعمل ہے۔ حسب تقاضائے سیاق و سباق ہمیں سیات کے کہیں لغوی معنی (ہو) لینے پڑیں گے اور کہیں مجازی معنی (قبول و منظور وغیرہ) اس لفظ کو غالب مرحوم نے اپنی دو غزلوں کی ردیف میں رکھا ہے جن کے مطلعوں کے پہلے مصرع یہ ہیں:-

(۱) عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی

(۲) نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

ان دونوں غزلوں میں سے پہلی میں "سہی" بیشتر اپنے مجازی اور کمتر لغوی معانی میں آیا ہے اور دوسری میں بالکل اس کے برعکس ہے۔

اس قسم کے فقروں میں جیسے "میاں کھاؤ تو سہی پیچھے تکلف کر لینا" یعنی جہاں سیاق و سباق کلام دو فعلوں میں وقوع یکے بعد دیگرے چاہتا ہے۔ میں "سہی" کو سنسکرت کے لفظ "سہت" (सहित = ساتھ) کا مخفف مانتا ہوں، مثال کے فقرہ سے صاف صاف ظاہر ہے کہ دو کام ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے تھے، ان میں سے سامع نے ایک کیا ہے دوسرا نہیں، متکلم تقاضا کرتا ہے کہ دوسرا بھی اس کے "ساتھ" ہی کرو۔ مصرعۂ رنگین سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

"سئی" کیوں کر "سہی" ہو گیا اس کے جواب دہ وہ زبردست لوگ ہیں جو بید ھڑک لفظوں کا تلفظ بگاڑتے اور بے کھٹکے قواعد کا خون کرتے ہیں جو بے سمجھے بوجھے ان میں کبھی کچھ گھٹا اور کبھی بڑھا دیتے ہیں اور جن کی قوت و اقتدار کا اعتراف کرنے کے لیے لسانیق گو اپنے عجز و بے بسی کو محاورہ اور روزمرہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شمس العلما حالی اور ڈاکٹر نذیر احمد کے خطوط

زمانہ اپریل ۱۹۳۴ء

زمانہ کو جاری ہوئے تیس۳۰ سال سے زیادہ ہو چکے، اس عرصے میں اسکو ملک کے بڑے بڑے ادیبوں نامور انشا پردازوں، باکمال شاعروں اور مقتدر لیڈروں کے بہترین مضامین نظم و نثر کی اشاعت کی عزت نصیب ہوئی۔ لیکن جس کوشش و کاوش سے ناظرین زمانہ کی ادبی ضیافت کا سامان مہیا ہوا ہے اس کا مفصل حال نامعلوم ہی رہیگا۔ اس بارے میں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ زمانہ کے لیے فخر و مباہات کا باعث ہے اور ایڈیٹر زمانہ کے لیے بھی ابتدائی جد و جہد کی یاد نہایت دلآویز و دل خوش کن ہے۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے نامورانِ ملک سے تبادلہ خیالات کے مواقع حاصل ہوئے عظیم القدر بزرگوں سے خط و کتابت رہی۔ ان میں سے شمس العلما مولانا حالی اور ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے چند خطوط ذیل میں نذر ناظرین کرتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ یادگار مراسلے قدر دانانِ ادب کے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

ایڈیٹر

۱

پانی پت ۱۳ر جولائی ۱۹۰۵ء

جناب منشی صاحب مخدوم و مکرم!

عنایت نامہ پہنچا، مجھے زیادہ کوئی نا شکر اور نا منفعل نہ ہوگا کہ ایک عرصہ سے آپکے بے نظیر رسالہ کے مطالعے سے مستفید ہوتا ہوں، مگر باوجود اس کے آج تک نہ کبھی رسالے کی رسید لکھی اور نہ شکریہ کا ایک حرف لکھا مگر حال یہ ہے کہ میں تقریبًا ایک سال سے ایسی پریشانیوں میں الجھا ہوا ہوں کہ لکھنا پڑھنا بالکل موقوف ہو گیا ہے، اور جمعیت خاطر اور اطمینان نے کلیتہً جواب دیدیا ہے میں نہیں چاہتا کہ پہلے ہی خط میں ان پریشانیوں کی تفصیل سے آپ کو بے لطف کردوں، لہٰذا اس موقع پر صرف یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے حکم کی تعمیل اس وقت ناممکن ہے، لیکن اگر زندگی باقی ہے تو میں ضرور اپنی شرمندگی رفع کرنے میں کوشش کروں گا۔ اور جیسا برا بھلا لکھنا مجھے آتا ہے زمانہ کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ امید ہے کہ آپ میرے اس عذر کو کسی حیلہ یا بہانہ پر محمول نہ فرمائیں گے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانہ کو میں دل سے پسند کرتا ہوں اور اس کو ان منتخب رسالوں میں شمار کرتا ہوں جو اردو

لٹریچر کو ناشائستگی کے خس و خاشاک سے پاک کر رہے ہیں۔ میری دلی آرزو ہے کہ زمانہ نہ صرف اشاعت میں بلکہ شائستگی اور تہذیب میں بھی روزافزوں ترقی کرے، اور جو صلح کل کا مسلک اس نے اختیار کیا ہے اُس سے سر مو تجاوز نہ کرے۔

زیادہ نیاز۔　　　آپکا نیازمند۔ الطاف حسین حالی

(۲)

نظام کلب۔ حیدرآباد دکن　　　۸۔اپریل سنہ ۱۹۰۶ء

جناب منشی صاحب۔

کل ٹیلیگرام اور آج عنایت نامہ پہنچا۔ جو نظم میں نے جلسہ ینگ مینس ڈبیٹنگ فورم میں پڑھی تھی وہ کوئی جدید نظم نہ تھی۔ اس کو لکھے ہوئے بائیس تیئس برس سے کم عرصہ نہ ہوا ہوگا اور مجموعہ نظم حالی جو ڈیوٹی شاپ علیگڈھ فروخت کرتی ہے وہاں سے مل سکتا ہے، یہاں بڑی مشکل سے ایک کاپی لوگ تلاش کر کے کہیں سے لائے تھے۔ اگر آپ اس پرانی ذنیانوسی نظم کو اپنے رسالہ میں چھاپنا چاہیں تو ڈیوٹی سے ایک کاپی منگوالیں۔ اس میں اور بہت سی میری نظمیں شامل ہیں۔

جو لیکچر سر سید مرحوم کی برسی کے موقع پر دیا گیا تھا وہ ان کی لائف موسوم بہ حیات جاوید کا خلاصہ ہے مگر بالکل نامکمل اور ادھورا ہے، میں آج اتوار کے سبب اس کو روانہ نہیں کر سکا، انشاء اللہ کل ضرور روانہ کر دوں گا۔

جس روز میں نے نظم "تعصب و انصاف" پڑھی تھی اس روز میرے دوست مولوی عبدالحق بی۔اے نے اکبر کی برسی کے موقع پر اسکی لایف اور اس کی پالیسی پر لیکچر دیا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ابتک اکبر پر کسی صاحب نے ایسا عمدہ مضمون نہیں لکھا۔ میں نے سکریٹری فورم مذکور سے زمانہ کے لیے اس کو مانگ لیا ہے، وہ بھی عنقریب (جبکہ مولوی عبدالحق اس پر نظر ثانی کر لیں گے) آپ کی خدمت میں بھیجدوں گا۔ مگر سکریٹری نے اس کو اس شرط پر دینا منظور کیا ہے کہ اسکی سو پچاس جلدیں جو وہ آپ سے طلب کریں وہ اصل لاگت پر آپ انکو دیدیں۔

اس لحاظ سے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کا جواب متضمن بہ منظوری شرط مذکور آجائے اس وقت اُس لیکچر کو آپ کی خدمت میں بھیجا جائے اور اُسی وقت مطلوبہ جلدوں کی تعداد مسٹر ور ما سکریٹری فورم مذکور سے پوچھ کر آپ کو اطلاع دیجائیگی۔ چونکہ یہ سب مطالب تار کے ذریعہ ادا ہونے مشکل تھے اس لیے تار نہیں دیا گیا۔ امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے۔ زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

۳۔ مولوی عبدالحق بی۔اے کا لیکچر آج بُک پیکٹ کے ذریعہ سے آپ کی خدمت میں ارسال کیا گیا ہے،

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

مہربانی کر کے اس کی رسید سے جلد مطلع کریں. انشاء اللہ ۲۸ مئی کو یہاں سے روانہ پانی پت ہو جاؤں گا. اس لکچر کو آپ خواہ الگ چھاپیں یا اپنے رسالہ کے ضمن میں بشمول دیگر مضامین طبع فرمائیں بہر صورت اپنی ضرورت سے پچاس جلدیں زیادہ چھاپنی چاہئیں، اور اصل لاگت کے حساب سے پچاس جلدوں کی قیمت لگا کر ویلیو پے ایبل پارسل بنام مولوی عبدالحق صاحب ہیڈ ماسٹر و پرنسپل مدرسہ آصفیہ سرکار عالی بمقام حیدرآباد بھیج دیجئے گا. زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

حیدرآباد دکن نظام کلب. ۱۴ مئی سنہ ۱۹۰۶ء

۴ - جناب من. مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون آپ جب چاہیں زمانہ میں شائع کریں. اگر ڈیڑھ سو سے کم جلدیں چھاپنی مناسب نہیں ہیں تو آپ کو اجازت ہے ڈیڑھ سو جلدیں زائد چھپوالیں. میں انشاء اللہ تین چار دن میں وطن روانہ ہو جاؤں گا. آپ اگر کچھ مجھے لکھنا چاہیں تو ایک ہفتے کے بعد پانی پت خط ارسال فرمائیں. اور اگر مضمون مذکور کے متعلق کچھ پوچھنا پچھنا ہو تو مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل مدرسہ آصفیہ سرکار عالی کے نام بمقام حیدرآباد ملک پیٹ خط تحریر کریں. زیادہ نیاز

خاکسار الطاف حسین حالی

از حیدرآباد دکن، نظام کلب. ۲۶ مئی سنہ ۱۹۰۶ء

۵ - جناب منشی دیا نرائن نگم صاحب ایڈیٹر زمانہ

اس خط کے ساتھ ہی میں اپنا ایک تازہ چھپا ہوا لکچر آپ کے پاس بھیجتا ہوں. یہ لکچر انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں دینے کے لیے تیار ہوا تھا مگر افسوس کہ وہاں اس کا ایک فقرہ بھی نہیں پڑھا گیا. اخباروں سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اراکین انجمن کی مخالف ایک پارٹی کھڑی ہو گئی ہے اور وہ انجمن کی مخالفت کھلم کھلا کرتی ہے. اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ میں ایک عام برہمی اور جوش پیدا ہو گیا، اور اسی برہمی کے رفع کرنے میں، میں اپنا لکچر پڑھ نہ سکا. باتیں بہت سی ہوئیں اور میرا وقت نکل گیا. چونکہ لکچر ابھی تک شائع نہیں ہوا اور جلسہ میں پڑھا نہیں گیا اس لیے میں آپ کے پاس بھیجتا ہوں، آپ اسے زمانہ کے صفحوں میں جگہ دیجئے اور دفعتاً یا ٹکڑے ٹکڑے کر کے جب آپ مناسب سمجھیں شائع کیجئے. فقط

خاکسار، نذیر احمد. ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء

۶ - جناب من. تسلیم - ۲۰ فروری کو آپ کا ایک ملفوف خط جناب قبلہ مولوی صاحب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل. ایل. ڈی. نے مجھے دیا جس میں لکھا تھا کہ کتاب الحقوق میرے پاس نہیں پہنچی. مجھے تعجب ہے کہ آپ اس قدر جلد الحقوق کو بھول گئے کیونکہ میں نے کتاب مذکور بصیغہ تبرک آپ کی خدمت میں روانہ کی ہے، اور آپ نے رسالۂ زمانہ میں اس کا ایک مضمون منتخب کر کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

چھاپا ہے۔ غالبؔ سہو کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کتاب مکمل نہ تھی۔ ٹائیٹل پیج اور فہرست اور خاتمہ آخر کی دو کاپیاں اُس میں شامل نہ تھیں، کیونکہ وہ اس وقت تک طبع نہ ہوئی تھیں بہرکیف گزارش یہ ہے کہ اگر آپ فرمائیں تو کتاب الحقوق مکمل روانہ خدمت کر دوں۔ باقی والسلام

نیاز مند محمد رحیم بخش از دہلی مکان شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل ڈی

۷ر فروری سنہ ۱۹۰۶ء

۷۔ بخدمت بابو دیا نرائن نگم صاحب۔

آپ کا خط جس میں جواب کے لیے ٹکٹ دار لفافہ بھی ملفوف تھا پہونچا، یہ تو آپ کھینچ تان کر مجھکو کارسپانڈنٹی کے راستے پر ڈال چلے جو میری عادۃ اور میرے مزاج دونوں کے خلاف ہے رسالوں اور اخباروں کی کارسپانڈنٹی وہ کرتا ہے جس بدنصیب کو شہرۃ کا دوسرا ذریعہ میسر نہیں۔ شکر ہے خدا نے مجھ کو اس بے حرمتی سے بچایا ہے۔ ایسے مذاق کے لوگ بھی ہیں جو میری کتابوں اور میرے لیکچروں کے آرزو مند رہتے ہیں، دو پیسے کے ٹکٹ دار لفافے کے یہ معنی کہ سودیشی تحریک پر جو کچھ لکھوں اُس کی قیمت آدھ آنہ۔ میں آپ کی قدردانی کا شکر گزار ہوں۔ کیتنے ہیں کہ چھاپ دینے کی الٹی منت رکھتے ہیں۔ سودیشی تحریک پر موافق و مخالف بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، میں اس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہوں۔ رہی اہل ملک کی ہدایت تو جن کو خدا گمراہ کرے اُن کو کون ہدایت دے، میں تمام اہل ملک کو الا ماشاء اللہ عقل مصلحت اندیش کی طرف سے گمراہ پاتا ہوں ہندو ہوں یا مسلمان۔ فقط

خاکسار نذیر احمد

(یہ خط سنہ ۱۹۰۸ء کا ہے)

⁂ ⁂ ⁂

تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعالِ ارادی اور جذباتِ نفسانی کو اعتدال پر رکھنا وقت کو عزیز سمجھنا واقعات کے اسباب ڈھونڈھنا اور ان کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق۔ معاملات۔ معاشرت۔ طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان خوبی اور فطری عمدگی پر پہونچانا۔ اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی۔ اصل تمکین۔ حقیقی وقار اور خود اپنی عزت کی عزت اور درحقیقت یہی پچھلی ایک بات ہے جس سے وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

سر سید احمد

زمانہ فروری سنہ ۱۹۰۸ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کرکٹ میچ

پریم چند —— زمانہ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء

یکم جنوری سنہ ۱۹۳۵ء۔ آج کرکٹ میچ میں مجھے جتنی مایوسی ہوئی اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ہماری ٹیم حریفوں سے کہیں زیادہ مستحکم تھی۔ مگر ہمیں ہار ہوئی اور وہ لوگ فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتے ہوئے ٹرافی اڑا لے گئے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ہمارے یہاں قیادت کے لئے لیاقت شرط نہیں۔ ہم قیادت کے لئے ثروت اور دولت لازمی سمجھتے ہیں۔ ہز ہائینس کپتان منتخب ہوئے، کرکٹ بورڈ کا فیصلہ سب کو ماننا پڑا۔ مگر کتنے دلوں میں آگ لگی، کتنے لوگوں نے حکم حاکم سمجھ کر اس فیصلہ کو منظور کیا، وہ کھیلنے والوں سے پوچھئے۔ اور جہاں محض منہ دیکھی ہے وہاں اُمنگ کہاں، ولولہ کہاں، عزم کہاں، آخری قطرہ خون گرا دینے کا جوش کہاں، ہم کھیلے اور بظاہر دل سے کھیلے، مگر یہ حق کے لئے جان دینے والے سرفروشوں کی فوج نہ تھی۔ پیٹ اور لوٹ کے لئے لڑنے والی فوج تھی، کھیل میں کسی کا دل نہ تھا۔

میں اسٹیشن پر کھڑا اپنا تیسرے درجہ کا ٹکٹ لینے کی فکر میں تھا کہ ایک نازنین نے جو ابھی کار سے اتری تھی آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولی، آپ بھی تو اسی گاڑی سے چل رہے ہیں مسٹر ظفر؟

مجھے حیرت ہوئی یہ کون نازنین ہے اور اسے میرا نام کیونکر معلوم ہو گیا۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے سکتا سا ہو گیا۔ گویا سارے آداب اور اخلاق کی رسمیں دماغ سے محو ہو گئی ہوں۔ حسن میں ایک سطوت ہے جو بڑے بڑوں کا سر جھکا دیتی ہے۔ مجھے اپنے عجز کا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ میں نے نظام حیدرآباد سے، ہز ایکسلنسی وائسرائے سے، مہاراجہ میسور سے ہاتھ ملایا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا ہے مگر یہ افتادگی اور فروتنی مجھ پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی پلکوں سے اس کے قدموں کا بوسہ لے لوں۔ وہ ملاحت نہ تھی جس پر ہم جان دیتے ہیں، نہ وہ نزاکت جس کی شعراء قسمیں کھاتے ہیں۔ اس کی جگہ ذہانت تھی، متانت تھی، وقار تھا، زندہ دلی تھی اور شوقِ اظہار تھا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بے نقاب ہیں نے پُرسوال انداز سے کہا، جی ہاں،

یہ کیسے پوچھوں کہ مجھے آپ سے کب نیاز حاصل ہوا، اس کی بے تکلفی کہہ رہی تھی کہ وہ مجھ سے متعارف ہے، میں بیگانہ کیسے بنوں۔ اسی سلسلہ میں میں نے اپنی مروت کا فرض بھی ادا کر دیا۔ میرے لئے کوئی خدمت؟

اُس نے مسکرا کر کہا، جی ہاں آپ سے بہت سے کام لوں گی چلیئے اندر وٹینگ روم میں بیٹھیں، لکھنؤ کا قصد ہوگا، میں بھی وہیں چل رہی ہوں۔

وٹینگ روم میں آ کر اُس نے مجھے آرام کرسی پر بٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ کر سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی، "آج تو آپ کی بولنگ بڑی مہلک تھی، ورنہ ہم لوگ پوری اننگ سے ہارتے"

میری حیرت اور زیادہ ہوئی، اس حسینہ کو کیا کرکٹ سے بھی شوق ہے۔ مجھے اس کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے تکلف ہو رہا تھا۔ ایسی آداب شکن حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوئی تھی، توجہ اسی طرف تھی، طبیعت میں کچھ انقباض سا ہو رہا تھا، رگوں میں وہ سرعت اور طبیعت میں وہ گلابی بشاشت نہ تھی جو ایسے موقع پر فطرتاً مجھ میں ہونی چاہیئے تھی۔

میں نے پوچھا، کیا آپ وہیں تشریف رکھتی تھیں؟

اس نے اپنا سگرٹ جلاتے ہوئے کہا، جی ہاں، اول سے آخر تک،۔ مجھے تو صرف آپ کا کھیل جچا اور لوگ تو کچھ بددل سے ہو رہے تھے، اور میں اس کا راز سمجھ رہی ہوں۔ ہمارے یہاں لوگوں میں صحیح آدمیوں کو صحیح مقام پر رکھنے کا مادہ ہی نہیں، جیسے اس سیاسی پستی نے ہمارے سبھی اوصاف کو کچل ڈالا ہے جس کے پاس ثروت ہے وہ قادرِ مطلق ہے، وہ کسی علمی، ادبی، معاشرتی جلسے کا صدر ہو سکتا ہے۔ اہل ہو یا نہ ہو، نئی عمارتوں کا افتتاح اس کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے، بنیادیں اس کے ہاتھوں رکھائی جاتی ہیں تہذیبی تحریکوں کی قیادت اُسے دی جاتی ہے، وہ کانووکیشن کے خطبے پڑھیگا، لڑکوں کو انعام تقسیم کریگا۔ یہ سب ہماری غلامانہ ذہنیت کی برکت ہے۔ کوئی تعجب نہیں ہم اس قدر ذلیل اور پست ہیں۔ جہاں حکم اور اختیار کا معاملہ وہاں تو خیر مجبوری ہے، ہمیں پابوسی کرنی ہی پڑتی ہے، مگر جہاں ہم اپنی آزاد خیالی اور آزاد عملی سے کام لے سکتے ہیں وہاں بھی ہماری رسوم طلبی اور منعم پرستی ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔ اس ٹیم کا کپتان آپ کو ہونا چاہیئے تھا، تب دیکھتی حریف کیونکر بازی لے جاتا۔ مہاراجہ صاحب میں اس ٹیم کے کپتان بننے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی آپ میں اسمبلی کی صدارت کی، یا مجھ میں سینما ایکٹنگ کی۔

بالکل وہی جذبات جو میرے دل میں تھے، مگر اس کی زبان سے نکل کر کتنے پُراثر اور کتنے بصیرت افروز ہو گئے تھے۔ میں نے کہا آپ بجا فرماتی ہیں، واقعی یہ ہماری کمزوری ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"آپ کو اس ٹیم میں شریک نہ ہونا چاہیے تھا۔"

"میں مجبور تھا۔"

اس حسینہ کا نام مس ہیلن مکرجی ہے۔ ابھی انگلینڈ سے آرہی ہے یہی کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے بمبئی ٹھہر گئی تھی۔ انگلینڈ میں اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے اور خدمت خلق اس کی زندگی کا مقصد ہے وہاں اس نے ایک اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی اور میرا ذکر بھی پڑھا تھا۔ تب سے اُسے میری جانب سے حسن ظن ہو گیا ہے۔ یہاں مجھے کھیلتے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کا ارادہ ہے کہ ہندوستان کی ایک نئی ٹیم مرتب کی جائے اور اس میں وہی لوگ لیے جائیں جو قوم کی نیابت کرنے کے مستحق ہیں۔ اس کی تجویز ہے کہ میں اس ٹیم کا کپتان بنایا جاؤں۔ اسی ارادہ سے وہ سارے ہندوستان کا دورہ کرنا چاہتی ہے۔ اس کے والد مرحوم ڈاکٹر این مکرجی نے بہت کافی دولت چھوڑی ہے، اور وہ اس کی بلا شرکت غیرے وارث ہے۔ اس کی تجویز سن کر میرا دماغ آسمان میں اُڑنے لگا۔ میری زندگی کا سنہرا خواب اس غیر متوقعہ انداز سے حقیقت بن سکے گا۔ اس کا کسے گمان تھا۔ مشیت غیب میں میرا اعتقاد نہیں۔ مگر آج میرے وجود کا ایک ایک ذرہ تشکر اور عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ میں نے مناسب اور منکسر الفاظ میں مس ہیلن کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی کی گھنٹی ہوئی۔ مس مکرجی نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ منگوائے۔ میں احتجاج نہ کر سکا اس نے میرا لگیج اٹھوایا، میرا ہیٹ خود اٹھا لیا اور بیباکانہ انداز سے ایک کمرہ میں جا بیٹھی اور مجھے بھی اندر بلا لیا اس کا خانساماں تیسرے درجہ میں بیٹھا۔ میری قوت عمل جیسے سلب ہو گئی تھی۔ میں نہ جانے ان سب معاملات میں کیوں اُسے پیش قدمی کرنے دیتا تھا جو مرد کی حیثیت سے میرے فرائض میں شامل تھے۔ شاید اس کے حسن، اس کے ذہنی وقار اور اس کی علو ہمتی نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ گویا اس نے کامروپ کے جادو طرازوں کی طرح مجھے بھیڑ بنا لیا ہو، اور مجھ میں قوت ارادہ غائب ہو گئی ہو اتنی ہی دیر میں میری ہستی اس کی رضا میں جذب ہو گئی تھی۔ میری خودداری کا تقاضہ یہ تھا کہ میں اُسے اپنے لئے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہ منگوانے دیتا اور تیسرے ہی درجہ میں آرام سے بیٹھتا اور اگر اول درجہ میں بیٹھنا تھا تو اتنی ہی فیاضی سے دونوں کے لئے خود اول درجہ کے ٹکٹ لاتا لیکن فی الواقع میری قوت عمل سلب ہو گئی تھی۔

۲ر جنوری۔ میں حیران ہوں مس ہیلن کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے اور یہ محض دوستانہ ہمدردی نہیں ہے، اس میں محبت کا خلوص ہے ورنہ تو اتنا مہمان نواز نہیں ہوا کرتا، اور میرے کمال کا اعتراف! میں اتنا عقل سے عاری نہیں ہوں کہ اس مغالطے میں پڑوں، کمال کا اعتراف زیادہ سے زیادہ ایک سگریٹ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور ایک پیالہ چائے پا سکتا ہے، یہ خاطر و مدارات تو وہیں پاتا ہوں جہاں کہیں میچ میں کھیلنے کے لئے مدعو ہوتا ہوں تاہم وہاں یہ دلنوازی نہیں ہوتی، محض رسمی خاطر داری برتی جاتی ہے۔ اس نے تو جیسے میری آسائش کے لئے اپنے کو وقف کر دیا ہو، میں تو شاید اپنی معشوقہ کے سوا اور کسی کے ساتھ اس خلوص کا برتاؤ نہ کر سکتا، یاد رہے، میں نے معشوقہ کہا ہے، بیوی نہیں کہا، بیوی کی ہم خاطر داری نہیں کرتے، اس سے تو خاطر داری کروانا ہی ہمارا وطیرہ ہو گیا ہے اور شاید حق بھی یہی ہے۔ مگر فی الحال تو میں ان دونوں نعمتوں میں ایک سے بھی بہرہ ور نہیں، اس کے ناشتے، ڈنر، لنچ میں تو میں شریک تھا ہی، ہر اسٹیشن پر (وہ ڈاک تھی اور خاص خاص اسٹیشنوں ہی پر رکتی تھی) میوے اور پھل منگواتی اور مجھے بہ اصرار کھلاتی، کہاں کی کیا چیز مشہور ہے اس کا اسے خوب علم ہے، میرے عزیزوں کے لئے طرح طرح کے تحائف خریدے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی اسے منع نہ کیا، منع کیونکر کرتا، مجھ سے پوچھ کر تو لاتی نہیں، جب وہ ایک چیز لا کر محبت کے ساتھ میری نذر کرتی ہے تو میں کیسے انکار کروں۔ خدا جانے کیوں میں مرد ہو کر بھی اس کے روبرو عورت کی طرح شرمیلا، کم گو، بستہ دہن ہو جاتا ہوں۔

دن کے تکان کی وجہ سے رات بھر بےچینی رہی، سر میں خفیف سا درد تھا۔ مگر میں نے اس درد میں مبالغہ کیا، تنہا ہوتا تو اس درد کی شاید مطلق پروا نہ کرتا، مگر آج اس کی موجودگی میں مجھے اس کے اظہار میں مزہ آ رہا تھا، وہ میرے سر میں تیل کی مالش کرنے لگی۔ اور میں خواہ مخواہ نڈھال ہوا جاتا تھا، میرے اضطراب کے ساتھ اس کی وحشت بڑھتی جاتی تھی، مجھ سے بار بار پوچھتی اب درد کیسا ہے، اور میں توکلانہ انداز سے کہتا اچھا ہوں۔ اس کی نازک ہتھیلیوں کے احساس سے میری روح میں گدگدی ہوتی تھی، اس کا وہ دلکش چہرہ میرے سر پر جھکا ہوا ہے، اس کی گرم سانسیں میری پیشانی کے بوسے لے رہی ہیں۔ اور میں گویا جنت کے مزے لے رہا ہوں۔ میرے دل میں اب اس پر فتح پانے کی خواہش اکھوے لے رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ میری ناز برداری کرے۔ میری طرف سے کوئی ایسی پیش قدمی نہ ہونی چاہئے جس سے اس پر میری فریفتگی کا اظہار ہو۔ چوبیس گھنٹے کے اندر میری ذہنیت میں کیونکر یہ انقلاب ہو جاتا ہے، میں کیونکر طالب سے مطلوب بن جاتا ہوں یہ میں نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے نہ جانے کب نیند آ جاتی ہے۔ مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں وہ بدستور اسی محویت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی ہے۔ تب مجھے اس پر رحم آ جاتا ہے اور میں کہتا ہوں آپ اب تکلیف نہ کریں، میں بالکل اچھا ہوں۔ عاشقی کا تھوڑا سا تجربہ کسے نہیں ہوتا، میں بھی مستثنیٰ نہیں ہوں۔ مگر اس معشوقی میں آج جو لطف آیا اس پر عاشقی صدقے، عاشقی غلامی ہے معشوقی بادشاہت۔

میں نے ترحم کے انداز سے کہا، آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔

اس نے دل سوزی کی، مجھے کیا تکلیف ہوئی، آپ درد سے بےچین تھے اور میں بیٹھی رہتی۔ کاش یہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

درد مجھے ہوتا ہے"

میں عرشِ معلّیٰ پر اُڑا جا رہا تھا۔

---

۵ رجنوری۔ کل شام کو ہم لکھنؤ پہنچ گئے۔ راستے میں ہیلن سے تمدنی، سیاسی، اور ادبی مسائل پر خوب باتیں ہوئیں۔ گریجویٹ تو خدا کے فضل سے میں بھی ہوں، اور تب سے فرصت کے اوقات میں کتب بینی بھی کرتا رہا ہوں، علما کی صحبت میں بھی بیٹھا ہوں۔ لیکن اس کی وسعتِ معلومات کے سامنے قدم قدم پر مجھے اپنی بے بضاعتی کا علم ہوتا ہے، ہر ایک مسئلہ پر اس کی اپنی رائے ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خوب تحقیق کے بعد وہ رائے قائم کی ہے۔ اس کے برعکس میں ان لوگوں میں ہوں جو ہوا کے ساتھ اڑتے ہیں، جنھیں وقتی تحریکیں زیر و زبر کر دیتی ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی طرح اس پر اپنا ذہنی وقار قائم کر دوں، مگر اس کے نظریات مجھے بے زبان کر دیتے تھے۔ جب میں نے دیکھا کہ علمی مسائل میں اس سے پیش نہ پا سکوں گا تو میں نے ابی سینیا اور اٹلی کے معرکے کا ذکر چھیڑ دیا جس پر میں نے اپنی دانست میں بہت کچھ پڑھا تھا، اور انگلینڈ اور فرانس نے اٹلی پر جو دباؤ ڈالا ہے اس کی تعریف میں اپنا سارا زورِ بیان صرف کر ڈالا۔ اس نے ایک تبسم کے ساتھ کہا آپ کا یہ خیال ہے کہ انگلینڈ اور فرانس محض انسانیت یا زیردست پروری کے جذبات سے متحرک رہے ہیں تو یہ آپ کی غلطی ہے ان کی طوکیت پرستی یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت پھیلے اور سرسبز ہو۔ مسولینی وہی کر رہا ہے جو انگلینڈ نے بارہا کیا ہے اور آج بھی کر رہا ہے۔ یہ سارا بھروپیاپن محض ابی سینیا سے سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اگر انگلینڈ کو اپنی تجارت کے لئے بازاروں کی ضرورت ہے اپنی زائد آبادی کے لئے قطعاتِ زمین کی ضرورت ہے۔ اپنے تعلیم یافتوں کے لیے موٹے منصبوں کی ضرورت ہے تو اٹلی کو کیوں نہ ہو۔ اٹلی جو کچھ کر رہا ہے، ایمانداری کے ساتھ علانیہ کر رہا ہے۔ اس نے کبھی عالمگیر اخوت کا ڈنکا نہیں پیٹا۔ کبھی امن کا راگ نہیں الاپا۔ وہ تو صاف کہتا ہے، جنگ و جدل ہی زندگی کی علامت ہے۔ انسانیت کا ارتقا جنگ ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ انسان کے ملکوتی اوصاف میدانِ جنگ ہی میں نشو و نما پاتے ہیں۔ مساوات کے نظریے کو وہ جنون کہتا ہے، اور اپنا شمار بھی انھیں برگزیدہ اقوام میں کرتا ہے جنھیں رنگین آبادیوں پر حکومت کرنے کا حق ہے، اس لئے ہم اس کے طرزِ عمل کو سمجھ سکتے ہیں۔ انگلینڈ نے ہمیشہ روباہ بازی سے کام لیا ہے۔ ہمیشہ ایک قوم کے مختلف عناصر میں تفرقے ڈال کر یا ان کے اختلافات کو سیاسیات کا مدار بنا کر انھیں اپنا حلقہ بگوش بنایا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دنیا میں اٹلی، جاپان اور جرمنی خوب فروغ حاصل کریں اور انگلینڈ کا تسلط ٹوٹے تبھی دنیا میں اصلی جمہوریت، اصلی امن پیدا ہوگا۔ موجودہ تہذیب جب تک نہ مٹ جائے گی دنیا میں امن کا راج نہ ہوگا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کمزور قوموں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح جس طرح کمزور پودوں کو، صرف اس لئے نہیں کہ ان کا وجود انھیں کے لئے عذاب کا باعث ہے، بلکہ اس لئے کہ وہی دنیا کی اس کش مکش اور خونریزیوں کی ذمہ دار ہیں۔

مجھے بھلا اس رائے سے کیوں اتفاق ہونے لگا۔ میں نے جواب تو دیا اور ان خیالات کی اتنی ہی زوردار الفاظ میں تردید بھی کی۔ مگر میں نے دیکھا اس معاملہ میں وہ عقل سلیم سے کام نہیں لینا چاہتی یا نہیں لے سکتی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ہیلن کو اپنا مہمان کیسے بناؤں۔ اگر ہوٹل میں ٹھہراؤں تو خدا جانے اپنے دل میں کیا کہے، اگر اپنے گھر لے جاؤں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ وہاں ایسی خوش مذاق اور امیرانہ مزاج نازنین کے لئے آسائش کے کیا سامان ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میں کرکیٹ اچھا کھیلنے لگا اور پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر اسی کا ہو رہا اور ایک اسکول میں ماسٹر ہوں مگر گھر کی حالت بدستور ہے۔ وہی پرانا اندھیرا بوسیدہ مکان، تنگ گلی ہیں، وہی پرانی روش، وہی پرانا ڈھچر، اماں تو شاید ہیلن کو گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیں اور یہاں تک نوبت ہی کیوں آنے لگی ہیلن خود دروازے ہی سے بھاگے گی، کاش آج اپنا مکان ہوتا، آراستہ و پیراستہ، میں اس قابل ہوتا کہ ہیلن کی مہمانداری کر سکتا۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی لیکن بے سروسامانی کا بُرا ہو۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہیلن نے قلی سے اسباب اٹھوایا اور باہر آکر ایک ٹیکسی بلا لی۔ میرے لئے اس ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے سوا دوسرا چارہ کیا باقی رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میں اسے اپنے گھر لے جاتا تو اس بے سروسامانی کے باوجود وہ خوش ہوتی۔ ہیلن خوش مذاق ہے مگر نازک دماغ نہیں ہے وہ ہر ایک قسم کی آزمائش اور تجربہ کے لئے تیار رہتی ہے۔ ہیلن شاید آزمائشوں کو اور ناگوار تجربوں کو بلاتی ہے مگر مجھ میں نہ یہ تخئیل ہے نہ وہ جرأت۔

اس نے اگر ذرا غور سے میرا چہرہ دیکھا ہوتا تو اسے معلوم ہوتا، اس پر کتنی ندامت اور کتنی بیکسی جھلک رہی تھی۔ مگر ظاہر داری کا نباہ تو ضروری تھا، میں نے احتجاج کیا۔ میں تو آپ کو بھی اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا، آپ الٹا مجھے ہوٹل لئے جا رہی ہیں۔

اس نے شرارت کے انداز سے کہا۔ اسی لئے کہ آپ میرے قابو سے باہر نہ ہو جائیں، میرے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہوتی کہ آپ کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤں۔ لیکن محبت حاسد ہوتی ہے یہ آپ کو معلوم ہے، وہاں آپ کے احباب آپ کے وقت کا بڑا حصہ لے لیں گے آپ کو مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہ ملے گا اور مرد بالعموم کتنے بے مروت اور زود فراموش ہوتے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہیں اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ میں تمہیں ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر تم مجھے بھولنا بھی چاہو تو نہیں بھول سکتے۔

مجھے اپنی اس خوش نصیبی پر حیرت ہی نہیں خواب کا گمان ہونے لگا۔ حسن جسینہ کی ایک نظر پر میں اپنے کو قربان کر دیتا وہ یوں مجھ سے اظہار محبت کرے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اسی بات پر اس کے قدموں کو پکڑ کر سینے سے لگا لوں اور آنسوؤں سے تر کر دوں۔

ہوٹل میں پہونچے میرا کمرہ الگ تھا، کھانا ہم نے ساتھ کھایا اور تھوڑی دیر تک وہیں ہری ہری گھاس پر ٹہلتے رہے، کھلاڑیوں کا کیسے انتخاب کیا جائے یہی مرحلہ تھا۔ میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ساری رات اس کے ساتھ ٹہلتا رہوں۔ لیکن اس نے کہا آپ اب آرام کریں، صبح بہت کام کرنا ہے۔ میں اپنے کمرہ میں جاکر لیٹ رہا، مگر ساری رات نیند نہیں آئی۔ ہیلن کا باطن ابھی تک میری نظر وں سے چھپا ہوا ہے، ہر لمحہ وہ میرے لئے معمہ ہوتی جا رہی ہے۔

---

۱۲ جنوری۔ آج دن بھر لکھنؤ کے کرکٹروں کا مجمع رہا، ہیلن شمع تھی اور پروانے اس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ یہاں سے میرے علاوہ دو صاحبوں کا کھیل ہیلن کو بہت پسند آیا، مرجندرا اور صادق، ہیلن انھیں آل انڈیا ٹیم میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں اس فن کے استاد ہیں لیکن انھوں نے جس طرح شروعات کی ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرکٹ کھیلنے نہیں اپنی قسمت کی بازی کھیلنے آئے ہیں۔ ہیلن کس مزاج کی عورت ہے یہ سمجھنا دشوار ہے۔ مرجندر مجھ سے زیادہ قبول صورت ہے، یہ مجھے تسلیم ہے، وضع قطع سے پورا صاحب ہے لیکن پکا شہدا، لوفر، میں نہیں چاہتا کہ ہیلن اس سے کسی قسم کا تعلق رکھے، ادب تو اُسے چھو نہیں گیا، بدزبان پرلے سرے کا، بیہودہ، فحش مذاق، گفتگو کا سلیقہ نہیں، محل و موقع کی تمیز نہیں۔ بعض اوقات ہیلن سے ایسے پر معنی کنائے کر جاتا ہے کہ میں شرم سے سر جھکا لیتا ہوں۔ لیکن ہیلن کو شاید اس کا بازاری پن اس کا ابتذال محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ شاید اس کے فحش کنایوں کا مزہ لیتی ہے۔ میں نے اُسے کبھی چیں بہ جبیں نہیں دیکھا۔ یہ میں نہیں کہتا کہ شگفتہ طبعی کوئی بری چیز ہے۔ نہ زندہ دلی کا میں دشمن ہوں لیکن ایک لیڈی کے ساتھ تو ادب و قاعدے کا لحاظ رکھنا ہی چاہیئے۔

صادق ایک معزز خاندان کا چراغ ہے، بہت ہی ثقہ، بلکہ سرد مزاج، نہایت مغرور، بظاہر ترش رو لیکن اب وہ بھی شہدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ کل آپ ہیلن کو اپنے اشعار سناتے رہے اور وہ خوش ہوتی رہی۔ مجھے تو اُن اشعار میں کوئی مزہ نہ آیا۔ اس سے پہلے میں نے ان حضرت کو کبھی شاعری کرتے نہیں دیکھا، یہ کیفیت کہاں سے پھوٹ پڑی ہے؟ حسن میں اعجاز کی قوت ہے اور کیا کہوں، اتنا بھی نہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سوچا کہ اُسے اشعار ہی سُنانا ہے تو حسرت یا جگر یا جوش کے کلام کے دو چار شعر یاد کر لیتا۔ ہیلن سب کا کلام پڑھے بیٹھی ہے۔ آپ کو شعر گفتن چہ ضرور۔ مگر یہی بات اُن سے کہہ دل تو بگڑ جائیں گے۔ سمجھیں گے مجھے رشک آ رہا ہے۔ مجھے کیوں رشک آنے لگا۔ ہیلن کے پرستاروں میں ایک میں بھی ہوں ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز کر سکے۔ ہر شخص سے بے تکلفی مجھے پسند نہیں۔ مگر ہیلن کی نظروں میں سب برابر ہیں، وہ باری باری سب سے بے تکلف ہے اور سب سے ملتفت، کس کی جانب زیادہ مائل ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ صادق کی دولت و ثروت سے وہ مطلق متاثر نہیں معلوم ہوتی کل شام کو ہم لوگ سینما دیکھنے گئے تھے۔ صادق نے آج غیر معمولی فیاضی دکھائی۔ جیب سے روپے نکالکر سب کے لئے ٹکٹ لینے چلے، میاں صادق جو اس تمول کے باوجود بھی تنگدل واقع ہوئے ہیں، میں تو خسیس کہوں گا، ہیلن نے اُن کی فیاضی کو بیدار کر دیا ہے، مگر ہیلن نے انھیں روک لیا اور خود اندر جاکر سب کے لیے ٹکٹ لائی اور یوں بھی وہ اتنی بے دردی سے روپے خرچ کرتی ہے کہ میاں صادق کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب اُن کا ہاتھ جیب میں جاتا ہے ہیلن کے روپے کاؤنٹر پر جا پہونچتے ہیں۔ کچھ بھی ہو میں تو ہیلن کی مزاج شناسی پر فدا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ہماری فرمائشوں کی منتظر رہتی ہے اور اُن کی تعمیل میں اُسے خاص لطف آتا ہے۔ صادق صاحب کو اس نے اپنا البم نذر کر دیا جو یورپ کی نایاب تصاویر کی نقلوں کا مجموعہ ہے۔ اور جو اس نے یورپ کے سارے نگارخانوں میں جاکر خود مرتب کیا ہے۔ اس کی نظر میں کتنی حسن پسند ہیں۔ برجندر جب شام کو اپنا نیا سوٹ پہن کر آیا جو اس نے ابھی سلایا ہے تو ہیلن نے مسکرا کر کہا، چشم بد دور، آج تو تم یوسفِ ثانی بنے ہوئے ہو۔ برجندر باغ باغ ہو گیا۔ میں نے جب ذرا لحن کے ساتھ اپنی تازہ غزل سُنائی تو وہ ایک ایک شعر پر اچھل اچھل پڑی، بلا کی سخن فہم ہے۔ مجھے اپنے ذوقِ سخن پر اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی، مگر جب تحسین صلائے عام ہو جاتی ہے تو اس کی کیا وقعت۔ میاں صادق کو کبھی اپنی وجاہت کا دعویٰ نہیں ہوا۔ معنوی حسن سے آپ جتنے بہرہ ور ہیں حسنِ ظاہر سے اتنے ہی بے نصیب، مگر آج ساغر کے دور میں جونہی ان کی آنکھوں میں سُرخی آئی ہیلن نے والہانہ انداز سے کہا ظالم تمہاری یہ آنکھیں تو جگر کے پار ہوئی جاتی ہیں، اور صادق صاحب اس وقت اس کے قدموں کی جبہ سائی کرتے کرتے رُک گئے، شرم مانع ہوئی۔ ان کی آنکھوں کی اتنی قدر افزائی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مجھے کبھی اپنی وضع قطع کی تعریف سننے کی تمنا نہیں ہوئی۔ میں جو کچھ ہوں جانتا ہوں۔ مجھے یہ مغالطہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں خوش رُو ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہیلن کے یہ نوازشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ لیکن اب مجھے بھی یہ اضطراب ہونے لگا کہ دیکھوں مجھ پر کیا عنایت ہوتی ہے کوئی بات نہ تھی مگر میں بے چین رہا۔ جب میں شام کو یونیورسٹی گراؤنڈ سے مشق کر کے آ رہا تھا تو میرے یہ پریشان بال کچھ اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ اس نے گویا دزدیدہ نظروں سے دیکھ کر فوراً کہا "تمہاری اس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زلفِ پریشاں پر نثار ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ میں نہال ہو گیا، دل میں کیا کیا طوفان اٹھے کہہ نہیں سکتا۔ مگر خدا جانے کیوں ہم تینوں میں سے ایک بھی اس کی کسی ادا یا انداز یا حسن کی الفاظ میں داد نہیں دے پایا۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں موزوں الفاظ نہیں ملتے، جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں۔ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

یکم فروری۔ ہم دہلی آ گئے۔ اس اثنا میں مراد آباد، نینی تال، دیرہ دون، وغیرہ مقامات کے دورے کے مگر کہیں کوئی کھلاڑی نہ ملا، علی گڑھ اور دہلی سے کئی اچھے کھلاڑیوں کے ملنے کی اُمید ہے اسلئے ہمارا قیام یہاں کئی دن رہیگا۔ الیون ہوتے ہی سب لوگ بمبئی آ جائیں گے اور وہاں ایک مہینہ مشق کریں گے مارچ میں آسٹریلین ٹیم یہاں سے رخصت ہو گی، تب تک وہ ہندوستان میں سارے موعودہ میچز کھیل چکی ہو گی۔ ہم اس سے آخری میچ کھیلیں گے اور خدا نے چاہا تو ہندوستان کی ساری شکستوں کی تلافی کر دیں گے۔ صادق اور برجندر بھی ہمارے ساتھ گھومتے رہے، میں نہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ آئیں مگر ہیلن کو شاید عشاق کے مجمع میں لطف آتا ہے۔ ہم سب کے سب ایک ہی ہوٹل میں مقیم ہیں، اور سب ہیلن کے مہمان ہیں، اسٹیشن پر پہونچے تو صدہا آدمی ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھے کئی عورتیں بھی تھیں لیکن ہیلن کو نہ معلوم کیوں عورتوں سے احتراز ہے، ان کی صحبت سے بھاگتی ہے، خاص کر حسین عورتوں کے سائے سے بھی گریز کرتی ہے۔ حالانکہ اُسے کسی حسینہ سے بدظن ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ حسن اس پر ختم نہیں ہو گیا ہے۔ اس میں جاذبیت کے ایسے عناصر موجود ہیں کہ کوئی حور بھی اس کے مقابلہ میں نہیں کھڑی ہو سکتی۔ نک سک ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ حسنِ مذاق، حسنِ گفتار، حسنِ ادا بھی تو کوئی چیز ہے۔ محبت اس کے دل میں ہے یا نہیں خدا جانے، لیکن محبت کے اظہار میں اُسے ید طولیٰ ہے۔ دلجوئی اور ناز برداری کے فن میں ہم جیسے دل داروں کو بھی اس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شام کو ہم لوگ نئی دہلی کی سیر کو گئے، پُر فضا مقام ہے، کشادہ سڑکیں، خوبصورت مربعے دلفریب روشیں، اس کی تعمیر میں سرکار نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے اور بے ضرورت۔ یہ رقم رعایا کی فلاحی تجاویز میں صرف کی جا سکتی تھی۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ عوام اس کی تعمیر سے جتنے متاثر ہیں اتنے کسی فلاحی تجویز سے نہ ہوتے۔ آپ دس پانچ مدرسے زیادہ کھول دیتے یا سڑکوں کی مرمت میں، یا زراعتی تحقیقاتوں میں اس روپیہ کو صرف کر دیتے۔ مگر عوام کو تزک واحتشام اور شان و شکوہ سے آج بھی جتنی رغبت ہے اتنی آپ کے تعمیری کاموں سے نہیں ہے۔ فرمانروا کا جو تخیل اس کے وجود کے ذرے ذرے میں سرایت کر گیا ہے وہ ابھی صدیوں تک نہ مٹے گا۔ فرمانروا کے لئے شان و شکوہ ضروری ہے ایسے دریغ روپیہ خرچ کرنا ضروری ہے کفایت شعار یا بخیل

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانروا بیا ہے وہ ایک ایک پیسہ رعایا کے فلاح کے لئے خرچ کرے اتنا مقبول اور ہر دلعزیز نہیں ہو سکتا
انگریز نفسیات کے ماہر ہیں۔ انگریز ہی کیوں، ہر ایک فرمانروا جس نے اپنے زورِ بازو اور قوتِ فکر سے
یہ درجہ حاصل کیا ہے فطرتاً نفسیات کا ماہر ہوتا ہے اس کے بغیر عوام پر ایسے اقتدار کیونکر حاصل ہوتا خیر،
یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مجھے ایسا اندیشہ ہو رہا ہے کہ شاید ہماری ٹیم خواب ہی رہ جائے ابھی سے ہم لوگوں
میں چشمک رہنے لگی ہے۔ برجندر قدم قدم پر میری مخالفت کرتا ہے۔ میں اگر کہوں تو وہ یقیناً الٹی
کہے گا۔ اور ہیلن اس کی جانب ملتفت ہے۔ زندگی کے کیسے کیسے میٹھے خواب دیکھنے لگا تھا، مگر برجندر،
احسان فراموش، خودغرض برجندر میری زندگی تباہ کئے ڈالتا ہے، ہم دونوں ہیلن کے منظورِ نظر نہیں
رہ سکتے، یہ طے شدہ بات ہے، ایک کو میدان سے ہٹنا پڑے گا۔

---

۱۰ فروری۔ شکر ہے دہلی میں ہماری کوشش بار آور ہوئی، ہماری ٹیم میں تین نئے کھلاڑیوں کا اضافہ
ہوا، جعفر، مہرا اور ارجن سنگھ، آج ان کے کمال دیکھ کر آسٹریلین کرکٹروں کی دھاک میرے دل
سے جاتی رہی۔ تینوں گیند پھینکنے ہیں۔ جعفر قادر انداز ہے، مہرا صبر آزما اور ارجن شاطر تینوں مستقل
مزاج، نگاہ کے سچے اور انتھک، اگر کوئی انصاف سے پوچھے تو میں کہوں گا کہ ارجن مجھ سے بہتر کھیلتا
ہے۔ وہ دو بار انگلینڈ ہو آیا ہے۔ انگریزی معاشرت سے واقف ہے، اور مزاج شناس بھی اول درجہ
کا، تہذیب اور اخلاق کا پتلا، برجندر کا رنگ پھیکا پڑ گیا، اب ارجن پر خاص نظرِ عنایت ہے اور ارجن پر فتح
پانا میرے لئے آسان نہیں ہے، مجھے تو خوف ہے کہیں وہ میرا رقیب نہ بن جائے۔

---

۲۵ فروری۔ ہماری ٹیم پوری ہو گئی، دو پلیر ہمیں علیگڈھ سے ملے، تین لاہور سے اور ایک اجمیر سے
اور کل ہم بمبئی آ گئے۔ ہم نے اجمیر، لاہور اور دہلی میں وہاں کی ٹیموں سے میچ کھیلے اور ان پر بڑی شاندار
فتح پائی۔ آج بمبئی کی ہندو ٹیم سے ہمارا مقابلہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔
ارجن ہماری ٹیم کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے، اور ہیلن اس کی اتنی خاطرداری کرتی ہے کہ مجھے
رشک نہیں آتا، اتنی خاطرداری تو مہمان کی ہی کی جا سکتی ہے، مہمان سے کیا خوف، لطف یہ ہے کہ ہر
ایک شخص اپنے کو ہیلن کا منظورِ نظر سمجھتا ہے اور اس سے نازبرداریاں کرواتا ہے۔ اگر کسی کے سر
میں درد ہے تو یہ ہیلن کا فرض ہے کہ اس کی مزاج پرسی کرے، اس کے سر میں صندل تک گھس کر لگائے
مگر اس کے ساتھ ہی اس کا رعب ہر ایک کے دل پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ کوئی اس کے کسی فعل کی تنقید
کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہم سب اس کی مرضی کے غلام ہیں، وہ اگر سب کی نازبرداری کرتی
ہے تو حکومت بھی ہر ایک پر کرتی ہے شاید ان ایک ایک میں جھگڑا ہوتا ہے، مگر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہیلن کے قیدیوں کی مجال نہیں کہ کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی سکیں۔ ہر ایک کے دل پر ایسا خوف طاری رہتا ہے گویا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ارجن نے ایک مس پر یونہی کچھ نظر ڈالی تھی، ہیلن نے ایسی قہر کی آنکھوں سے اُسے دیکھا کہ سردار صاحب کا رنگ اُڑ گیا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ وہ اس کی تقدیر کی خالق ہے اور اُسے اپنی جانب سے بدظن کر کے وہ شاید زندہ نہ رہ سکے گا۔ اوروں کی تو میں کیا کہوں، میں نے بھی گویا اپنے کو اُس کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ مجھے تو اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ مجھ میں کوئی ایسی چیز فنا ہو گئی ہے جو پہلے میرے دل میں حسد کی آگ سی جلا دیا کرتی تھی، ہیلن اب کسی سے بولے، کسی سے راز و نیاز کی باتیں کرے، مجھے اشتعال نہیں آتا، دل پر چوٹ لگتی ضرور ہے، مگر اس کا اظہار تخلیہ میں آنسو بہا کر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ خودداری کہاں غائب ہو گئی، نہیں کہہ سکتا۔ ابھی اس کی خفگی سے دل کے ٹکڑے ہو گئے تھے کہ یکایک اس کی ایک نگاہِ غلط انداز نے یا ایک تبسم نے گدگدی پیدا کر دی۔ معلوم نہیں اُس میں وہ کونسی طاقت ہے جو اتنے حوصلہ مند، نوجوان دلوں پر حکومت کر رہی ہے۔ اُسے جسارت کہوں، مبادرت کہوں، یا کیا کہوں، ہم سب جیسے اس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں، ہم میں اپنی کوئی شخصیت، کوئی انفرادیت، کوئی ہستی نہیں ہے، اُس نے اپنے حسن سے، اپنی فراست سے، اپنی دولت سے، اور سب سے زیادہ اپنی ہمہ گیری سے ہمارے دلوں پر تسلط قائم کر لیا ہے۔

یکم مارچ۔ کل آسٹریلین ٹیم سے ہمارا میچ ختم ہو گیا۔ پچاس ہزار سے کم تماشائیوں کا ہجوم نہ تھا۔ ہم نے پورے اننگس سے شکست دی اور دیوتاؤں کی طرح پجے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دل و جان سے کام کیا اور سبھی یکساں طور پر چھوٹے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہوتے ہی اہلِ شہر کی جانب سے ہمیں ایک شاندار پارٹی دی گئی، ایسی پارٹی تو شاید وائسرائے کے اعزاز میں نہ دی جاتی ہوگی۔ میں تو تعریفوں اور مبارکبادوں کے بوجھ سے دب گیا۔ میں نے چوالیس (۴۴) رنوں میں پانچ کھلاڑیوں کا صفایا کر دیا تھا۔ مجھے خود اپنی ہلاکت آفرینی پر حیرت ہو رہی تھی، ضرور کوئی غیبی طاقت ہماری پشت پر تھی۔ اس مجمع میں بمبئی کا حسن اپنی پوری شان اور رنگینی کے ساتھ جلوہ افروز تھا اور مجھے دعویٰ ہے کہ حسن کے اعتبار سے یہ شہر جتنا خوش نصیب واقع ہوا ہے، دنیا کا کوئی دوسرا شہر شاید ہی ہو۔ مگر ہیلن اس مجمع میں بھی مرکزِ نگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ ظالم محض حسین نہیں ہے، شیریں بیان بھی ہے، شیریں ادا بھی، سارے نوجوان پروانوں کی طرح اُس پر منڈلا رہے تھے۔ ایک سے ایک قبول صورت، منچلے اور ہنس مکھ، ان کے جذبات سے کھیل رہی تھی، اُسی طرح جیسے وہ ہم لوگوں کے جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ ہمارا راجکمار جیسا شکیل جوان میں نے آج تک نہیں دیکھا، صورت سے رعب ٹپکتا ہے، ان کے عشق نے کتنے حسینوں کو دیوانہ ...یا ہے، کون جانے، مردانہ دلکشی کا جادو سا بکھیرتا چلتا ہے۔ ہیلن اُن سے بھی اُسی آزادانہ بے تکلفی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

سے ملی جیسے دوسرے ہزاروں نوجوانوں سے، اُن کے حسن کا، اُن کی دولت کا، اس پر مطلق کوئی اثر نہ تھا۔ نہ جانے اتنا غرور، اتنی خودداری اِس میں کہاں سے آگئی ہے، کبھی نہیں ڈگمگاتی، کہیں مرعوب نہیں ہوتی کبھی مائل نہیں ہوتی، وہی بدلہ سنجی ہے، وہی اظہار محبت، کسی کے ساتھ خصوصیت نہیں، دلجوئی سب کی مگر اسی استغنا کی شان کے ساتھ۔

ہم لوگ سیر کر کے کوئی دس بجے رات کو ہوٹل پہنچے تو سبھی زندگی کے نئے خواب دیکھ رہے تھے۔ سبھی کے دلوں میں ایک دھکڑ پکڑ سی ہو رہی تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ امید و بیم نے سبھی کے دلوں میں طوفان برپا کر رکھا تھا، گویا آج ہر ایک کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہونے والا ہے اب کیا پروگرام ہے، اس کی کسی کو خبر نہ تھی، سبھی زندگی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہر ایک نے اپنے دل میں سودائے خام پکا رکھا تھا، ہر ایک کو یقین تھا کہ ہیلن کی خصوصی نگاہ اس پر ہے۔ مگر یہ اندیشہ بھی ہر ایک کے دل میں تھا کہ خدانخواستہ کہیں ہیلن نے بیوفائی کی تو یہ جان اس کے قدموں پر رکھ دیگا۔ یہاں سے زندہ گھر جانا قیامت تھا۔

اُسی وقت ہیلن نے مجھے اپنے کمرہ میں بُلا بھیجا، جا کر دیکھتا ہوں تو سبھی کھلاڑی جمع ہیں۔ ہیلن اس وقت اپنی شربتی جالیدار ساڑھی میں آنکھوں میں چکاچوندھ پیدا کر رہی تھی، مجھے اس پر جھنجھلاہٹ ہوئی۔ اس مجمع عام میں مجھے بلا کر قواعد کرانے کی کیا ضرورت تھی، میں تو خاص برتاؤ کا مستحق تھا۔ میں بھول رہا تھا کہ شاید اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنے کو خاص برتاؤ کا مستحق سمجھتا ہو۔

ہیلن نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ "دوستو، میں کہہ نہیں سکتی کہ میں آپ لوگوں کی کتنی مشکور ہوں اور آپ نے میری زندگی کی کتنی بڑی آرزو پوری کر دی، آپ میں سے کسی کو مسٹر رتن لال کی یاد آتی ہے؟

"رتن لال! اُسے بھی کوئی بھول سکتا ہے، وہ جس نے پہلی بار ہندوستان کی کرکیٹ ٹیم کو انگلینڈ کی سرزمین پر اپنے کارہائے نمایاں دکھلانے کا موقع عطا کیا، جس نے اپنے لاکھوں روپے اس مہم کی نذر کیے اور آخر متواتر شکستوں سے مایوس ہو کر وہیں انگلینڈ میں خودکشی کر لی، اس کی وہ صورت اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔"

سب نے کہا "خوب اچھی طرح، ابھی بات ہی کے دن کی ہے۔"

"آج اس شاندار کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں، انشاء اللہ آئندہ سال ہم انگلینڈ کا دورہ کریں گے۔ آپ لوگ ابھی سے اس مہم کے لیے تیاری کیجیے، لطف تو جب ہے کہ ہم وہاں ایک میچ بھی نہ ہاریں، متواتر ہمارے ہاتھ میدان رہے۔ دوستو یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کا عمل ہی زندگی ہے۔ ہمیں کامیابی وہیں ہوتی ہے جہاں ہم اپنے پورے حوصلے سے سرگرم عمل ہوں۔ وہی مقصد [illegible]

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں اور کوئی خواہش، کوئی آرزو حائل نہ ہو۔ معاف کیجئے گا، آپ نے اپنے مقصد کے لئے جینا نہیں سیکھا۔ آپ کے لئے کرکٹ محض ایک شغلِ تفریح ہے، آپ کو اس سے عشق نہیں۔ اسی طرح ہمارے صدہا دوست ہیں جن کا دل کہیں اور ہوتا ہے دماغ کہیں اور۔ اور وہ ساری زندگی ناکام رہتے ہیں۔ آپ کے لئے میں زیادہ دلچسپی کی چیز تھی، کرکیٹ تو محض مجھے خوش کرنے کا ذریعہ تھا پھر بھی آپ کامیاب ہوئے۔ ملک میں آپ جیسے ہزارہا نوجوان ہیں جو اگر کسی مقصد کی تکمیل کے لئے جینا اور مرنا سیکھ جائیں تو معجزے کر دکھائیں۔ جائیے اور وہ کمال حاصل کیجئے۔ امیر احسن اور میری راہیں بازیچہ اکلفس بننے کے لئے نہیں ہیں، نوجوانوں کی آنکھوں کو خوش کرنے اور ان کے دلوں میں شور پیدا کرنے کے لئے جینا میں شرمناک سمجھتی ہوں۔ حیات کا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔ سچی زندگی وہی ہے جہاں ہم اپنے لئے نہیں، سب کے لئے جیتے ہیں!"

ہم سب سر جھکائے سنتے رہے اور جھنجھلاتے رہے اور ہیلن کمرہ سے نکل کر کار پر جا بیٹھی اس نے اپنی روانگی کا انتظام پہلے ہی کر لیا تھا۔ قبل اس کے کہ ہمارے ہوش و حواس صحیح ہوں اور ہم صورتِ حال سمجھیں وہ رخصت ہو چکی تھی۔

ہم سب ہفتے بھر تک بمبئی کی گلیوں، ہوٹلوں، بنگلوں کی خاک چھانتے رہے، ہیلن کہیں نہ تھی۔

اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس نے ہماری زندگی کا جو آئیڈیل رکھا وہ ہماری پہونچ سے اونچا ہے۔ ہیلن کے ساتھ ہماری زندگی کا سارا جوش اور ولولہ غائب ہو گیا ہے۔

⁘ ⁘ ⁘ ⁘

۱۔ خیر خیرات افلاس کو، خوش خلقی بگڑی ہوئی حالت کو، عقل جہالت کو، اور عبادت خوف کو دفع کر دیتی ہے۔

۲۔ خواہش و طمع کے برابر دوسرا کوئی تکلیف دہ مرض نہیں ہے۔

۳۔ خدا رسیدہ شخص کی نظر میں بہشت کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ بہادر آدمی کو اپنی جان تنکے کے برابر معلوم ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنے دل اور اعضا کو قابو میں کر لیا ہو، اس کو حسین سے حسین عورت بھی اپنا فریفتہ نہیں کر سکتی۔ جس کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی اس کے نزدیک کل دنیا ہیچ ہے۔

زمانہ ستمبر ۱۹۰۹ء

"فضائح جانکیہ"

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

عورتوں کی مضمون نگاری

مسٹر شفیع احمد قدوائی صاحب

از زمانہ، ستمبر ۱۹۲۹ء

کہتے ہیں کہ ایک ستم ظریف کسان جہاں جاتا اپنے گدھے کو ساتھ لے جاتا اور اسے شیر کی کھال پہنا کر دوسروں کے کھیت روندنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتا۔ دیہات کے سیدھے سادے لوگ اسے شیر سمجھ کر اس کے پاس پھٹکنے کی بھی ہمت نہ کرتے۔ مدتوں مسٹر گدھے دوسروں کے خون پسینہ کی کمائی سے اپنا پیٹ پالتے رہے۔ آخر ایک دن جب وہ حسب عادت چر چگ رہے تھے تو بھرے پیٹ پر اپچ کی سوجھی۔ طبیعت نہ مانی اور بلا ارادہ انھوں نے اپنا گیت گانا شروع کر دیا۔ پھر کیا تھا اصلیت کا پتہ لگتے ہی گنواروں نے جی بھر کر خاطر تواضع کی۔ اس کہانی کو تھوڑی سی مشابہت عورتوں کی جرنلزم سے بھی ہے۔ کیونکہ مدتوں تک ہماری جرنلزم کا گدھا شیر کی کھال پہنے ادب، تاریخ، سیاست، سب کے کھیتوں کو روندتا رہا اور آخر کار ملک پر انقلاب کا رنگ چڑھتے ہی ڈھول کا پول کھل گیا۔

آج خود ہم کو بھی پتہ لگ گیا ہے کہ ہم کتنے پانی میں ہیں ویسے لکھنے پڑھنے کا شوق تو بہت دنوں سے پیدا ہو گیا تھا اور جب سے یہ اکا دکا رسالے عورتوں کے نام سے چھپنے لگے تب سے اور بھی جی میں امنگ پیدا ہوئی کہ لاؤ اپنا مت بھید بھی سنائیں۔ میں جانتی ہوں وہ شاید شروع ہی کے دن تھے، جب اکبر الہ آبادی نے جل کر کہا تھا ؎

شوق تحریر مضامین میں کھلی جاتی ہیں   بیٹھ کر پردہ میں بے پردہ ہوئی جاتی ہیں

عورتیں بیچاریاں ذرا سی بہانے پڑھے لکھے لوگوں میں شامل ہو جایا کرتی تھیں۔ ادب اور تاریخ سے انجان رہ کر مصنف لوگوں کی فہرست میں چھپ جانے کے لیے چڑے چڑیا کی کہانی کافی ہو جایا کرتی تھی لیکن خدا مردوں کا بھلا کرے، اس میں بھی وہ آن کو دے۔ کبھی میاں بیوی کا برقعہ اوڑھ کر، کبھی بھائی بہن کے نام سے اور اکثر یہ کالج کے لڑکے اپنے کو عورتوں کی نظر میں جچانے کے لیے بڑے مضمون نگار بن بیٹھے۔ ایڈیٹر ایک دو کو چھوڑ رسالے کے سارے مرد تھے، وہ اپنا من مانا لکھواتے اور چھپواتے۔ ہر رسالہ کے سرورق پر عورتوں اور بچوں کے لیے لکھا رہتا تھا۔ کیونکہ ان عقلمند لوگوں کے نزدیک سمجھ بوجھ میں عورت اور بچہ برابر تھا۔ بیچاری عورتوں کو سکھایا بھی یہی جاتا تھا کہ قصہ لکھو یا نظم، سب کو پیٹ پاٹ کر ”راہ نجات“ یا ”بہشتی زیور“ بنا دو۔ اکیلے گھر والے یہ ڈھونس جماتے تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ اخبار رسالے والے بھی جان مارے رہتے تھے کہ جو لکھو راہ نجات کے ڈھرے پر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

1

نتیجہ یہ ہوا کہ ہر چودہ برس کی لڑکی بوا بن کر رہ گئی۔ بڑی بوڑھیوں کی طرح نصیحت کرنے کا ایسا شوق بڑھا کہ تحریر دیکھ کر اس بات کا پتہ ہی نہ لگتا تھا کہ ہمارے آپ کے سامنے منی چھوکری بول رہی ہے یا خاندان بھر کی نانی دادی۔ باوا آدم کے وقت کی باتیں کرنے کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ قلم ہاتھ میں لیا اور ساری ماؤں بہنوں کو جنت کا سیدھا راستہ بتا دیا۔ خیر اللہ کا شکر ہے، تھوڑے ہی دن بیتے تھے کہ ملک کا رنگ بدل گیا۔ عورتوں کی حرم بھی آسمان سے اُتر کر زمین پر آئی۔ اس دور میں وعظ بیان کرنے کا شوق تو کم ہو گیا لیکن نہ پڑھائی پوری تھی نہ فیشن۔ اس لیے سب آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گیا۔ افسانے بھی لکھے گئے، نظمیں بھی ہوئیں اور غزل بھی۔ تاریخ، سیاست، خانہ داری، دلچسپی تو سب چیزوں سے پیدا ہو گئی۔ لیکن افسانہ لکھا تو ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا راشد الخیری کی نقل کی۔ مضمون میں سید ممتاز علی یا حسن نظامی کا خاکہ اڑایا، اور غزل گائی تو داغ یا امیر مینائی کی دھن میں، سیاست سے دلچسپی صرف جلسوں میں رائے زنی کرنے یا تقریر کرنے والوں کی تعریف تک محدود رہی۔

فیشن کا اثر افسانوں پر بہت پڑا۔ کبھی بی جڑیا ڈرائنگ روم میں پیازی ساڑی باندھے بیٹھی نظر آئیں اور چھڈے صاحب باتھ روم سے سوٹ ہاتھ میں لیے برآمد ہوئے۔ ادب تمیز کے ساتھ اپنی ڈارلنگ سے بھونڈی بھونڈی دو چار باتیں کیں اور موٹر پر سوار ہو دونوں ہوا خوری کو نکل گئے۔ دکھ بھری کہانیوں کی حد نہ رہی جہاں دیکھو کسی نہ کسی عقل کے اندھے، گانٹھ کے پورے شوہر پر بیوی صدقہ قربان ہو رہی ہے کبھی اس کے قدموں پر آقا اور مالک کہتی ہوئی لوٹتی نظر آئی۔ یہاں سے لے کر ساس سسر تک کی جوتیاں کھا کر گھر سے نکل گئی اور قبر میں منہ چھپا کر سو رہی، یہ ہوئے افسانے۔ ان میں اکثر کوئی دل جلی ہارمونیم پر گاتی نظر آئی اور انگریز عورتوں نے تحسین ناشناس سے ہندوستانی گانوں کی عزت بڑھائی۔ شعر اور افسانہ دونوں کو عورتوں نے جی بھر کر رگڑا۔ ابا کی شان میں قصیدے لکھے گئے۔ ننھی بٹیا اور منے بھیا کے لیے جھولا تیار ہوا اطاعت اور عصمت کا راگ الاپا گیا۔ کبھی بہنوں سے خطاب ہوا ؎

بہنوں پیاری تمھیں اللہ چلائے تھوڑا
کبھی بہکائے نہ شیطان ستائے تھوڑا
ساتھ شوہر کے رہو بن کے پہاڑی ٹانگن
نکلو باہر تو ذرا آنکھ جھکائے تھوڑا
بیوی اچھی ہے وہی ہاتھ ہوں جس کے انجن
بیر پہیے ہوں مگر بین بجائے تھوڑا

کبھی عشق پر غزل لکھی

نیلگوں ہے فلک جام میں فردوس خیال
گردش ہے بساط فلک انجم افروز
صانع حسن ازل جذبہ محبت اسوا
قدرت محبوب حق آغوش واماں ہوا

غرض یہ ساری چیزیں بلا ردیف اور قافیہ، معنی اور مطلب کے نظم کر ڈالیں۔ کبھی گھر پھر زندگی کی برائیاں کیں تو کبھی اپنی بےبسی کا رونا رویا۔ بزموں اور محفلوں کے بہانے دنیا پر ثابت کر دیا کہ ع

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کسی کے پیارے مولوی صاحب کا کولہا اتر گیا اور دوا علاج کا بوجھ یا جڑی بوٹیوں کی چھان بین ادبی مذاق رکھنے والی بہنوں کے سپرد کی گئی۔ کسی بہن نے اپنے بہرے پن اور میاں کے خبط کی دوا لقمانِ صفت بہنوں سے پوچھ ڈالی۔ درزی سے لے کر لوہار اور سنار تک کی دوکانوں کا پتہ پوچھا۔ بھانجی بھتیجی کی شادی یا بہن بہنوئی کے نتیجہ حماقت کے لیے تاریخی نام اور قطعوں کی فرمائش کر دی۔ غرض ان دنوں عورتوں کی جرنلزم ایک ایسا اونٹ تھی، جس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی اور سب پر طرہ وہ نقالی والا کوڑھ تھا۔ اعتراض کرنے کو تو سب ہی کرتے ہیں اور میں بھی کہتی ہوں لیکن انصاف سے دیکھیے تو آخر پھر کیا لکھتیں۔ انھوں نے دیکھا کیا تھا۔ اونچی اونچی دیواروں والا جیل نما مکان۔ گاؤ تکیہ سے لگ کر چھالیہ کترنے والی سست عورتیں اور بدتمیز لڑاکو نوکر۔ یہ تھا ان کا تجربہ اور ان کا ماحول۔ کہتے ہیں افسانہ زندگی کی سچائیاں دکھاتا ہے اور شاعری دماغی خیالات کی چلتی آنکھ ہے۔ جو کچھ ہو، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن یہاں تو عورتوں کے رسالہ خالی پیٹ، پیٹ رہے تھے۔ آخر ان کو بھرنا بھی تھا اب اس کے لیے عاشق ہونے کون جاتا اور دنیا دیکھنے کی کیسے اجازت ملتی۔ اٹکل پچو جو جی میں آیا لکھ مارا۔ جب سے پڑھی لکھی عورتوں کی تعداد بڑھنے لگی ہے تھوڑی بہت جرنلزم بھی اونچی ہو رہی ہے۔ دو چار سچ مچ کی شاعرہ اور چند اچھے بھلے قصے لکھنے والیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ ذرا بیچ میں اردو کچھ من اتری ہو گئی تھی۔ انگریزی کا بڑا زور تھا۔ سو اب تو اس کا غرور ڈھے گیا ہے۔ اب تو رسالوں میں گاندھی جی کی سیاست اور ٹیگور کا فلسفہ بھی نظر آتا ہے۔ وہ فلسفہ جسے "اپنا لکھا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" کہنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا جب قومی لیڈر بننے کا گر تعلیم نسواں اور ہندوستانیوں کے حق حقوق پر لڑنے جھگڑنے تک محدود تھا۔ لیکن اب تو ایسا زمانہ بدلا ہے جن کے جاہل عورت کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے، تعلیم یافتہ لڑکیوں کو دیکھ کر منہ بناتے، فیشن ایبل بیویوں میں کیڑے ڈالتے اور سیاست داں بیوی پر آوازے کستے ہیں۔ اللہ جانے یہ کیوں کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ خیر یہ تو بات میں بات نکل آئی ہے ہاں تو ہوا یہ کہ عورت آگے تو بڑھی، تقریریں کرتی، مضمون لکھتی اور افسانوں کے پلاٹ سوچتی ہوئی، لیکن سوجھ بوجھ، اپج، جیالے پن کو دھکے دیتی ہوئی یہاں تک آئی۔ سیکھنے سمجھنے کی ضرورت تو سب کو ہوتی ہے مگر یہاں کون ایسا بیٹھا تھا جو ٹھنڈے دل سے سوچتا کہ لڑکیوں کو الگ بیٹھ کر سکھاؤ پڑھاؤ اور بڑی عورتوں جدا بیٹھ کر خوش گپیاں اڑائیں۔ یہاں تو جدھر دیکھو وہی اصلاح والا ڈھونگ رچا ہوا ہے حالانکہ اصلاحی شاعری، اصلاحی افسانوں، اور اصلاحی مضامین وہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں ہیں جنھیں برسوں گزرے مردوں نے اپنے دسترخوان سے جھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ کیا غضب ہے کہ آج تک عورتیں ان پر ندیدوں کی طرح ٹوٹی پڑتی ہیں۔

ویسے رنگ تو بہت بدل گیا ہے اور ادھر دو برس سے ذرا ملک کی جوتی پیزار نے ان کے کان کھڑے کر دیے ہیں، اسی لیے اب ہوا میں قلعہ بنانا کم ہوتا جا رہا ہے لیکن کہاں تک؟ ملک تو نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ اقبال کی تجارتی لے کو جوش اور ساغر کے ساتھ ہندوستانی راگ بن کر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نکلے بہت دن ہو چکے۔ لیکن عورتیں ابھی لکیر ہی پیٹ رہی ہیں۔ اور وہاں ترقی پسندوں کا غول پھونک پھونک کر چلاتا ہوا بڑھا چلا آ رہا ہے۔ نوجوان انقلابی کھرپا اور کلہاڑا لیے جھاڑیوں کانٹوں سے میدان صاف کرتے آ رہے ہیں۔ ان کی لکڑ توڑ شاعری میں نہ مے ہے نہ معشوق۔ ان کے یہاں محبوب "چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے" نہیں آتا ہے بلکہ میلی پگیا سر پہ جمائے، گاڑھے کی مرزئی پہنے، سر پر گارے کا ٹوکرا رکھے مزدور "مرے جا رہے ہیں" "بڑھے جا رہے ہیں" کہتا ہوا نازل ہوتا ہے۔
اب ساقی کی صراحی، شراب ارغوانی کے بدلے خون اگلتی ہے اور دہان من موہنی کی جگہ دیہات کی ٹھوس گنواری لہنگا پھڑکاتی، چوڑیاں بجاتی غصہ میں ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی، امیروں کو اپلے کی طرح پاتھ ڈالنے تشریف لاتی ہے۔ ابھی کیا، تھوڑے دن میں دیکھیے گا۔ کون کہہ سکتا ہے دس ہی پانچ برس کے اندر یہ چنگاری سچ مچ انگارے نہ اگلنے لگے گی۔ غرض ملک میں تو یہ کچھ ہو رہا ہے۔ انقلاب کی پکار ہو رہی ہے۔ نئے ادب کا پرچم لہرایا جا رہا ہے اور یہاں غزل جو مسلمانوں کی بگڑی ہوئی تقدیر کی نشانی اور کاہلی کی پوٹ بن کر ورثہ میں ملی تھی۔ نئے سرے سے پھر گھروں کے اندر جنم لے رہی ہے۔

ذرا اس ستم ظریفی کو دیکھیے، عورتیں غزل کہتی ہیں وہ بھی پردہ نشین۔ جن پر پوری جوان بھی نہیں ہونے پاتیں کہ ایک مرد ماں باپ کی رضامندی سے مسلط کر دیا جاتا ہے۔ لو اسے پوجو اور محبت کرو! پیاری پیاری گڑیا سی لڑکی پورے چھ فٹ لانبے دیودار سے باندھ دی جاتی ہے، یا فنون لطیفہ سے ذوق رکھنے والے نوجوان کے سر کالی کلوٹی ہتنی جیسی بیوی مڑھ دی جاتی ہے، یہ ہے یہاں کا دستور! اب آپ ہی بتائیے اس میں جذبات کہاں سے پیدا ہوں اور عشق کس سے لڑایا جائے۔ مجھے تو اسی میں شک ہے کہ کیا عورت غزل کہہ بھی سکتی ہے؟

کہتے ہیں عورت فطرت کا راز ہے، انسانیت کی ایک پہیلی ہے جسے بوجھنا ہر مرد کے لیے یہ پکی ہو یا نہ ہو۔ لیکن اس میں تو شبہ نہیں کہ وہ اپنی محبت، اپنے جذبات یا خواہش کا بے دھڑک اظہار نہیں کر پاتی۔ آپ کسی جاہل عورت کو دیکھیے جب وہ لڑنے یا تقریر کرنے پر آتی ہے تو گھنٹوں بے تکان بولتی چلی جاتی ہے نہ اس وقت اس کے پاس مثلوں کی کمی ہوتی ہے نہ محاوروں کی۔ لیکن جب وہ پیار کی آنکھوں سے اپنے شوہر کو دیکھ کر کچھ کہنا چاہتی ہے تو الفاظ حلق میں اٹک اٹک کر رہ جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی طرح اشاروں سے، کچھ آنسوؤں سے اور کچھ نگاہوں سے مدد لیے بغیر اپنا مطلب ادا ہی نہیں کر پاتی۔ نظر لاکھ پیام محبت دے لیکن اس پیام کو ڈگی پٹوا کر سب کو سنانا عورت کے بس کی بات نہیں۔ جوانی لاکھ دیوانی ہو، لیکن بھرے مجمع میں ہرگز نہیں کہہ سکتی ع

لو ان کی جوانی آ پہونچی، اب کیسے چھپیں گے دل کے جگر

عورت بے بس ہو کر آنسو بہاتی ہے لیکن زندان سے دیوانی ہو کر اک دم صحرا کی طرف نہیں بھاگتی نہ دفتر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ناکامی کو عنوانِ تمنا بنا کر مردوں کے سامنے پیش کرتی ہے جو وہ جھٹ سے کہہ دیں ؎

میں نے کہا کہ غیر کا کہنا نہ کیجیے
بولے وہ بیچ میں مرے بولا نہ کیجیے

جب دل پر چوٹ ہی نہیں تو درد بھرے راگ نکلیں گے کہاں سے؟ اور پھر غزل تو نری مردوں کی رام کہانی اور ساری انجمن کی بپتا ہوتی ہے۔ بھلا عورت اس میں کہاں سما جائے گی؟ نہ معلوم اُسے دربان کی گالیاں کھانے اور لیلیٰ کا کتا بننے کا کیا شوق چرّایا ہے؟ رہا عشق حقیقی سو میاں کی پانوں کی ڈبیہ اور میاں کا پیٹ بھرنے سے اتنی چھٹی کہاں؟ جو دو گھڑی آنکھیں موند اپنی آتما اونچی کر لیں۔ ہاں لغت اور دیوان کی مدد سے لفظوں کا ایک گورکھ دھندا بن سکتا ہے، اسے غزل یا بقول برنارڈ شاہ اگر یوروپ نیم دیوانوں کا ملک ہے تو ہندوستان کے مکمل دیوانوں کی بستی ہونے میں کوئی شک ہی نہیں یہاں غزل عورت کہتی ہے اور گیت مرد بناتے ہیں۔ اور سچ پوچھیے تو مردوں کی بے ہوئی بپتا اور بن آئی موت کی داستاں سنتے سنتے ملک کا پہلے ہی سے برا حال ہو چکا ہے بھلا اسے عورتوں کی زبان سے سیاپا سننے کی کیا ضرورت آ پڑی ہے؟

غرض جب ہماری اندھی سیدھی جرنلزم کا اب تک یہ حال ہو کہ کسی نہ کسی شہسوار کی گرد راہ سے اپنی منزل کا پتہ پوچھتی ہی رہی ہوں تو نئے ادب کا استقبال کون کرے اور کس کو پہچان ہے کہ پرانا ادب کون سی بلا تھی اور نیا ادب ہے کس چڑیا کا نام؟

سب کچھ جلی کٹی کہہ لینے کے بعد ذرا اپنی صفائی تو پیش کر لینے دیجیے۔ ایک بڑے آدمی نے کہا کہ اگر عورت کو پھانسی پانے کا حق ہے تو اسے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کا بھی حق ہے۔ پھر جب یہ دونوں حق آپ کو حاصل ہیں، تو مجھے اپنے جی کی بات کہنے کا کیوں نہ حق حاصل ہو؟ اگر آپ پھر ایسی گفتگو میں سننا چاہیں تو ذرا ناپ تول کر بات کہا کیجیے اور قلم سنبھال کر لکھا کیجیے۔ تاکہ اپنوں کا جی خوش ہو اور پرایوں میں ناک اونچی رہے!

⁂ ⁂ ⁂

نذر

لڑکے نے کہا "ابّا مجھے کیا دیجیے گا؟" میں نے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔ دوست نے کہا "مجھے کیا عنایت ہوگا؟" میں نے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ بھائی نے کہا "مجھے کیا ملے گا؟" میں نے اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ماں نے کہا "بیٹا مجھے کیا دو گے؟" میں نے جھک کر اس کے قدم چوم لیے۔ بیوی بولی "آخر میرا حصہ؟" میں نے محبت سے اس کا بوسہ لے لیا۔ اتنے میں ایک آواز آئی "میرے لیے بھی تیرے پاس کوئی تحفہ ہے؟" یہ سن کر میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے!

(ٹیگور)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اردو ادب پر طوائفوں کا اثر

پنڈت آنند نرائن ملّا، ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

زمانہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء

گزشتہ دور کے حالات اور واقعات تو تاریخ سے بخوبی معلوم ہو جاتے ہیں، لیکن وہ واقعات کیوں رونما ہوئے۔ اور وہ کون سی باتیں تھیں جو پس پردہ ان واقعات کی ذمہ دار تھیں، اس کے لیے تاریخ کے صفحات کافی نہیں ہوتے، اور ہمیں اس دور کے تمدن اور معاشرت کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ ہمارے لیے اس زمانہ کے ادب کا گہرا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادب زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور اگر ایک دور کا ادب بغور دیکھا جائے تو اس زمانے کے لوگوں کے احساسات اور خیالات، ان کی رسوم اور عقیدے، ان کے ذہنی اور جذباتی رجحانات، سب کا عکس اور تصویر صاف اور نمایاں نظر آتی ہے، کیونکہ ادب کے لیے ناممکن ہے کہ وہ زندگی سے متاثر نہ ہو۔ کسی شاعر اور ادیب کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل علیحدہ ہو جائے۔ اس لیے یہ سمجھنے کے لیے کہ اردو ادب پر طوائفوں نے کیا اثر ڈالا، ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ سمجھ لیں کہ ہماری معاشرت میں طوائفوں کی کیا جگہ تھی۔

قدرت نے جہاں عورت کو جسمانی اعتبار سے مرد سے کمزور بنایا ہے، وہاں اسے حیات کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک فوقیت بھی دی ہے۔ وہ اپنے جسم ہی کو ذریعۂ معاش بنا سکتی ہے، اور جہد زیست کی بازی میں اسے داؤں پر لگا سکتی ہے۔ عورت کا اولین پیشہ یہی تھا اور آج بھی جبکہ عورت مرد کے بہت کچھ ہمدوش آ گئی ہے، اس کے لیے زیست کی مشکلوں کو آسان بنانے کا اس سے بہتر دوسرا طریقہ نہیں۔ مختلف ملکوں میں اس جسم فروشی کے طریقے مختلف ہیں، اور مختلف مذہبوں نے مختلف رسموں کے حسین لباس پہنا کر اور شادی کا پاک اور مقدس نام دے کر اس حقیقت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر ملک میں آج بھی بہ کثرت ایسی عورتیں ہیں جو بغیر کوئی حسین نقاب پہنے ہوئے بالاعلان اپنا اولین پیشہ کر رہی ہیں۔ اکثر ملکوں کے جھگڑے اور [illegible] تمدن نے انھیں معاشرت کا جزو قبال کرنے سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گریز کیا ہے۔ لیکن ہندوستان کے جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت کی معاشرت میں اُن کی ایک اہم اور مستقل جگہ تھی۔

انیسویں صدی میں شمالی ہندوستان کے اُس حصہ میں جہاں اردو رائج تھی مسلمانوں کا راج تھا۔ دہلی میں شاہانِ مغلیہ تھے اور لکھنؤ میں شاہانِ اودھ۔ سیاسی اقتدار یا فوجی طاقت دونوں میں سے کسی کو نصیب نہ تھی۔ کیونکہ دونوں ایسٹ انڈیا کمپنی کے باجگذار اور نمک خوار تھے ایسی صورت میں جبکہ شاہی خزانے بھرے ہوئے تھے اور لوگوں کے پاس باپ دادوں کی چھوڑی ہوئی دولت کافی تھی شہزادوں رئیسوں اور امیروں کا عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے سوائے دوسرا کام نہ تھا۔ روز نئے سامانِ نشاط اور تفریح کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں اربابِ نشاط کی خاص قدر ہونا لازمی تھا۔ لیکن جس وجہ سے کہ وہ ہماری معاشرت پر چھائی ہوئی تھیں اس کی وجہ محض امرا کی عیاش مزاجی نہ تھی بلکہ پردہ کی رسم۔

پردہ ہندو اور مسلمان دونوں میں نہایت سختی سے رائج تھا۔ کسی رئیس شریف زادے کو اپنی ماں اور حقیقی بہن کو چھوڑ کر کسی اور عورت کو جو کہ خادمہ یا نیچ قوم نہ ہو دیکھنے کی نوبت نہ آتی تھی شادی حالانکہ صغیر سنی میں ہو جاتی تھی لیکن اس میں اس کی پسند کا کوئی سوال نہ تھا، کیونکہ شادی کے بعد ہی بیوی کی صورت دیکھنا نصیب ہوتی تھی۔ شادی دراصل دو خاندانوں کے خوشگوار تعلقات کو مستحکم اور استوار بنانے کے لیے کی جاتی تھی نہ کہ دو دلوں کا تقاضہ پورا کرنے کے لیے۔ یہی وجہ تھی کہ شادی کرنے والے افراد کی طبیعت، سن اخلاق یا رجحانات کا کوئی خیال نہ کیا جاتا تھا۔ اکثر خاوند اور بیوی کی عمر میں کافی فرق ہوتا تھا۔ شادی کے بعد بھی بیوی سے اختلاط برتنے کی اجازت نہ تھی، بڑوں کے سامنے خاوند کی مجال نہ تھی کہ بیوی سے ہنس کر بول سکے بیوی کی قدم قدم پر نندا اور بھاوجیں پاسبانی کرتی تھیں۔ اور اگر اُس نے اشارۃً یا کنایتاً خاوند سے ملنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بے حیا قرار دی جاتی تھی۔ گویا ہماری معاشرت میں خاوند بیوی کا کسی کے سامنے ایک دوسرے سے کسی قسم کا اظہار محبت کرنا برا اور مذموم سمجھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں نہ تو جوان لڑکا جس کے دل میں ہزاروں ارمان ہوتے تھے محبت کا کوئی مناسب تقاضا کر سکتا تھا اور نہ ایک رسم کی پابند اور سہمی ہوئی کم عمر نادان لڑکی اس کا کوئی مناسب جواب دے سکتی تھی۔

لیکن انسانی فطرت کو نہ رسم تبدیل کر سکتی ہے اور نہ مذہب قید کر سکتا ہے۔ بھوک اور پیاس کو چھوڑ کر عشق انسان کی فطرت کا سب میں زبردست تقاضا ہے۔ کسی تندرست نوجوان کو محض ایک روحانی ہم آہنگی کا حسین خواب دکھا کر تسکین نہیں دی جا سکتی۔ ہماری سماج کا خلاف فطرت دباؤ صرف یہاں تک کامیاب ہوا کہ اس نے عشق و محبت کے جذبی لوازمات کو گھروں سے نکال دیا۔ اس

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نے بازاروں میں نشوونما پائی۔ بیویوں نے رفتہ رفتہ ان باتوں کو جن سے جنسی خواہشات مشتعل ہوتی ہیں ترک کر دیا۔ انہوں نے کوشش کی کہ وہ دیویاں بن جائیں، وہ فخر سے اپنے بارے میں کہنے لگیں۔

عشق کا حال بیسوا جانیں
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

اس کا نتیجہ جو ہونا تھا وہی ہوا۔ ہمارے اکثر نوجوان شریف زادوں کے دل پر پہلی بجلی ایک طوائف سے آنکھیں چار کرنے کے بعد گری۔ اُن کے جنسی شعور نے ایک طوائف کی آغوش میں آنکھیں کھولیں بیوی محض خاندان چلانے کا ذریعہ رہ گئی، لیکن ان کی جذباتی دنیا کی ملک طوائف بن گئی۔

عشق و محبت کا جو تعلق شاعری اور ادب سے ہے وہ ظاہر ہے۔ خصوصاً ایسے دور میں جبکہ شاعری صرف نشاط اور تفریح کا ذریعہ تھی۔ وہی طوائف جو ہماری معاشرت میں ہمارے عشقیہ جذبات کی تنہا مالک بن چکی تھی۔ ہمارے ادب کی بھی معشوق بن گئی۔ اگر آپ غور سے ادب کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے افسانوں، مثنویوں اور غزلوں کے معشوق میں طوائف کا کردار اور اُس کے خدوخال بخوبی نمایاں ہیں، معشوق کا ہرجائی پن اور بے وفائی رقیبوں کا ہجوم، کبھی ظلم و ستم، کبھی لگاوٹ کی باتیں، شوخی اور طراری ناز اور غمزے، یہ ہو بہو ایک طوائف کی تصویر آنکھ کے سامنے لے آتا ہے، اکثر شاعر اور ادیب جو کچھ کہتے یا لکھتے تھے اس میں اسی معاشرت کا خاکہ نظر آتا ہے، آج کل کے پڑھنے والے اُن کے کلام پر اکثر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ مبتذل رکیک اور مخرب اخلاق ہے۔ لیکن وہ اپنی نظر کافی دور تک نہیں لے جاتے، کیونکہ یہ تصور شاعروں اور ادیبوں کا نہیں ہے بلکہ اس دور کی معاشرت کا ہے جس کے وہ سچے نمائندے تھے۔

طوائفوں کے ساتھ عشق و محبت کے جذبات وابستہ ہونے کی وجہ سے ہمارے ادب پر ایک اثر اور بھی پڑا۔ طوائف ظاہر ہے کہ ایک پیشہ ور عورت ہوتی ہے، اُس سے پاک محبت کی امید کرنا حماقت ہے۔ ایسی حالت میں محبت پر ہوس پرستی کا غالب آجانا لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ہمارے ادب میں جس محبت کا ذکر ہے اس میں جنسی ترغیب روحانیت پر چھائی ہوئی ہے۔ محبت کی وہ رفعتیں جہاں دو دل ایک ذہنی اور جذباتی آویزش کی وجہ سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ اس کے نغمے ہمارے ادب میں سنائی نہیں دیتے۔ ہماری عشقیہ شاعری زیادہ تر معاملہ بندی پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور چونکہ اس زمانے کی ساری کائنات عشقیہ شاعری ہی ہے لہٰذا ہمارے ادب میں ایسے شاہکار نہیں ملتے جن کو دوسری زبانوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

طوائفیں معاشرت کا یہ راز بھی بخوبی سمجھ گئی تھیں کہ کسی مرد کے دل پر ایک مدت تک قابو پانے کے لیے محض اس کی جنسی آسودگی ہی کافی نہیں بلکہ اس میں تہذیب، خوش سلیقگی، شیریں زبانی حسن کی آرائش اور نشست و برخاست کے جملہ آداب کو کافی دخل رہتا ہے لہٰذا ان کی یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ مردوں کے لیے محض سامانِ عشق ہی نہ ہوں بلکہ ایک حد تک ان کے واسطے نشاط اور تفریح کا سامان بھی مہیا کریں اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لیے انھیں اپنی تعلیم و تربیت کا بھی کافی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مرزا محمد ہادی رسوا صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب "امراؤ جان ادا" میں جو کہ طوائف کی سچی سوانح عمری کہی جاتی ہے ان تمام باتوں کا ذکر ہے جو ایک طوائف کو سیکھنا پڑتی تھیں۔ رقص اور موسیقی میں تو وہ اتنی ماہر ہوتی تھیں کہ اس فن کو انھوں نے بالکل اپنا ہی لیا تھا۔ شعر و سخن سے بھی ذوق ہونا لازمی تھا۔ بعض طوائفیں اس زمانے کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتی تھیں۔ پوشاک میں بھی تراش خراش یہی نکالتی تھیں اور اپنے وقت کے فیشن کی موجد ہوتی تھیں۔ خاص خاص طوائفوں تک تو ایسے ویسے آدمی کی رسائی آسان نہ تھی۔ جس طرح کہ بڑے بڑے امراء کے لڑکے اپنی تعلیم پر جلا دینے کے لیے یورپ کی سیاحت کے لیے بھیجے جاتے تھے اسی طرح ہمارے رئیس زادے آدابِ محفل سیکھنے کے لیے کسی مشہور طوائف کے سپرد کیے جاتے تھے۔ گویا ایک طوائف کا مکان تہذیب کا ادارہ تھا۔ خاندانی طوائفوں کی زبان ادبی اعتبار سے مستند سمجھی جاتی تھی۔ رئیسوں کے یہاں شانِ ریاست برقرار رکھنے کے لیے گھوڑے گاڑی مصاحب وغیرہ ضروری تھے وہاں کسی نہ کسی طوائف سے وابستگی بھی لازمی تھی۔ اس معاشرت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ادب میں تصنع اور تکلف حد سے زیادہ دخیل ہو گیا جس سے ادب بھی ایک "طوائف" بن کر رہ گیا۔ وہی ظاہری حسن، وہی آرائش اور نمائش، وہی حسین لباس، لیکن فطری جذبات کی وہی کمی۔ ہمارے اشعار کے الفاظ حسین، جملے چست اور بندشیں دلکش لیکن مصنوعی جذبات کے حامل اور بے روح۔

طوائفوں نے ہمارے چند مخصوص اصنافِ سخن کو رائج اور مقبول بنانے میں بھی بہت بڑا حصہ لیا۔ گزشتہ زمانے میں نہ تو اتنے تعلیم یافتہ لوگ تھے اور نہ اتنے اخبار اور رسالے، نہ میگزین تھیں اور نہ ریڈیو شعرا کی شہرت کا دار و مدار صرف مشاعروں کی کامیابی پر یا کسی مشہور خوش گلو طوائف کا ان کی غزل کسی صاحبِ ذوق شہزادہ یا رئیس کی محفل میں گا دینے پر تھا۔ شاعر اپنی معراجِ شہرت اور حاصل زندگی یہی سمجھتا تھا کہ اس کی شہزادوں کے دربار تک رسائی ہو جائے تاکہ عمر بھر روٹیوں کا سہارا ہو جائے نسیم لکھنوی کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ شاہ اودھ کے دربار میں ایک طوائف ان کی غزل جس کا مطلع ہے :-

حبیبہ نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دنیا ہی تب نجات ئے گی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گا رہی تھی۔ بادشاہ سن کر بہت محظوظ ہوئے اور پوچھا کہ یہ نسیم کون ہیں، اور اس طرح نسیم کا دربار اودھ میں پہلے پہل غائبانہ تعارف ہوا۔ ایسی صورت میں وہ اصناف سخن جن کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا زائد رائج اور مقبول ہو گئیں۔ غزل کا اور اصناف سخن سے مقبولیت میں اس قدر زیادہ بڑھ جانے کا بڑی حد تک راز یہی ہے کہ وہ گانے کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی، اسی طرح شاہان اودھ کے زمانہ میں مرثیوں کے فروغ پانے میں طوائفوں کی سوزخوانی کا بھی ایک حد تک اثر تھا۔

گو اس کی اصل وجہ شاہان اودھ اور ان کے درباریوں کا امامیہ مذہب تھا، لیکن وہ خاص اصناف سخن جو اس معاشرت سے ظہور پذیر ہوئی ریختی ہے۔ ریختی دراصل ایک طوائف کے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کرتی ہے۔ اور غالباً ایک طوائف اور تماش بین کے تعلقات ہی اس صنف سخن کے ایجاد کے محرک ہوئے۔ اکثر مصوروں نے تصویروں کے ذریعہ سے راگ اور راگنیوں کے روپ اور بھاؤ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دور گذشتہ کے اردو ادب کے روپ اور بھاؤ کو جب ہم تشکیل دینا چاہتے ہیں تو ہماری نظر کے سامنے ایک نیم برہنہ حسین رقاصہ کی تصویر آتی ہے۔ جو خوبصورت پوشاک اور زیور سے لدی ہوئی ہے اور گت پر ناچ رہی ہے جس کے گرد تماش بینوں کا ہجوم ہے، جس کی زبان پر مصنوعی عشقیہ بول ہیں، جن کو باری باری سے ہر تماش بین کو وہ بھاؤ کے ساتھ بتا رہی ہے۔ جس کی نظر میں ہر ایک کے لیے ایک پیام ہے جو ان کی آتش ہوس کو بھڑکا رہا ہے۔ لیکن جس کے ہونٹوں پر ایک خفیف طنز آمیز تبسم ہے کیونکہ اس کا دل سرد ہو چکا ہے، اور اس میں کسی فطری جذبہ کی چنگاری کے مشتعل ہونے کی صلاحیت نہیں۔

شعر کیا ہے

بقول لارڈ میکالے یہ ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی، اور ناٹک سے متشابہ ہے، مگر یہ سب اظہار مطلوب میں عاجز ہے۔ ایک اور محقق کا قول ہے کہ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لیے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر متاثر ہو وہ شعر ہے۔ خواہ وہ نظم ہو یا نثر۔ ہندی محققین کا قول ہے کہ رعایاتِ لفظی اور محاسنِ معنوی کا نام شعر ہے میرا خیال یہ ہے کہ کبھی چیزوں میں قیود کے لگنے سے ایک دلفریبی آجاتی ہے، جیسے پانی کو صدف کی قید موتی۔ خون کو نافِ آہو کی قید مشک بنا دیتی ہے اسی طرح الفاظ۔ وزن اور بحور کی قید میں آکر ایک دلفریب شکل اختیار کر لینے میں اور جب اس میں تاثیر کی روح دوڑ جاتی ہے تو شعر بن جاتا ہے۔

زمانہ اپریل ۱۹۳۳ء

کلیم اعظم گڈھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گلدستۂ نظم

رفتار زمانہ — زمانہ جنوری ۱۹۰۴ء — **اکبر الہ آبادی**

فلک کے سامنے کیا مذہبی بہانہ چلے — چلیں گے ہم بھی اسی رخ جدھر زمانہ چلے
میں جانتا ہوں نہ چھوڑینگے آپ چال اپنی — کسی کا کام چلے اے حضور یا نہ چلے
خدا کے واسطے ساقی یہی نگاہ کرم — چلا ہے دور تو پھر کیوں رُکے چلا نہ چلے
کھلا ہے باغِ قناعت میں غنچۂ خاطر — خدا بچائے کہیں حرص کی ہوا نہ چلے
نصیب ہو نہ سکی دولتِ قدم بوسی — ادب سے چوم کے حضرت کا آستانہ چلے
فروغ عشق کا ہے آہ کے نہیں ممکن — نہ پھیلے بوئے گلستاں اگر ہوا نہ چلے
خودی کے حس سے بھی ہوتا نہ آشنا اکبر — کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

گھر سے جب نکلیں گی لکھ پڑھ کر کنواری لڑکیاں — دلکش و آزاد و خوش رو ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقعے عمل کے ہوں گے پیش — ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ
مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے — ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ
ڈال دے گا سینۂ غیرت سپر میدان میں — تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو آختہ

مالوی کا مال کچھ اور مولوی کا مول کچھ — کہتے ہیں بازار میں اکبر سے تو بول کچھ
بولا وہ دنیا کا فقط اک کھیل ہے — عمر گئی ہے مال میں اور مول میں جب میل ہے

دل بھی کانپا، ہونٹ تھرائے شرمایا بھی خوب — شیخ کو لیکن تری محفل میں پینا ہی پڑا
جب کہا میں نے بھلا دو غیر کو، ہنس کر کہا — یاد پھر مجھ کو دلانا بھول جانے کے لئے
فٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب — یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر؟ یہ خوب کہی
ہزار سائنس رنگ بدلے ہزار قانون ہم بنائیں — خدا کی قدرت یہی رہے گی، ہماری حیرت یہی رہ گئی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہمارا دیس

علامہ اقبال

یہ مشہور قومی ترانہ سب سے پہلے زمانہ ماہ ستمبر ۱۹۰۴ء
کے پرچہ میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت اشعار ذیل تھے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں　　سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پنجاب[1] کیا دکن کیا، بنگال و بمبئی کیا　　ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا　　وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں جس کے ہزاروں ندیاں　　گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو　　اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے　　اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری　　صدیوں سے آسماں ہے نامہرباں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

اقبال اکبر کے رنگ میں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر　　وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

ایک وید منتر کا ترجمہ

خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو　　احباب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو
روشن مرے سینہ میں محبت کا شرر ہو　　دل خوف سے آزاد ہو میری پاک نظر ہو
پہلو میں مرے دل ہو مے آشامِ محبت　　ہر شے ہو مرے واسطے پیغامِ محبت

---

[1] یہ اسی وقت ترمیم ہو گئی تھی۔ مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

گلاب
نوبت رائے نظر

اے گلابِ روح پرور! اے شہہ گلہائے باغ　　قیدِ ہستی میں کہاں ممکن مجھے تجھ سا فراغ
شب کو تو روشن میانِ باغ ہے مثلِ چراغ　　اور دل کو ہے ترے گلرنگ کا لبریز ایاغ
تیرے نظارے کو لیکن چشمِ بینا چاہیے
دل بھی سرشارِ مئے ذوقِ تماشا چاہیے
صبح کو تو کھولتا ہے آنکھ جس دم خواب سے　　منہ دُھلاتی ہے ترا شبنم مصفا آب سے
تخت پر تو جلوہ گر ہوتا ہے رعب و داب سے　　پھول سب نذریں دکھاتے ہیں تجھے آداب سے
جگمگاتا ہے جو صحنِ باغ تیرے نور سے
نیّرِ خورشید لیتا ہے بلائیں دور سے
بلبلوں کے دل محبت سے تری لبریز ہیں　　عاشقی کے ولولے دریائے طوفاں خیز ہیں
لب پہ وہ دلکش ترانے ہیں دہن گلریز ہیں　　حوصلے بڑھتے ہوئے دل کی اُمنگیں تیز ہیں
بجلیاں بھر دیں دلوں میں اضطرابِ شوق نے
مست اور بیخود کیا ان کو شرابِ شوق نے

یادِ وطن
پیارے لال شاکر میرٹھی

اِن شاندار محلوں کو کیا کروں میں لے کر　　لگتا نہیں ہے میرا دل آہ! ان میں دم بھر
ان میں نہیں ہے میری دلبستگی کا منظر　　دلکش کہیں ہے ان سے اُجڑا ہوا مرا گھر
مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیارا
غربت میں مجھ کو رہنا دم بھر نہیں گوارا
ہیں برکتیں اترتی جس گھر میں آسماں سے　　پیارا ہے آہ! وہ گھر میرے لئے جہاں سے
اے گھر سوا ہے دلکش تو روضۂ جناں سے　　ہاں! تو عزیز تر ہے مجھ کو ہزار جاں سے
مل جائے کاش مجھ کو گھر آہ! میرا پیارا
غربت میں مجھ کو دم بھر رہنا نہیں گوارا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دلِ بیقرار سوجا

سرور جہان آبادی

کسی مست خواب کا ہے تجھے انتظار سوجا
کہ گزر گئی شب آدھی، دلِ بیقرار سوجا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری مرے غمگسار سوجا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سوجا، مرے راز دار سوجا

مجھے خوں رلا رہا ہے ترا دمبدم تڑپنا
ترے غم میں آہ! کب سے ہوں میں اشکبار سوجا

ابھی نوجوان ہے تو، نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ! شیوہ نہ کر اختیار سوجا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم، تجھے گود میں اٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سوجا

تجھے حسن کا ہے تصور ارے مست جامِ الفت
انھیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سوجا

تجھے پہلا سابقہ ہے، شبِ غم بڑی بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم، دلِ بیقرار سوجا

گنگا جی

سرور جہان آبادی

اے آبِ رودِ گنگا، اُف رے تری صفائی
یہ تیرا حسن دلکش یہ طرزِ دلربائی

تیری تجلیاں ہیں جلوہ فروشِ تیغی
تنویر میں ہے تیری اک شانِ کبریائی

جمنا تری سہیلی گو ساتھ کی ہے کھیلی
اس میں مگر کہاں ہے تیری سی جاں فزائی

بے لوث تیرا دامن ہے داغِ معصیت سے
موزوں ہے تیرے قد پہ ملبوسِ پارسائی

حسنِ ازل کی گویا تو اک سُگھڑ ہے مورت
صانع نے تیری صورت کیا موہنی بنائی

اے نازشِ زمانہ اے نقشِ نازِ عصمت
بھارت کی پاک دیوی تو ہے ہماری مائی

دلبند ہم ہیں تیرے لختِ جگر ہیں تیرے
نخلِ مراد ہے تو اور ہم ثمر ہیں تیرے

قومی عمارت

برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی

بتاؤں کونسا ہے وہ مکاں سارے مکانوں میں
گڑے رفعت کے جھنڈے جس کے ہیں ہفت آسمانوں میں

کہیں افزوں ہے وسعت جس کی پہنائے دو عالم میں
محیطِ دہر اک گوشہ ہے جس کے سائبانوں میں

وفائے گل کی کہانی ہے تمام بادِ صبا جس جا
جہاں رنگِ شکایت ہے نہ بلبل کے ترانوں میں

نہیں ہے جس کے کاشانوں میں قیدِ مذہب و ملت
گذرِ شیخ و برہمن کا ہے جس کے آستانوں میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بسترِ علالت

شررؔ سہارنپوری

گردشِ دوراں! ستم ہے ظلم کی بانی ہوئی　　اُف بلائے ناگہانی یوں دشمن جانی ہوئی
منظرِ ارض و سما نظروں میں وحشت خیز ہے　　خانہ ویرانی سی ہے بے خانہ ویرانی ہوئی
کیا خبر تھی ہوں گے ایامِ علالت ختم یوں　　جانستاں آب و ہوائے عالمِ فانی ہوئی
ایک ہفتہ میں کمی آئی غذا و ہضم میں　　رفتہ رفتہ ضعف کی بے حد فراوانی ہوئی
میں نے جب پوچھا کہا گھبرا اُٹھ مت اچھا ہے جی　　میری بیماری سے اُف! کیسی پریشانی ہوئی
ہائے وہ بےچینیوں کے ساتھ شب بیداریاں　　حیف! خوابِ مرگ کو فکرِ تن آسانی ہوئی
اُڑ گئی تسکینِ خاطر مٹ گئے صبر و قرار　　دل میں جمعیت جو تھی وقفِ پریشانی ہوئی
اُس تنِ نازک کے ڈالے دامنِ گنگا میں پھول　　دیدۂ گریاں سے جن پر اشک افشانی ہوئی
کاتبِ تقدیر نے جو کچھ ازل میں لکھ دیا　　وہ ہی ہوتا ہے شررؔ یہ بات ہے مانی ہوئی

نیرنگِ ہستی

برقؔ دہلوی

فریبِ چشم تماشا ہے جلوۂ ہستی　　نظر کے واسطے دھوکا ہے جلوۂ ہستی
کھلا کسی پہ نہیں کیا ہے جلوۂ ہستی　　عجب طرح کا معما ہے جلوۂ ہستی
بروں ہے فہمِ بشر سے یہ رازِ سربستہ　　یہاں ہے طائرِ اوجِ خیال پر بستہ
رہینِ کشمکشِ انقلاب ہے عالم　　ثبات یہ ہے کہ نقشِ برآب ہے عالم
نظر فریب تماشائے خواب ہے عالم　　کہ تشنہ کاموں کے حق میں سراب ہے عالم
حجابِ چشم ہے یہ ہست و بود کچھ بھی نہیں　　ہے ماسوا کی نمائش وجود کچھ بھی نہیں

مقدس سرزمین

نادرؔ کاکوروی

مرحبا اے مادرِ ہندوستاں جنت نشاں (۱)　　مرحبا اے بھارت اے روحانیت کی سرزمیں
ہم کہے جائیں گے مکہ اور مدینہ چھوڑ کر　　ساری دنیا میں ہے تیری پاک تر بہتر زمیں
تو فضائیت میں شادابی میں پیداوار میں (۲)　　سب ممالک سے ہے افضل سب ممالک سے قدیم
تجھ میں تھا اس وقت نورِ حق پرستی جلوہ گر　　جب کہ روشن بھی نہ تھی شمعِ تجلائے کلیم
اے بہارستانِ جذبات اے خرابات و خروش (۳)　　سیرگاہِ سعدیٔ شیراز و بزمِ والمیک
ہے خم و مینا میں تیرے [illegible]　　اور مئے احمر میں تیری خون [illegible] ہے شریک

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

غزل

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی

چند دور از رخِ تو ہمنفسِ غم باشم
با من از صحبتِ آں شوخ خوش افتاد بس است
من بہ آں مایہ نیرزم کہ بہ خلوت برسم
بسکہ اے بت بہ جہانے سروکار است ترا
مستیِ بادۂ الفت نہ بہ اندازہ بود
من گدائے درِ میخانہ شدم از پئے آں
ایں گماں را نتوانیم کہ تازہ بکشیم

چند چوں زلفِ تو آشفتہ و درہم باشم
حاجتم نیست کہ مقبولِ دو عالم باشم
بس بود ایں کہ بہ بزمِ تو ہمیں ہم باشم
آں مبادا کہ من از رازِ تو محرم باشم
عجبے نیست کہ رسوائے دو عالم باشم
کہ گر آں مغبچہ ام جام دہد جم باشم
شبلیا در فنِ شعر ارچہ مسلّم باشم

کلامِ ابر

کشن نرائن در ابر دہلوی

عدوئے دوست ہے کب خواہش امداد کرتے ہیں
سرِ محفل کہیں یوں شکوۂ بیداد کرتے ہیں
یہ کیا اسرار ہے بیہوش ہو کر ہوش آتا ہے
یہ جورِ گل کا بلبل رات دن کیا راگ گاتی ہے
ثوابِ حج اکبر ان کو گھر بیٹھے ہی ملتا ہے
جو جنت کی ہوس میں کارِ دنیا چھوڑ بیٹھے ہیں

کہیں گلچیں سے ہم صیاد کی فریاد کرتے ہیں
ہیں سازِ نغمہ گر چھیڑ دو تو ہم فریاد کرتے ہیں
خودی جب بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں
جو عاشق ہیں کہیں معشوق کی فریاد کرتے ہیں
کبھی مسکین و بیکس کے جو دل کو شاد کرتے ہیں
طمع میں سود کی وہ اصل کو برباد کرتے ہیں

اُمید

مہاراجہ کشن پرشاد حیدر آباد

کہتے ہیں امید جسکو دل کی وہ محبوب ہے
شاد دل کو کرنے والی ہے جہاں کو یہ امید
بیکسی کی آشنا ہے اور خلوت کی رفیق
ایک پل میں رونے والوں کو ہنسا دیتی ہے یہ
بول بالا ہے اسی کے دم سے ہر اک بات کا
فتح کی تلوار ہے مردِ سپاہی کے لیئے
عاقلوں کو اس کا دامن دامنِ مقصود ہے

سبکی یہ مطلوب ہے اور سبکو یہ مرغوب ہے
گدگدانے والی ہے شوقِ نہاں کی یہ امید
اور معذوری و مجبوری کی ہے مشفق شفیق
ہنسنے والوں کو رلا کر پھر لٹا دیتی ہے یہ
نام باقی ہے اسی سے سارے موجودات کا
تاج و طرہ ہے یہی تو بادشاہی کے لئے
ذات اس کی بیاہوں کے واسطے معبود ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

قوم کی لڑکیوں سے خطاب

برج نرائن چکبست

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و ریفارم — تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
رنگ ہے جن میں مگر بوئے وفا کچھ بھی نہیں — ایسے پھولوں سے نہ گھر اپنا سجانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے — خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
جو بناتے ہیں نمائش کا کھلونا تم کو — ان کی خاطر سے یہ ذلت نہ اٹھانا ہرگز
رخ سے پردہ کو اٹھایا تو بہت خوب کیا — پردۂ شرم کو دل سے نہ اٹھانا ہرگز
نقدِ اخلاق کا ہم نل کی طرح ہار چکے — تم ہو دمینتی یہ دولت نہ لٹانا ہرگز
خاک میں دفن ہیں مذہب کے پرانے پاکھنڈ — تم یہ سوتے ہوئے فتنے نہ اٹھانا ہرگز
اپنے بچوں کی خبر قوم کے مردوں کو نہیں — یہ ہیں معصوم انھیں بھول نہ جانا ہرگز
ان کی تعلیم کا مکتب ہے تمہارا زانو — پاس مردوں کے نہیں ان کا ٹھکانا ہرگز
کاغذی پھول ولایت کے دکھا کر ان کو — دیس کے باغ سے نفرت نہ دلانا ہرگز
نغمۂ قوم کی لے جس میں سما ہی نہ سکے — راگ ان کو کوئی ایسا نہ سکھانا ہرگز
گو بزرگوں میں تمھارے نہ ہو اس وقت کا رنگ — ان ضعیفوں کو نہ ہنس ہنس کے رلانا ہرگز
ہم تمھیں بھول گئے اس کی سزا پاتے ہیں — تم مگر اپنے تئیں بھول نہ جانا ہرگز

---

(۱) دنیا کی عجیب ہم نے ہستی دیکھی — ہر ایک کے حوصلے میں پستی دیکھی
زردار کو محوِ تنگ چشمی پایا — بے زر کی رفیق تنگدستی دیکھی

---

(۲) ابھی نیا جوشِ عشق کا ہے صلاح سنتے نہیں کسی کی — کریں گے آخر میں پھر وہی ہم جو چار یار آشنا کہیں گے
ہمارے اور زاہدوں کے مذہب میں فرق اگر ہے تو اس قدر ہے — کہیں گے ہم جس کو بس انساں وہ اس کو خوفِ خدا کہیں گے

(۳) مردِ قانع کو نہیں رہتی گدائی کی ہوس — پاؤں پھیلا کر جو بیٹھا ہاتھ پھیلاتا نہیں
مردِ میدانِ محبت زندۂ جاوید ہیں — موت آجانے سے تو انسان مر جاتا نہیں

(۴) زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا
گل کو پامال نہ کر لعل و گہر کے مالک — ہے اسے طرۂ دستارِ غریباں ہونا
صفحۂ دہر پہ ہے ید قدرت سمجھو — پھول کا خاک کے تودہ سے نمایاں ہونا
ہے مرا ضبطِ جنوں جوشِ جنوں سے بڑھ کر — ننگ ہے میرے لئے چاک گریباں ہونا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کلامِ حالی — شمس العلما الطاف حسین حالی

نہ عیش کیخسروی رہے گا نہ صولت بہمنی رہیگی
رہے گی اے منعمو نہ باقی دئے کی کچھ روشنی رہیگی

رہے گی کس طرح راہ اس میں کہ رہنما بنگئے ہیں رہزن
خدا نگہبان ہے قافلہ کا اگر یہی رہزنی رہیگی

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبول عام ہونا
جو ڈول ڈالو گے حسن ظن کا تو تم سے یاں بدظنی رہیگی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہو رہے ہیں میلے
اندھیر اچھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہیگی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ حالی تو اس سے دل تنگ ہوں نہ وارث
رہیں گے ہر حال میں غنی وہ جو نیت ان کی غنی رہیگی

بھائی کا سوگ — حالی

دنیا ہے یہ ایک دار فنا اس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہیں فانی

اک آہ بھری سن کے یہ حالی نے کہ جس سے
دل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی

فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو راہ سپر قاضی و دانی

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو کہانی

کلامِ نظام — نظام حیدرآباد

تھوڑی سی اگر خاک ترے راہ گذر کی
مل جائے تو بن جائے دوا درد جگر کی

اک وار میں جو رنگ کیا دل کو ہمارے
لی آبرو ابرو نے ترے تیغ و تبر کی

کن آنکھوں سے دیکھوں تجھے یا شاہ فلک حشر
باہر ہے تجلی تری طاقت سے نظر کی

عثمان تجھے اعزاز دیا ہے جو خدا نے
یہ شے نہیں تقدیر میں ہر ایک بشر کی

کلامِ ناطق

جلوۂ باطن ہے دیوانوں کے دل میں جوش ہے
(۱) آنکھ اٹھا کر اس کو دیکھے کس کو کتنا ہوش ہے

مے کشو مے کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

کہہ چکا کہنا تھا جو کچھ سن لیا سننا تھا جو
اب ترا ناطق ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

کچھ تو سرگرم سخن ہوا ہے زبان شعلہ ریز
(۲) کالعدم ہے شمع کی ہستی اگر خاموش ہے

میکشان عشق سے ہے رنگ دنیا سے جدا
جتنی قوت جس میں ہے اتنا ہی وہ بیہوش ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اسیرانِ وفا

عاشقی پیشہ ہے اسے دل تو یہ بیداد نکر
دیکھ اس جلوۂ پنہاں کی زیارت ہے محال
بے پر و بال کہاں چھوٹ کے جائیں صیاد
ہم تری یاد کو بھولیں گے نہ بھولیں ہیں کبھی
یہ بھی حسرت کوئی تدبیر سکوں ہے کیا خوب
محبت نے اثر پیدا کیا یہ دل نشیں ہو کر
یاد اُن کی ہوئی وجہ سکوں ہجر میں حسرت
عہد مستی کے اب کہاں وہ رنگ
ایسی پھر شب نصیب ہوگی نہ
خوب تھا وہ زمان رسوائی
آہ وہ شہر کانپور کی شام
ہیں طلبگار شوق گوناگون
بڑھ چلا جوشش آرزو حسرت

لطف زندگی

مے رہے مینا رہے گردش میں پیمانہ رہے
حشر بھی تو ہو چکا رخ سے نہیں اٹھتی نقاب
گورے ہاتھوں میں بنے چوڑی خطِ ساغر کا عکس
حشر ہے تم شرم کے پتلے نہ بن جانا کہیں
ان بتوں کے چلتے ہم نے دل کو پتھر کر دیا
زندگی کا لطف ہے اڑتی رہے ہر دم ہر طرف

مختصرات

سن لو باسط غور کر لو مختصر سی بات
اپنا مسلک صلح کل ہے صلح جو ہی نام ہے

مولانا حسرت موہانی

(۱) ستم یار سے بھی شاد ہو فریاد نہ کر
ہمت شوق کو بے فائدہ برباد نہ کر
ہم اسیرانِ وفا کوشش کو آزاد نہ کر
تو ہمیں بھول کے بھی یاد نہ کر شاد نہ کر
دل بیتاب سے کہتے ہو انھیں یاد نہ کر

(۲) کر اب تک شکوہ ہائے حسن بھی آئے حسیں ہو کر
بلبل کے لئے یادِ بہار آئی قفس میں

(۳) ساغر بادہ ہے نہ کاسۂ بنگ
ساقی با ہوش کرے نہ وہ رنگ
خوب تر تھی وہ عقل و عشق کی جنگ
وہ لب نہر وہ کنارہ گنگ
حسن کے جلوہ ہائے رنگارنگ
ختم ہونے کو آئی قید فرنگ

ریاض خیرآبادی

میرے ساقی تو رہے آباد میخانہ رہے
حد بھی آخر کچھ ہے کب تک کوئی دیوانہ رہے
اس ادا سے ہاتھ میں نازک سا پیمانہ رہے
چال اٹھلاتی ہوئی انداز مستانہ رہے
بت رہے کوئی نہ یارب کوئی بتخانہ رہے
میں ہوں شیشے کی پری ہو گھر پری خانہ رہے

باسط بسوانی

ہے "تعصب" پر فقط قطع کلام و اختتام
با مسلماں انشاءاللہ با ہندو رام رام

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

برسات کی بہار

داغؔ دہلوی

چرخ پر چھائی ہیں اس طرح گھٹائیں کالی
جس طرح ہوں رخِ معشوق پہ زلفیں برہم

ہے سیاہ ابر میں اس روپ پہ بگلوں کی قطار
انجم کاہکشاں کی ہو لڑی جیسے بہم

کہیں بادل کی گرج ہے کہیں بجلی کی کڑک
کہیں بوندوں کی پھواریں کہیں برسے تھم تھم

نعرۂ مست کا بادل کی گرج میں انداز
نجھہ شوق کا بجلی کی تڑپ میں عالم

پسلیاں اب نہیں دریا کی دکھائی دیتیں
خوب تن تن کے رواں ہونے لگے موجۂ یم

کشتیوں میں کہیں جلسے ہیں چڑھے دریا کے
ہو رہی ہیں کہیں تیراکوں میں شرطیں باہم

شوخیٔ رنگ سے مہندی کے ہو فوق رنگ شفق
لالۂ باغ پہ ہے لال پری کا عالم

کہیں طاؤس چمن کی ہے نوائے دلکش
کہیں آتی ہیں پپیہوں کی صدائیں پیہم

ہے کہیں گل کی مہک تو کہیں بلبل کی چہک
کوک کوئل کی ہے ارگن سے بھی خوشتر ہر دم

پھیلی پھیلی ہے وہ خوشبو کہ معطر ہو دماغ
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں ہیں کہ دل ہو خرم

بوسے لیتا ہے شگوفے کے شگوفہ کھل کر
شاخ سے شاخ گلے ملتی ہے کیا کیا باہم

زہر باغ میں ہیں گلبدنوں کے جلسے
سُندریاں ساڑیاں سُرخ اُس پہ ترشح کم کم

شور ہے قلقلِ مینا کا چلو آؤ پیو
منچلوں نے بھی مچا رکھی ہے کیا کیا اودھم

ارض کو فوق سما پر ہے اسی موسم میں
کہ زمیں موجِ زمرد ہے فلک ہے نیلم

مریضہ

جگت موہن لال رواںؔ

کہتے ہیں بیمار مجکو میرے سارے چارہ گر
کچھ حقیقت حال کی لیکن نہیں ان کو خبر

ڈاکٹر کو فیس سے مطلب مرض سے کام کیا
مجکو ہے حیرت کہ ہے میرے مرض کا نام کیا

نیک نیت ہیں احباب ان کا کیا شکوہ کروں
کیا کہوں حالِ دل اظہارِ تمنا کیا کروں

سعی لاحاصل ہے بیمار محبت کا علاج
اس طرح کرتا ہے کوئی دردِ الفت کا علاج

کاش ہوں اس رمز سے واقف مرے تیماردار
میرے دردِ دل کا ارماں ہے فقط دیدارِ یار

خدا کی خدائی

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

تجلی نے کی اپنی صورت نمائی
بڑھی نہر میں اور بھی کچھ صفائی

نمایاں ہوا اک قرصِ طلائی
ادھر جگمگائی خدا کی خدائی

کیا کیسۂ زر کو گردوں نے خالی
چمکتی ہوئی اشرفی اک نکالی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حقیقتِ زندگی

علامہ سید ابو محمد ثاقبؔ کانپوری

زندگی ہے، یا ہوائے خانماں برباد ہے — یا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا جو غیر آباد ہے
یا ہے اک طائر جو اڑتا ہے فضا میں ہمدم — جوش جس کا ہو نہیں سکتا ہے کم کرنے سے کم
یا کہ ہے یہ فصلِ گل میں اک طرب انگیز جوش — کھو دیئے ہیں جس نے اربابِ بصیرت کے بھی ہوش
قطرۂ شبنم ہیں یا اوراقِ گل پر منتشر — جذب کر لیں گی شعاعیں جن کو ہوتے ہی سحر
یا کہ جھونکا ہے کوئی یہ بادِ طوفاں خیز کا — یا کہ دورہ ہے کوئی جوشِ جنوں انگیز کا
یا کہ سطحِ آب پر ہے اک حبابِ بے ثبات — دم زدن ہیں آہ گل ہونے کو ہے شمعِ حیات
اس حقیقت پر بھی ناداں کس قدر غافل ہے تو — اور دل میں یہ سمجھتا ہے بڑا عاقل ہے تو
بادۂ ہستی کے اک ساغر سے تو سرشار ہے — اپنے کاموں پر نظر کرنے سے تو بیزار ہے

آئینۂ بیدلی

احسنؔ شمبھی ادیب کانپور

تڑپ اٹھتا ہوں جب ذکرِ مے گلفام آتا ہے — دلِ خوں کشتہ کا آئینہ بن کر جام آتا ہے
ٹھہر اے دل سکونِ عشق پر الزام آتا ہے — تجھے کوئی تڑپنے کے سوا بھی کام آتا ہے
اسی کا نام جینا ہے تو میں جینے سے باز آیا — کہ اب ہر ہر نفس سے موت کا پیغام آتا ہے
لبالب ہے مرا پیمانۂ دل خونِ حسرت سے — تکلف سے مری بزمِ طرب میں جام آتا ہے
رہینِ بیکسی ہوں نازبردارِ تمنا ہوں — اسیرانِ محبت کو کہیں آرام آتا ہے
فنا کے بعد بھی کیا سامنا ہے اس مصیبت کا — تڑپ اٹھتا ہے دل جب زندگی کا نام آتا ہے
یہ ذوقِ کیفِ غم یہ روح کی افسردگی احسنؔ — ترے دل میں کبھی اندیشۂ انجام آتا ہے

رباعیات

ملوک چند محرومؔ

ہے تیرے کرم پہ انحصارِ ہستی (۱) رحمت تری باعثِ بہارِ ہستی
حکمت تیری ہے اے حکیمِ مطلق — ذرّوں سے بنا دیا حصارِ ہستی

ادبار کا گھر کہ جائے اقبال ہے دہر (۲) جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر
کیوں زشتیٔ دہر پہ ہے برہم اتنا — ناداں! ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

تجھ کو پئے رزق اگر پریشانی ہے (۳) اے دل! تیری یہ محض نادانی ہے
وہ دیکھ فلک پہ بادلوں کے انبار — سامانِ حیاتِ عالمِ فانی ہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شاعری

اپنی قسمت کا ستارہ آپ ہی انسان ہے
خود اسی کی ذات میں پنہاں ہیں اسرارِ کمال
ہیں فرشتے قہر یا رحمت کے جو افعال ہیں
ذات پر اپنی اگر پورا بھروسہ ہے تجھے
کذب سے ہرگز نہ ہوگا آشنا ڈرتا ہے کیوں
دل سے جو نکلے اثر دل پر وہ کرتا ہے ضرور
اک شعاعِ نور ہے شاعر کے سینے میں نہاں
یہ کرن ہے اُس تخیل کی جو تیری مِلک ہے

تشریحِ وفا

کہہ گئے ہیں سچے دل سے اہلِ ایمانِ وفا
درسِ حسن و عشق کے اسرار خود ہی کھل گئے
اور ہی کچھ ہو گئی پھولوں کی رنگت اور شمیم
عشق جذبِ باطنی میں ہو گیا اُس کو کمال
کلمہ گو ہو یا کہ دنیا میں کوئی زنار بند
دورِ حاضر میں تو نہیں ملتی ہے تصویرِ نفاق
ندگی بھر اہلِ باطن کو رہی یہ احتیاط

یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے

ب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے
ن ہو تو پھر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر
شق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خودکشی
ت لئے کس اُمید پہ سونپ دیئے ہیں بحر و بر
ے گئے یہ بار بار کون ہو اور نہ شرمسار
ہنر نہیں حفیظ تیرے خیال میں کوئی

مرزا جعفر علی خاں اثرؔ

اور ہے وہ روح جس کا ساختہ ایمان ہے
بخت ہے محکوم، قدرت جذب پر تابعِ جمال
ساتھ سائے کی طرح سب نیک و بد اعمال ہیں
کہہ با آوازِ دہل جو کچھ بھی کہنا ہے تجھے
ہو گئے دانشمند خونِ راستی کرتا ہے کیوں
یہ ہے وہ مے پھیلتا ہے دور تک جس کا سرور
جس کی تابش کا نظارہ ہے نشاطِ بیکراں
یہ نہ ہو تو نغمہ سے خالی صریرِ کلک ہے

محشرؔ لکھنوی

جان جائے ہاتھ سے چھوٹے نہ دامانِ وفا
گھر سے مجنوں جب چلا سوئے دبستانِ وفا
کھنچ کے بلبل آئی جب سوئے گلستانِ وفا
بن گیا تقدیر سے جو دل نگہبانِ وفا
سچی باطن سے جگا دے نامِ ایمانِ وفا
عشق کا کلمہ پڑھیں ہند و مسلمانِ وفا
نفسِ امّارہ نہ لوٹے ساز و سامانِ وفا

ابو الاثر حفیظ جالندھری

نخلِ اُمید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے
پردے ہی جب ہوں پردہ در روئے نگار کیا کرے
یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے
مشتِ غبار ہے بشر، مشتِ غبار کیا کرے
مل گیا عذرِ پائیدار قول و قرار کیا کرے
اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ماہتاب

یہ کس نے بُرجِ زمرد سے مُنھ نکالا ہے
شرابِ نور اُبل آئی آفتاب سے
تڑپ اٹھا اثرِ چشمِ مست ساقی سے
چمک ہے ماہِ سُبک سیر کی سواری میں
مگر ہے لیلیٔ شب کا محافہ سیمیں
اُبل پڑا ہے شب آتے ہی چشمۂ پُرجوش
ہزار نقش طرازِ جہاں حجاب میں ہے

متاعِ زندگی

زمانے میں کسی کو ناز ہے شیریں زبانی کا
ہوئی ہے بیخودی جس کو مے وحدت کے ساغر سے
خدا جانے تپش ہے کس بلا کی آتش دل میں
پروں کو نوچ کر ڈالا قفس کی قید میں تو نے
مناسب ہے اسے دشتِ فنا کی راہ پیمائی
جلاتی ہے جو پروانہ کو خود بھی شمع جلتی ہے

ہنگامۂ فریاد

دل لگانے کی جگہ عالمِ ایجاد نہیں
آج اسیروں میں وہ ہنگامۂ فریاد نہیں
سرِ شوریدہ سلامت ہے مگر کیا کہیے
تلملانے کا مزہ کچھ نہ تڑپنے کا مزہ
نکہتِ گل کی ہے رفتار ہوا کی پابند
فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا باقی

مولانا عزیز لکھنوی

ہر اک طرف شبِ تاریک میں اُجالا ہے
تجلیوں کا سمندر بہا قرابے سے
چھلک گیا ہے جو پیمانہ دستِ ساقی سے
چھپا ہوا ہے کوئی بدر کی عماری میں
دکھا رہا ہے جھلک اپنی کوئی پردہ نشیں
ہر ایک چیز زمانے کی ہے تجلی پوش
فروغِ رخ کا اثر کشتِ ماہتاب میں ہے

رام پرشاد کھوسلہ ناشاد

ہماری خامشی میں ہے اثر جادو بیانی کا
وہ دلدادہ نہیں لطفِ شرابِ ارغوانی کا
پتہ ملتا ہے کچھ کچھ آہ سے سوزِ نہانی کا
کھٹکا نا بھی ہے کچھ صیاد تیری بدگمانی کا
جو ہے جویا زمانے میں متاعِ زندگانی کا
ثمر ہے باغِ دنیا میں یہی کچھ دلستانی کا

مرزا یاس یگانہ لکھنوی

خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں
شاید اب کوئی گلستاں کا سبق یاد نہیں
دستِ فرہاد نہیں تیشۂ فرہاد نہیں
ہیچ ہے دل میں اگر دردِ خداداد نہیں
رُوح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں
زندگی اُس کی جسے موت کا دن یاد نہیں

زندہ ہیں مُردہ پرستوں میں ابھی تک غالبؔ
مگر اس فن میں یگانہ سا اب اُستاد نہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شاعری
مرزا جعفر علی خاں اثر

اپنی قسمت کا ستارہ آپ ہی انسان ہے
اور ہے وہ روح جس کا ساختہ ایمان ہے

خود اسی کی ذات میں پنہاں ہیں اسرارِ کمال
بخت ہے محکوم، قدرت جذب پر تابع جمال

ہیں فرشتے قہر یا رحمت کے جو افعال ہیں
ساتھ سائے کی طرح سب نیک و بد اعمال ہیں

ذات پر اپنی اگر پورا بھروسہ ہے تجھے
کہہ با آوازِ دہل جو کچھ بھی کہنا ہے تجھے

کذب سے ہر گز نہ ہوگا آشنا ڈرتا ہے کیوں
ہو کے دانشمند خونِ راستی کرتا ہے کیوں

دل سے جو نکلے اثر دل پر وہ کرتا ہے ضرور
یہ ہے وہ مے کھیلتا ہے دور تک جس کا سرور

اک شعاعِ نور ہے شاعر کے سینے میں نہاں
جس کی تابش کا نظارہ ہے نشاطِ بیکراں

یہ کرن ہے اُس تخیل کی جو تیری مِلک ہے
یہ نہ ہو تو نغمہ سے خالی صریرِ کلک ہے

تشریحِ وفا
محشر لکھنوی

کہہ گئے ہیں سچے دل سے اہلِ ایمانِ وفا
جان جائے ہاتھ سے چھوٹے نہ دامانِ وفا

درسِ حسن و عشق کے اسرار خود ہی کھل گئے
گھر سے مجنوں جب چلا سوئے دبستانِ وفا

اور ہی کچھ ہو گئی پھولوں کی رنگت اور شمیم
کھنچ کے بلبل آ گئی جب سوئے گلستانِ وفا

مشقِ جذبِ باطنی میں ہو گیا اُس کو کمال
بن گیا تقدیر سے جو دل نگہبانِ وفا

کلمہ گو ہو یا کہ دُنیا میں کوئی زنار بند
سعیٔ باطن سے جگا دے نامِ ایمانِ وفا

دورِ حاضر میں یونہیں ملتی ہے تصویرِ نفاق
عشق کا کلمہ پڑھیں ہند و مسلمانِ وفا

زندگی بھر اہلِ باطن کو رہی یہ احتیاط
نفسِ امّارہ نہ لوٹے ساز و سامانِ وفا

یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے
ابو الاثر حفیظ جالندھری

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے
نخلِ اُمید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے

دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر
پردے ہی جب ہوں پردہ در روئے نگار کیا کرے

عشق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خودکشی
یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے

موت نے کس اُمید پر سو پہ دیئے ہیں بحر و بر
مُشتِ غبار ہے بشر، مُشتِ غبار کیا کرے

اپنے کئے پہ بار بار کون ہو روز شرمسار
مل گیا عذر پائیدار قول و قرار کیا کرے

علم و ہنر نہیں حفیظ تیرے خیال میں کوئی
اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ماہتاب

کس نے بُرجِ زمرد سے مُنھ نکالا ہے
شرابِ نور اُبل آئی آفتابے سے
تڑپ اٹھا اثرِ چشمِ مست ساقی سے
چمک ہے ماہ شُبابِ سپر کی سواری میں
مگر ہے لیلیٰ شب کا محافۂ سیمیں
اُبل پڑا ہے شب آتے ہی چشمۂ پُر جوش
ہزار نقش طرازِ جہاں حجاب میں ہے

متاعِ زندگی

زمانے میں کسی کو ناز ہے شیریں زبانی کا
ہوئی ہے بیخودی جس کو مئے وحدت کے ساغر سے
خدا جانے تپش ہے کس بلا کی آتشِ دل میں
پروں کو نوچ کر ڈالا قفس کی قید میں تونے
مناسب ہے اسے دشتِ فنا کی راہ پیمائی
جلاتی ہے جو پروانہ کو خود بھی شمع جلتی ہے

ہنگامۂ فریاد

دل لگانے کی جگہ عالمِ ایجاد نہیں
آج اسیروں میں وہ ہنگامۂ فریاد نہیں
سرِ شوریدہ سلامت ہے مگر کیا کہیے
تلملانے کا مزہ کچھ نہ تڑپنے کا مزہ
نکہتِ گل کی ہے رفتار ہوا کی پابند
فکرِ امروز نہ اندیشۂ فردا باقی

مولانا عزیز لکھنوی

ہر اک طرف شبِ تاریک میں اُجالا ہے
تجلیوں کا سمندر بہا قرابے سے
چھلک گیا ہے جو پیمانۂ دستِ ساقی سے
چھپا ہوا ہے کوئی بدر کی عماری میں
دکھا رہا ہے جھلک اپنی کوئی پردہ نشیں
ہر ایک چیز زمانے کی ہے تجلی پوش
فروغِ رخ کا اثر کشتِ ماہتاب میں ہے

رام پرشاد کھوسلہ ناشاد

ہماری خامشی میں ہے اثر جادو بیانی کا
وہ دلدادہ نہیں لطفِ شرابِ ارغوانی کا
پتہ ملتا ہے کچھ کچھ آہ سے سوزِ نہانی کا
ٹھکانا بھی ہے کچھ صیاد تیری بدگمانی کا
جو ہے جویا زمانے میں متاعِ زندگانی کا
ثمر ہے باغِ دنیا میں یہی کچھ دلستانی کا

مرزا یاس یگانہ لکھنوی

خواب آنکھوں نے بہت دیکھے مگر یاد نہیں
شاید اب کوئی گلستاں کا سبق یاد نہیں
دستِ فرہاد نہیں، تیشۂ فرہاد نہیں
ہیچ ہے دل میں اگر دردِ خداداد نہیں
رُوح قالب سے نکلنے پہ بھی آزاد نہیں
زندگی اُس کی جسے موت کا دن یاد نہیں

زندہ ہیں مُردہ پرستوں میں ابھی تک غالب
مگر اس فن میں یگانہ سا اب اُستاد نہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شکوہ

احسن مارہروی

حقیر خادمِ اُردو ہے اُس زمانے کا — کہ اس "زمانہ" کا جب تک ہوا نہ تھا آغاز
جب اس کی عمر کا دُنیا میں سال اول تھا — تو میرے طائرِ سن کی تھی تیسویں پرواز
با این تفاوتِ عمری بہم یہ ربط رہا — کہ تازہ ہوتا تھا ہر ماہ لطفِ راز و نیاز
اگرچہ مجھ سے بہت کم ادا ہوئی خدمت — مگر زمانہ رہا مدتوں حقیر نواز
اب آکے تین برس سے یہ برہمی دیکھی — کہ یک قلم ہوئے متروک وہ قدیم انداز
نہ کم ہوں کیوں مرے ہوش و خرد جنابِ نگم — سُنیں اگر نہ توجہ سے آپ یہ آواز
سزا نہ دیجئے کوتاہ قلمیوں کی مجھے — کہ دامنِ کرم و لطف آپ کا ہے دراز
مرا وجود ہے کیا، اور میری خدمت کیا — معاونوں میں ہیں اس کے بڑے بڑے ممتاز
زبانِ خامہ سے قاصر رہا ہوں گو اکثر — مگر ہے دل کو دعا گوئیوں پر اپنی ناز
دعا ہے اب بھی یہی بارگاہِ قدرت میں — کہ ہو "زمانہ" کی مانندِ خضر عمر دراز
ہر ایک حال میں احسن یہ فرض ہے تیرا — زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

التجائے بیداری

حضرت وصل بلگرامی

خواب سے اے مادرِ ہندوستاں بیدار ہو — تیرے بچے، التجا کرتے ہیں، ہاں بیدار ہو
تیرے بچے ہیں دو زانو، تیری خدمت کے لئے — تیری پُرعظمت پرستش، اور عبادت کیلئے
اُٹھ اور ان کڑیوں کو جو جکڑے ہوئے ہیں توڑ ڈال — ہیں مصیبت کی یہ کڑیاں، باعثِ رنج و ملال
مادرِ محبوب! وارث کیا نہ ہم ہوں گے ترے؟ — کیا نہیں حقدار ہم تیرے غرور و ناز کے؟
جن کے دل تیری سپر ہیں، تیری قرباں گاہ میں — ہچکچائیں گے وہ کیوں، جو تیرے عظمت خواہ ہیں

غمِ اُلفت

روش صدیقی

ایک ایک قدم پر جسے مرنا نہیں آتا — اُس کو رہِ اُلفت سے گذرنا نہیں آتا
مردانِ محبت کو نہیں ذوقِ نمائش — ان ڈوبنے والوں کو اُبھرنا نہیں آتا
دشوار سہی لاکھ، رہِ عشق و محبت — کیا جان سے بھی ہم کو گذرنا نہیں آتا
ہر ذرۂ کونین کو نسبت ہے شگوں سے — میرے دلِ مضطر کو ٹھہرنا نہیں آتا
راز غمِ اُلفت نہ کھلا ہے نہ کھلے گا — یہ داغ وہ ہے جس کو ابھرنا نہیں آتا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میری دنیا

جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی

جب نالۂ غمگیں نے تاثیرِ دعا پائی — جب نغمۂ شیریں نے مستانہ ادا پائی
جب پیکرِ سیمیں نے معصوم حیا پائی — جب شاعرِ رنگیں نے تخئیلِ رسا پائی
ناکام تمنا کی دنیا ابھی سونی تھی

جب نبضِ ہستی کو چھیڑا ید قدرت نے — مخلوق کی بستی کو زندہ کیا فطرت نے
میں نے بھی بسا ڈالی دنیائے طرب اپنی

غنچوں سے چٹک لے کر بجلی سے چمک لیکر — موجوں کے ترنم سے تاروں کے تبسم سے
پھولوں سے نزاکت لی، رنگینی و نکہت لی — لی حسن سے خود بینی رعنائی و شادابی
عشاق سے مسکینی، بے تابی و بے خوابی — وارفتہ الفت کی دنیا نئی بستی تھی
جب تم نے نظر ڈالی، برباد ہی کر ڈالی

ارمانوں کی دنیا کو، یعنی دلِ شیدا کو — برباد کیا تم نے ناشاد کیا تم نے
جس دم تمھیں دیکھا تھا جس دم تمھیں چاہا تھا — دنیا مری سونی تھی اب بھی وہی حالت ہے
اب آنکھ نہیں ملتی، یہ تازہ مصیبت ہے — ہر پردہ حائل کو سو بار اٹھا دیکھا
دنیائے تصور کو سو بار بسا دیکھا — آشفتۂ وحدت کو کب تم سے جدا پایا
پر دید کی حسرت کو حاصل سے سوا پایا

دنیا مری سونی تھی اب بھی وہی حالت ہے — اب آنکھ نہیں تیلتی یہ تازہ مصیبت ہے

رموز و نکات

ابوالفاضل راز چاندپوری

(۱)

تدبیر وفا شعار ہو جاتی ہے — تقدیر سے ہمکنار ہو جاتی ہے
آتا ہے جو وقتِ کامیابی اے راز — فطرت بھی شریکِ کار ہو جاتی ہے

(۲)

یارانِ وطن کی بے ریائی دیکھی — اغیار کی شان خود نمائی دیکھی
غربت کے مشاہدات، اللہ اللہ — نیرنگیٔ حسن آشنائی دیکھی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

لختِ جگر

جگر مرادآبادی

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا وہی ہے صورت وہی سراپا
بھنووں کو جنبش نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

وہی لطافت وہی نزاکت وہی تبسم، وہی ترنم
میں نقشِ حرماں بنا ہوا تھا وہ نقشِ حیرت بنا رہے ہیں

شراب آنکھوں سے ڈھل رہی ہے، نظر سے مستی اُبل رہی ہے
چھلک رہی ہے اُچھل رہی ہے پیئے ہوئے ہیں پلا رہے ہیں

فضا میں نشہ برس رہا ہے، دماغ پھولوں سے بس رہا ہے
وہ کون ہے جو ترس رہا ہے سبھی کو بیخود بنا رہے ہیں

خود اپنے نشہ میں جھومتے ہیں وہ اپنا منہ آپ چومتے ہیں
خرابِ مستی بنے ہوئے ہیں ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں

یہ مست بلبل بہک رہی ہے، قریبِ عارض چہک رہی ہے
گلوں کی چھاتی دھڑک رہی ہے، وہ دستِ رنگیں بڑھا رہے ہیں

وہ روئے رنگیں وہ موجۂ نسیم کہ جیسے دامانِ گل پہ شبنم
یہ گرمیِ حسن کا ہے عالم عرق عرق ہیں، نہا رہے ہیں

فضا یہ نغموں سے بھر گئی ہے کہ موجِ دریا ٹھہر گئی ہے
سکوت نغمہ بنا ہوا ہے وہ جیسے خود گنگنا رہے ہیں

بہار رنگ و شباب ہی کیا، ستارہ و ماہتاب ہی کیا
تمام ہستی جھکی ہوئی ہے جدھر وہ نظریں جھکا رہے ہیں

تمام رنگینیوں کے منظر تمام رعنائیوں کے مظہر
سنبھل سنبھل کر سمٹ سمٹ کر سب اپنے مرکز پہ آ رہے ہیں

خرام رنگیں نظام رنگیں کلام رنگیں پیام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں

یہ اشک جو بہہ رہے ہیں پیہم اگرچہ سب ہیں یہ حاصلِ غم
مگر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ جیسے کچھ مسکرا رہے ہیں

اب آگے جو کچھ بھی ہو مقدر رہے گا لیکن یہ نقشِ دائم
ہم ان کا دامن پکڑ رہے ہیں وہ اپنا دامن چھڑا رہے ہیں

ذرا جو دم بھر کو آنکھ جھپکی، یہ دیکھتا ہوں نئی تجلی
جمالِ معنی دکھا رہے ہیں طلسمِ صورت مٹا رہے ہیں

خوشی سے لبریز شش جہت ہے، زبان پر شورِ تہنیت ہے
یہ وقت وہ ہے، جگر کے دل کو وہ اپنے دل سے ملا رہے ہیں

تمام ہستی پہ چھا رہے ہیں وہ جیسے خود ہی بنا رہے ہیں
نظر نظر میں سما چکے ہیں نفس نفس میں سما رہے ہیں

ہماری ہستی تمام آفت، تمام کلفت، تمام زحمت
اگر یہ سچ ہے تو فی الحقیقت ہمیں خود اُن کو ستا رہے ہیں

کہاں کی دید اور کس کا عرفاں حواس گم ہیں نظر پریشاں
جو ایک پردہ اُٹھا رہے ہیں تو لاکھ پردے گرا رہے ہیں

یہ حادثاتِ زمانہ کیا ہیں تمہی کہ ہیں حُسنِ طلب کے جلوے
دلوں کو ٹھوکر لگا لگا کر دلوں کی دنیا جگا رہے ہیں

نہ سوز اپنا نہ ساز اپنا نہ درد اپنا، نہ شوق اپنا
وہ خود ہی مُطرب وہ خود ہی نغمہ وہ خود ہی خود کو سنا رہے ہیں

نفس نفس میں صفات تازہ ممات تازہ حیات تازہ
انھیں میسر ہے ذاتِ تازہ جو خود کو تجھ میں مٹا رہے ہیں

یہ موجِ دریا، یہ ریگِ صحرا، یہ غنچہ و گل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو تو مسکرا دیا ہے یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

گلوں سے مستی جھلک رہی ہے سر اپنا بلبل ٹپک رہی ہے
جگر کسی گوشۂ چمن میں غزل کوئی اپنی گا رہے ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

قیودِ علائق

سنت پرشاد مدہوش

بشر تو ہے بستۂ علائق یہ سہہ رہا ہے کہاں کی قیدیں
کڑی جو ہیں اس زمیں کی قیدیں تو سخت ہیں آسماں کی قیدیں

کہیں جو ثقلِ زمیں سے ہٹتا تو اہلِ حکمت یہ کیا نہ کرتا
یہ اُڑ کے عرشِ بریں پہ جاتا، اگر نہ ہوتیں مکاں کی قیدیں

زمیں کو تا سطحِ مہ اٹھاتا، جو مستقر مہر میں یہ پاتا
کبھی نہ ان پستیوں کا مارا یہ جھیلتا اس جہاں کی قیدیں

نفس نفس میں جو اُلجھنیں ہیں، قدم قدم پر ہیں سخت پھندے
زمیں کی قیدیں، زماں کی قیدیں مکیں پہ ہیں سو مکاں کی قیدیں

ہوا ہے مجروح آہ کیا کیا، ہمارا ذوقِ نجات ان سے
ارے یہ خود اپنے خوں کے چسکے، ارے یہ حظِّ نہاں کی قیدیں

کہاں ہیں مدہوش اہلِ ظلمت عذاب زندانیت یہ کیوں ہے
بتاتے کچھ اہلِ راز ہم کو، مگر ہیں اُن پر زباں کی قیدیں

مدّ و جزر

اقبال نرائن جگر دہلوی

جگر شبابِ محبت میں وہ ملاقاتیں — وہ انتہائے محبت میں شوق کی باتیں
مے نشاط سے لبریز جامِ کیف اور — وہ دن سرور کے وہ لطفِ وصل کی راتیں
مجھے خوشی کے پھر ایام یاد آتے ہیں
جنونِ عشق کے سب کام یاد آتے ہیں

وصالِ یار سے میں شادکام رہتا تھا — مے نشاط سے لبریز جام رہتا تھا
نہ انتظار کی گھڑیاں نہ انتظار کے دن — عجب سرور مجھے صبح و شام رہتا تھا
مزے وہ دردِ محبت کے یاد آتے ہیں
وہ رنگ خوبیٔ قسمت کے یاد آتے ہیں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

توہینِ دوستی

جناب آنند نرائن مُلّا

سمجھ رہا ہوں میں خوب اس کو بھلا کہاں تو کہاں میں بیکس
مجھے کچھ اس کا گلہ نہیں ہے کہ فرق یہ تو نصیب کا ہے
زباں سے مُلّا کو دوست کہہ کر مگر نہ توہینِ دوستی کر
ذرا خیالوں کا جائزہ لے کہیں گزر بھی غریب کا ہے
نہیں وہ تیرے کرم کے شایاں تو کیوں اسے دے حسین دھوکا
کہ وہ سمجھ بوجھ کر ہے ناداں ہنوز امکاں فریب کا ہے

(۲)

آرزوئیں دل کی ساری بےخبر تھیں محوِ خواب — جانتا تھا کون کہتے ہیں کسے جوشِ شباب
یک بیک تو نے رُخِ پُر نور سے الٹی نقاب — اک نظر میں ہاتھ سے جاتی رہی تسکین و تاب
غنچۂ دل اک اشارے سے ترے کھِلنے لگا
مجھ کو رازِ آفرینش کا پتہ ملنے لگا

شاعر

شیام موہن لال جگر بریلوی

یہ کیا بتاؤں کسی کو میں کون ہوں کیا ہوں — دکھائی دیتا ہوں لیکن سمجھ سے بالا ہوں
ملا ہے حسنِ حقیقت ضمیر میں میرے — بھرا ہے نورِ تجلّی ضمیر میں میرے
حریمِ قدس کی قندیل ہے دماغ مرا — نشانِ پرتوِ جاوید ہے چراغ مرا
ملی ہے دل کی جگہ برقِ بےقرار مجھے — بنا دیا غمِ عالم کا سوگوار مجھے
جو شب کو اشک مری آنکھ سے ٹپکتا ہے — سحر کو مہرِ فلک بن کے وہ چمکتا ہے
امینِ رازِ محبت ہوں روزِ اول سے — کئے ہوں دہر کو روشن وفا کی مشعل سے
فراق و وصل کا میرے جہاں میں نام نہیں — سوائے سوز مجھے عاشقی سے کام نہیں

دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہے

بسمل الہ آبادی

ہندو بھی مسلماں بھی سوچیں اس کشت و خوں سے کیا حاصل — یہ جوش برا ہے آپس کا، اس جوشِ جنوں سے کیا حاصل
مسجد توڑی مندر توڑا، اپنے اپنے سر کو پھوڑا — اللہ کے گھر کا یہ نقشہ، افعالِ زبوں سے کیا حاصل
یکجان تھا بھائی کرتے ہو کیوں لڑتے ہو کیوں مرتے ہو — کیوں خون بہاتے جاتے ہو اس بارشِ خوں سے کیا حاصل
ہر لاگ بری ہر آگ بری ہر رنگ برا ہر ڈھنگ برا — جو پھونک دے اپنے گھر کو اس سوزِ دروں سے کیا حاصل
بسمل کی نصیحت دل سے سنو لاج اپنی اپنے ہاتھ رہے — مل جاؤ گلے سنگم کی طرح دونوں کا ہمیشہ ساتھ رہے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پیامِ آزادی

حضرت فراق گورکھپوری

مری صدا ہے گلِ شمعِ شامِ آزادی
سُنا رہا ہوں دلوں کو پیامِ آزادی

لہو ہے تیرے شہیدوں کا یا بھڑکتے شرار
اُچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی

مجھے بقا کی ضرورت نہیں کہ فانی ہوں
مری فنا سے ہے پیدا دوامِ آزادی

اب انقلاب کی ٹھانو کہ کوششِ اصلاح
خیالِ خام و غمِ ناتمامِ آزادی

معاہدے سند اور ایں و آں تو باتیں ہیں
یہ جنگ کیا ہے؟ غلامی بنامِ آزادی

ہمیں کرو گے منظم جہاں کو مزدورو!
تمھیں سجاؤ گے دیوانِ عامِ آزادی

فضا میں جلتے دِلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے
ارے یہ صبحِ غلامی! یہ شامِ آزادی

یہ مہر و ماہ یہ تارے یہ بامِ ہفت افلاک
بہت بلند ہے اِن سے مقامِ آزادی

فضائے شام و سحر میں شفق جھلکتی ہے
کہ جام میں ہے مئے لالہ فامِ آزادی

قدم یہ اُٹھتے ہیں پس ماندگانِ منزل کے
کہ رہرووں میں بھی ہیں امامِ آزادی

دلوں میں اہلِ زمیں کے ہے نیو اس کی مگر
قصورِ خلد سے اونچا ہے بامِ آزادی

ترے خیال سے زنجیرِ تیرگی ٹوٹی
ترا جمال ہے ماہِ تمامِ آزادی

ترنمِ سحری دے رہا ہے چھپ کر
حریفِ صبحِ وطن ہے یہ شامِ آزادی

ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراقؔ
ہماری سانس سے روشن ہے نامِ آزادی

جذباتِ منوّر

بشیشور ناتھ منوّر

شعورِ تکمیلِ جنوں نالۂ زنجیر میں تھا
سری شہرت کا بھی پہلو مری تشہیر میں تھا

اب دعا کام جو کرتی ہے تو شرمندہ ہوں
نقص گویا مرے اندازۂ تاثیر میں تھا

لینے والوں نے لیا جائزۂ دل ہر چند
فرق پھر بھی مرے جذبات کی تفسیر میں تھا

رکھ دیا مصلحتاً تیری جفا پہ الزام
میں گرفتار تو خود اپنی ہی زنجیر میں تھا

یاد اس وقت کی آتی ہے تو رو دیتا ہوں
جب مرا دخل منوّر مری تقدیر میں تھا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کلامِ سحر

اقبال ورما سحر ہتگامی

رہینِ جلوۂ تغیرِ امتیاز ہوں میں — کبھی ہوں ناز سراپا کبھی نیاز ہوں میں
مُراد بندگیٔ حق ہے، یہ نہیں معلوم — کہ بُت پرست ہوں یا بندۂ نماز ہوں میں
ہے یہ بھی کوئی کرشمہ مری حقیقت کا — فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں
فراق میں ہے عجب وصل کا لطیف احساس — ترا سپاس گزار اے شبِ دراز ہوں میں
بجا نے ہو کہ نہ ہو عشق میں حصولِ کمال — ابھی تو وقفِ اداہائے سوز و ساز ہوں میں
مرے وجود سے ہے کائنات کی تکمیل — جو کچھ ہوں سحرؔ! خود اپنا مگر جواز ہوں میں

جذباتِ نظامی

نظامی بدایونی

ادائیں نئی ہیں ترے بانکپن کی — نہ کیوں فرق آجائے رسمِ کہن میں
وفا کا سلیقہ جفا کا طریقہ — ہمارے چلن میں تمہارے چلن میں
محبت کا انجام شاید یہی ہے — کہ شعلے سے اُٹھنے لگے تن بدن میں
نظامیؔ کرو اُن سے کیا عرضِ مطلب — اثر ہی نہیں جب تمہارے سخن میں

کرشن جی کی نذر

منظور الحق کلیم

کیسی ہے دلکشی بھری صورتِ نَے نواز میں — حُسن سمٹ کے آگیا جلوہ گہِ مجاز میں
ایک طرف جمالِ کرشن جس نے شکست فاش دی — ایک طرف جلالِ کرشن کنس کے ترکتاز میں
پریم کی بدلیاں اُٹھیں چھا گئیں سارے ہند پر — کوندتی برقِ حُسن ہے چشمِ نظارہ ساز میں
قابلِ غور و فکر ہیں ارجن و کرشن کے قصص — بھر گیا ذوقِ غزنوی کیسے دلِ ایاز میں
راز تو ہے کلیمؔ کچھ کرشن کی شکلِ دلفریب — پتلی کی طرح پھرتی ہے آج بھی چشمِ باز میں

تجلیاتِ اُفق

اُفق امروہوی

دل سے غافل تھا ورائے لامکاں سمجھا تھا میں — وائے کج فہمی کہاں تھے وہ کہاں سمجھا تھا میں
خود نمودِ حُسن تھی شورش فزائے کائنات — عشق کو ہنگامہ آرائے جہاں سمجھا تھا میں
تھے حقیقت میں وہ سب ذوقِ نظر کے شعبدے — جن کو حُسن و عشق کی نیرنگیاں سمجھا تھا میں
روشنیٔ طبع من بر من بلا شد اے اُفقؔ — برقِ گلشن کو چراغِ آشیاں سمجھا تھا میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اعجازِ کلام

عشق کی کائنات میں کون نہیں ہے کیا نہیں
تجھ پہ دل ستم نصیب کون ہے جو فدا نہیں
دہر کے ذرہ ذرہ کی حسن تضاد ہے اساس
کنج لحد بھی ہے عجب گوشۂ عافیت نواز
عشق بغیر زندگی خوان طعام ہے مگر
ہاتف قال فرع دل کوئی نہیں ہے باغ میں
کس کو سنائیے کلام قصۂ واردات دل

مولوی محمد یعقوب خاں کلامؔ

دیر نہیں، حرم نہیں، بت نہیں یا خدا نہیں
ناز نہیں ادا نہیں، جور نہیں، جفا نہیں
درد نہیں دوا نہیں موت نہیں بقا نہیں
غل نہیں، غلغلہ نہیں، ڈر نہیں دغدغا نہیں
آب نہیں نمک نہیں لطف نہیں مزا نہیں
گل نہیں بلبلیں نہیں، غنچے نہیں صبا نہیں
جوش نہیں جگر نہیں ہوش نہیں فنا نہیں

عظمتِ قرآن

احسان دانش

انسان اور خداوند کے مابین ہے شاعر — آں جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت — فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خوددار
جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت، دل فرعون کا انکار

حسرتِ پرواز

جناب شاکر میرٹھی

پابند دام غم ہوں میں مبتلائے ہستی — دم گھونٹتی ہے میرا قید جفائے ہستی
اک گوشۂ قفس ہے مجھ کو فضائے ہستی — اک تنگ و تار زنداں ہے تنگنائے ہستی
تنگ آ گیا ہوں یارب ہنگامہ جہاں سے
ہوتا اگر کبوتر اڑ جاتا میں یہاں سے

جذباتِ شوق

جگموہن ناتھ رینہ شوق

بے نیازِ ہوش ہوں حاصل ہے لطف بیخودی — محو حیرت رہنے دے نیرنگی محفل مجھے
لطف ہم آغوشیِ امواج بھی کچھ کم نہ تھا — بے بسی نے کر دیا شرمندۂ ساحل مجھے
مست اتنا ہوں خود میں اپنی نوائے شوق سے — پھر رہی ہے کیوں صدائے نغمۂ محفل مجھے
جلوۂ لیلیٰ کہاں — شوق دھوکا دے رہا ہے پردۂ محمل مجھے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کلامِ سحر

رہیں جلوۂ تغیر، امتیاز ہوں میں
مُراد بندگی حق ہے، یہ نہیں معلوم
ہے یہ بھی کوئی کرشمہ مری حقیقت کا
فراق میں ہے عجب وصل کا لطیف احساس
بجا نے ہو کہ نہ ہو عشق میں حصول کمال
مرے وجود سے ہے کائنات کی تکمیل

اقبال ورما سحر ہتگامی

کبھی ہوں ناز سراپا کبھی نیاز ہوں میں
کہ بُت پرست ہوں یا بندۂ نماز ہوں میں
فریب خوردۂ نیرنگیٔ مجاز ہوں میں
ترا سپاس گزار اے شبِ دراز ہوں میں
ابھی تو وقفِ ادا ہائے سوز و ساز ہوں میں
جو کچھ ہوں سحر! خود اپنا مگر جواز ہوں میں

جذباتِ نظامی

ادائیں نئی ہیں ترے بانکپن کی
وفا کا سلیقہ جفا کا طریقہ
محبت کا انجام شاید یہی ہے
نظامی کرو اُن سے کیا عرضِ مطلب

نظامی بدایونی

نہ کیوں فرق آجائے رسمِ کہن میں
ہمارے چلن میں تمھارے چلن میں
کہ شعلے سے اُٹھنے لگے تن بدن میں
اثر ہی نہیں جب تمھارے سخن میں

کرشن جی کی نذر

کیسی ہے دلکشی بھری صورت نَے نواز میں
ایک طرف جمالِ کرشن جس نے شکست فاش دی
پریم کی بدلیاں اُٹھیں چھا گئیں سارے ہند پر
قابلِ غور و فکر ہیں ارجن و کرشن کے قصص
راز تو ہے کلیم کچھ کرشن کی شکل دلفریب

منظور الحق کلیم

حُسن سمٹ کے آگیا جلوہ گہِ مجاز میں
ایک طرف جلالِ کرشن کنس کے ترک تاز میں
کوندتی برقِ حُسن ہے چشمِ نظارہ ساز میں
بھر گیا ذوقِ غزنوی کیسے دلِ ایاز میں
پتلی کی طرح پھرتی ہے آج بھی چشمِ باز میں

تجلیاتِ اُفق

دل سے غافل تھا ورائے لامکاں سمجھا تھا میں
خود نمودِ حُسن تھی شورش فزائے کائنات
تھے حقیقت میں وہ سب ذوقِ نظر کے شعبدے
روشنی طلع من بہ من بلا مشد اے افق

اُفق امروہوی

وائے کج فہمی کہاں تھے وہ کہاں سمجھا تھا میں
عشق کو ہنگامہ آرائے جہاں سمجھا تھا میں
جن کو حُسن و عشق کی نیرنگیاں سمجھا تھا میں
برقِ گلشن کو چراغِ آشیاں سمجھا تھا میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اعجازِ کلام

مولوی محمد یعقوب خاں کلام

عشق کی کائنات میں کون نہیں ہے کیا نہیں — دیر نہیں، حرم نہیں، بُت نہیں یا خدا نہیں
تجھ پہ دلِ ستم نصیب کون ہے جو فدا نہیں — ناز نہیں ادا نہیں، جور نہیں، جفا نہیں
دہر کے ذرّہ ذرہ کی حسنِ تضاد ہے اساس — درد نہیں دوا نہیں موت نہیں بقا نہیں
کُنجِ لحد بھی ہے عجب گوشۂ عافیت نواز — غل نہیں، غلغلہ نہیں، ڈر نہیں دغدغا نہیں
عشق بغیر زندگی خوانِ طعام ہے مگر — آب نہیں نمک نہیں لطف نہیں مزا نہیں
واقفِ حالِ فرعِ دل کوئی نہیں ہے باغ میں — گل نہیں بلبلیں نہیں، غنچے نہیں صبا نہیں
کس کو سنایئے کلام قصۂ وارداتِ دل — جوش نہیں جگر نہیں ہوش نہیں وفا نہیں

عظمتِ قرآن

احسان دانش

انسان اور خداوند کے مابین ہے شاعر — آں جنس درخشندہ و پائندہ و بیدار
ملتی ہے ازل سے جسے احساس کی دولت — فطرت جسے کرتی ہے عطا جذبۂ خوددار
جبریل کی پرواز، پیمبر کی رسائی
قرآن کی عظمت، دلِ فرعون کا انکار

حسرتِ پرواز

جناب شاکر میرٹھی

پابندِ دامِ غم ہوں میں مبتلائے ہستی — دم گھونٹتی ہے میرا قیدِ جفائے ہستی
اک گوشۂ قفس ہے مجھ کو فضائے ہستی — اک تنگ و تار زنداں ہے تنگنائے ہستی
تنگ آ گیا ہوں یارب ہنگامۂ جہاں سے
ہوتا اگر کبوتر اڑ جاتا میں یہاں سے

جذباتِ شوق

جگموہن ناتھ رینہ شوق

بے نیازِ ہوش ہوں حاصل ہے لطفِ بیخودی — محوِ حیرت رہنے دے نیرنگیٔ محفل مجھے
لطفِ ہم آغوشیٔ امواج بھی کچھ کم نہ تھا — بے بسی نے کر دیا شرمندۂ ساحل مجھے
مست اپنا ہوں خود میں اپنی نوائے شوق سے — چھیڑتی ہے کیوں صدائے نغمۂ محفل مجھے
جلوۂ لیلیٰ کہاں، یہ دیدۂ حیراں کہاں — شوقِ دید کا دست اٹھاتا ہے پردۂ محمل مجھے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ارادۂ تخلیقِ انسان

حضرت جوش ملیح آبادی

ہاں میں بخشوں گا اسے انساں سے تابندگی
کون انساں؟ نازِ مخلوقات و فخرِ زندگی

کون انساں! فاتحِ کونین، امیرِ آب و گل
سینۂ آفاق کا لرزندہ و بیدار دل

نورِ گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن
اک مجسم کج کلاہی، اک سراپا بانکپن

ناصرِ اوجِ نگاراں، ناظمِ ابر و چمن
ناظرِ موجِ بہاراں، ناقدِ سرو و سمن

مدعائے آسمان و مقصدِ روئے زمیں
مرکزِ آزادِ عالم، محورِ دنیا و دیں

شارحِ آیاتِ ہستی۔ شارعِ دینِ حیات
قاضیِ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات

مکتبِ نور و حرارت، درس گاہِ خیر و شر
صاحبِ نار و برودت، راکبِ شمس و قمر

دوربینِ خشک و تر، معیارِ نقدِ حسن و ذم
خوردبینِ آب و گل، میزانِ جنسِ کیف و کم

شاہِ گیتی، صاحبِ آفاق، دارائے حیات
ابرِ رحمت، وارثِ فطرت، رئیسِ کائنات

اک زمیں پرور محقق، اک فلک پیما حکیم
اک مقیاسِ تحمل، اک رصدگاہِ عظیم

آسماں کا داور و دارا، زمیں کا دادخواہ
بر کا آقا، بحر کا مولا، فضا کا بادشاہ

دہر کی پیدا و پنہاں طاقتوں کا شہریار
تیرگی کا کارفرما، نور کا پروردگار

طرفہ بازی گاہِ موجودات کا اسرار باز
اوج کا نباض، پستی کا طبیب و چارہ ساز

برق پیما ابلقِ شام و سحر کا شہسوار
جنبشوں کا میرِ لشکر، گردشوں کا تاجدار

عرصۂ تابش کی ضو، رفتار فوجوں کا نشاں
بحرِ ظلمت کی سبک رو کشتیوں کا بادباں

روشنی کا نغمہ، فطرت کا سخن، حق کا پیام
مہر و مہ کا مقتدا، سرکش عناصر کا امام

عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ
پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ

چشمِ ہستی کی بصارت، زندگی کا رازداں
خامشی کا زمزمہ، گونگے حقائق کی زباں

خونِ گل دوڑائے گا جو ان خس و خاشاک میں
نفخ کر دوں گا خود اپنی روح جس کی خاک میں

(۲)

تجھے کیا فصلِ گل سے یا زمانِ خار ہے ساقی
تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی

تری خدمت گذاری کا شرف حاصل نہ ہو جب تک
یہ سنتا ہوں کہ بیداری بہت دشوار ہے ساقی

ذرا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو
کہ سطحِ ذہنِ عالم سخت ناہموار ہے ساقی

خدارا انتہائی لطف و نرمی سے مدارا کر
کہ عقلِ انساں کی اک عمر سے بیمار ہے ساقی

مرا ایمان ہے اک لرزۂ بر اندام بے دینی
مرا اقرار اک سہما ہوا انکار ہے ساقی

نظر کر جوش پہ اپنے کہ اتنی بیخودی پر بھی
یہ رندِ لاابالی کس قدر ہوشیار ہے ساقی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

Staff of 'Zamana' - 1928

From Left to Right

Sitting : L. Puttu Lal Gupta, B. Ram Krishna, M. Daya Narain Nigam, Kh. Abdul Majid (of Intezami Press). Mr. Shyam Sunder.

Standing : M. Mahbub Hasan, Nanak Prasad, Ahsan Ali, M. Mahmud Hasan, M. Ahmad Ali, M. Shyam Baksh and M. Gur Baksh.

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

Sons of M. Daya Narain Nigam
(Photo 1948)

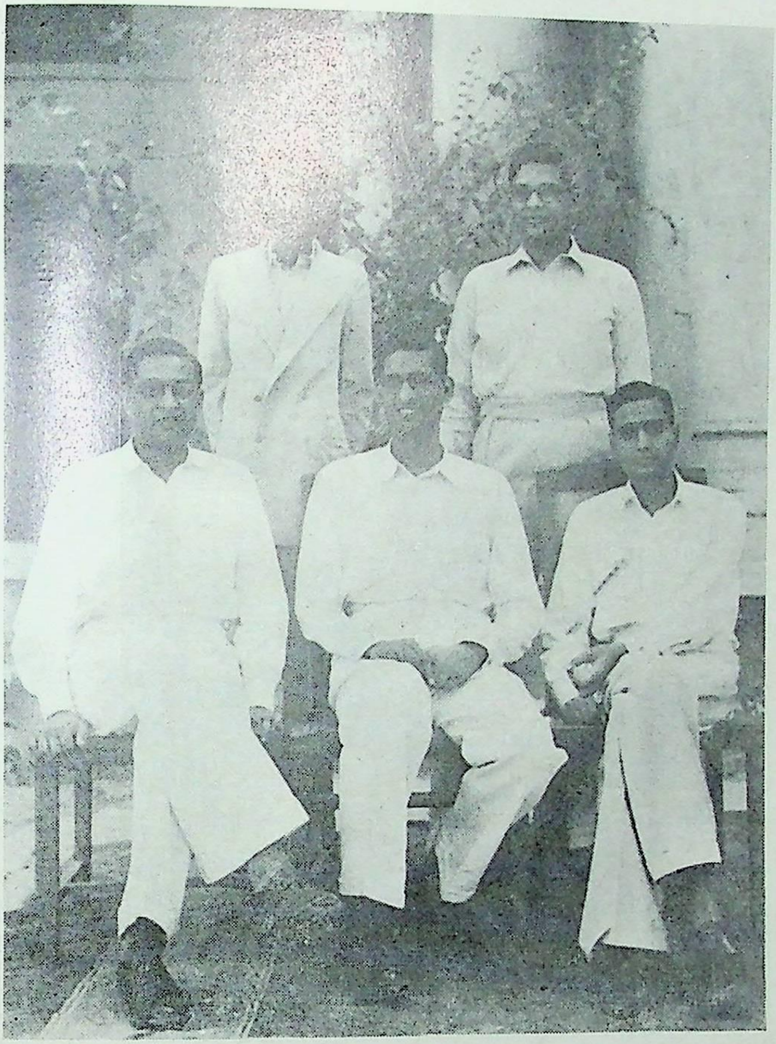

Left to Right

Sitting : Mr. Bishan Narain Nigam, Mr. Sri Narain Nigam, Mr. Shyam Narain Nigam.

Standing : Mr. Raman Nigam, Mr. Brij Narain Nigam.

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی یازاُس نگم

موجودہ اہلِ قلم کہٕ نِگاہ میں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیا نرائن نگم اور "زمانہ"

جناب طالب چکوالی صاحب

جب میں یہ جاننے کے لئے کہ میری "زمانہ" سے کب اور کیسے شناسائی ہوئی، اپنی یادوں کی کتاب کے پنّے اُلٹنے لگتا ہوں تو اُس صفحہ پر آ کر رُک جاتا ہوں جو ۱۱-۱۹۱۰ء کے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ میں اُن دنوں ڈی۔ بی ہائی سکول چکوال کا طالب علم تھا۔ ہمارا خاندان ضلع جہلم کے مشہور متمول خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ روپیہ پیسہ کی افراط تھی۔ ہمارے ہاں اُفق کی رامائن کا پاٹھ ہوتا تھا۔ محلہ والے اور دوسرے لوگ شام کو آتے تھے۔ متعدد اردو اخبارات اور رسائل باقاعدہ آتے تھے جن میں سے کچھ کے نام مجھے ابھی تک یاد ہیں۔ "ہندوستان" لاہور (ہفتہ وار) جس کے اڈیٹر رام رچھپال سنگھ شیدا دہلوی تھے، "شوبرت ورمن کا" "سادھو" لاہور ماہنامہ تھا۔ "زمانہ" کانپور۔ اور آریہ گزٹ لاہور وغیرہ وغیرہ۔ زمانہ سے میری روشناسی ۱۱-۱۹۱۰ء میں ہوئی۔ آہستہ آہستہ یہ محبت کی شکل اختیار کر گئی۔ پریم چند کی کہانی کے لیے "زمانہ" کا انتظار رہتا۔ پرچہ آنے پر سب سے پہلے پریم چند کی کہانی پڑھی جاتی۔ پھر نظموں اور مضامین میں بھی دلچسپی بڑھنے لگی۔ اور ہوتے ہوتے یہ محبت عشق کی صورت اختیار کر گئی۔ ۱۹۱۷ء میں مَیں تعلیم کالج کے لیے لاہور پہونچا۔ ۱۹۲۳ء میں واپس چکوال بطور وکیل آ گیا اور وکالت شروع کر دی۔ شعر و شاعری کا مرض تو چھوٹی عمر ہی میں لگ گیا تھا۔ اب یہ بھی شدت پکڑ گیا۔ ۱۹۲۹ء میں پہلی بار میری غزل "زمانہ" میں شائع ہوئی۔ متعدد مضامین نظم و نثر ۱۹۴۹ء تک "زمانہ" کے لیے برابر لکھتا رہا۔ آخری پرچہ ماہ مئی و جون ۱۹۴۹ء میں بھی میری نظم "خاک و خوں آشام" شائع ہوئی۔ پرچہ بند ہونے تک "زمانہ" والوں نے مجھے اپنے اعزازی خریداروں کی فہرست میں رکھا۔ یہ بھی بڑی بات ہے اور ان کی غیر متزلزل محبت کا ثبوت۔

مجھے بخوبی یاد ہے کہ جن دنوں میں وکالت کرتا تھا۔ ہر سال ماہ ستمبر میں نگم صاحب کا نوازش نامہ بطور یاد دہانی آیا کرتا تھا: "اب تعطیلات میں آپ کسی صحت افزا مقام پر جائیں گے۔ "زمانہ" کے لیے نظم اور مضمون ضرور لکھ کر روانہ کریں۔" میں اُن کے حکم کی تعمیل میں ایسا ہی کرتا۔ ایسا ہی وہ اپنے دوسرے لکھنے والوں کو بھی لکھتے ہوں گے۔ اپنے خود ساختہ فرائض کی تکمیل کا یہ جذبہ اب کہاں دیکھنے کو ملتا ہے!

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"زمانہ" کان پور اُردو جرائد میں ایک منفرد اور ارفع مقام کا مالک رہا ہے۔ بجا طور پر اس کی خدمات اُردو ادب کے لیے ایک بیش بہا تحفہ تصور کی جاتی ہیں۔ "رفتارِ زمانہ" کے عنوان سے نگم صاحب کے مختصر مگر جامع نوٹ جو سیاسی سوجھ بوجھ سے مزین ہوتے تھے ہر شمارے میں خاصے کی چیز مانے جاتے تھے۔

"زمانہ" اور اس کے ایڈیٹر منشی دیا نرائن نگم دو قالب اور یک جان تھے۔ "زمانہ" عمر بھر الف کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ ان کی بے غرض اور خالص ادبی خدمت کا جذبہ بحدِ جنون پہنچا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اور اپنی بے پناہ صلاحیتیں اس کے ارپن کر دیں۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ "زمانہ" کا چاہنے والا نگم صاحب کا گرویدہ نہ ہو۔ یہی حال میرا ہوا۔ اگرچہ منشی جی موصوف سے مجھے شرفِ ملاقات حاصل نہ تھا لیکن عرصہ ہوا "زمانہ" میں ان کا ایک فوٹو شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے بند گلے کا اچکن نما گہرے رنگ کا کوٹ جس میں ہلکی سفید دھاریں تھیں زیب تن کئے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، رنگ پکا، نین نقش تیکھے، چہرے پر سنجیدگی اور مستقل مزاجی کی چھاپ۔ اُن کی یہ تصویر آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ ان کی مقناطیسی شخصیت کے جادو سے، اتنی دور ہوتے ہوئے بھی میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فی الواقعہ میں نے ایسی بے لوث خدمتِ ادب کا جذبہ اور کہیں نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے قدرت نے انھیں اس کام کے لیے منتخب کیا اور اس کی ساری ذمہ داری ان کو سونپ دی جو انھوں نے آخری دم تک بے مثال، انتھک لگن، کے ساتھ نبھائی۔ "زمانہ" کو معیاری رسالہ بنایا۔ اس میں چھپنے والی چیزوں کے لیے ایک ایسا نایاب معیاری پیمانہ تیار کیا جو بے کم و کاست کھرے کھوٹے کی کسوٹی تھا۔ نہ سفارش نہ ستائش، نہ گروہ بندی، نہ جماعت بازی، نہ طرفداری نہ ریاکاری — ان تمام لعنتوں سے اپنا ادبی دامن پاک اور صاف رکھا۔ اعلیٰ پایہ کے با اصول، معروف اور غیر معروف شعرا و اُدبا سے رابطہ قائم کرنا اور ان سے بلا معاوضہ بہترین چیزیں لکھوانا۔ نئے لکھنے والوں کو ڈھونڈنا پہچاننا، اپنے حلقۂ احباب میں لانا کوئی معمولی کام نہ تھا جو نگم صاحب نے اپنے ذمے لیا اور بخوبی نبھایا۔ اسی تگ و دو اور چھان پھٹک کا نتیجہ تھا کہ اردو کے بڑے سے بڑا شاعر، مضمون نگار اپنی تخلیقات "زمانہ" میں شائع کرانا باعثِ اطمینان و وقار سمجھتے تھے چنانچہ اقبالؔ، فراقؔ گورکھپوری، عزیزؔ لکھنوی، ریاضؔ خیر آبادی، منورؔ لکھنوی، سرورؔ جہان آبادی، پریم چند وغیرہم مقتدر ہستیوں کے ارشاداتِ عالیہ "زمانہ" کے صفحات کو جگمگاتے رہے۔ فکر و نظر اور زبان و بیان کے نادر نمونے تخلیق ہوتے رہے اور اردو کا یہ خاموش اور کسی حد تک گمنام خادم چپ چاپ اپنے کام میں منہمک رہا۔ اس کو نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلے کی پروا۔ اگرچہ اردو والوں نے اس بے غرض مجنوں کی وہ قدر نہیں کی اور اُسے وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا لیکن بہر حال قدرت نے اُن کو نیک اور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

قابل اولاد سے نوازا اور اس طرح بے توجہی یاراں کی کچھ تلافی کر دی۔ نظر بد دور ان کے فرزندانِ ارجمند اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز ہوئے اور اپنے یگانۂ روزگار باپ کا نام روشن کرنے والے پسر کہلائے۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ "زمانہ" کا جو ظاہری اور باطنی ڈھانچہ اس کے بانی ایڈیٹر صاحب نے پسند اور رائج کیا وہی تا دمِ آخر برقرار رہا۔ یہ مستقل مزاجی کی ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔ زمانے کی ہوا کے ساتھ چلنا کتنا آسان، کتنا منفعت بخش ہوتا ہے لیکن اپنی دُھن کے پکے لوگ اپنے ارادہ سے متزلزل نہیں ہوتے۔ "زمانہ" کا وہی سادہ، کھُردرا نیلگوں سرورق، وہی سائز وہی بلند معیار، اس کے آخری دم تک قائم رہا۔ سستی مقبولیت اور وقتی شہرت کے پیچھے بھاگنے والے اقتصادی فائدہ، اثر و رسوخ اور تعریف و توصیف تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن ایوانِ تاریخِ ادب میں کوئی مقام حاصل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

"زمانہ" کے سرورق کی پیشانی پر لکھا رہتا تھا "زمانہ با تو نسازد، تو بہ زمانہ بساز" اور اس مقولہ پر منشی دیا نرائن نگم عمر بھر کاربند رہے۔ اگرچہ زمانے نے ان سے نہ نبھائی لیکن وہ ہمیشہ زمانے سے نبھاتے رہے اور پرورشِ لوح و قلم کرتے رہے۔

مقامِ مسرت ہے کہ ان کے نام کے وارث اُن کی پیدائش کا جشن صد سالہ منا رہے ہیں۔ یہ اردو ادب کی ایک اور خدمت ہے جو منشی دیا نرائن نگم کے خاندان کی طرف سے ہو رہی ہے یقیناً منشی صاحب کی روح اس سے مطمئن و مسرور ہوگی۔ میں شاید اُن کے مداحوں اور "زمانہ" کے لیے لکھنے والوں میں سب سے پرانا خادم ہوں جو ابھی بہ قیدِ حیات ہے اور ان کی دکھائی ہوئی بے غرض خدمتِ اردو کی راہ پر بدستور چل رہا ہے۔ میں اپنی عقیدت کے پھول اُن کے لئے دعائے خیر کی شکل میں ارپن کرنے کی سعادت حاصل کرنا اُن کی روح اور اپنے من کی شانتی کا سادھن سمجھتا ہوں۔ خدا کرے ان کے پسماندگان اور اردو ادب کے مستاجرانِ عظیم منشی صاحب کی یادگار کی تشکیل کے کام میں دل و جاں سے ممد و معاون ہوں تاکہ آنے والی نسلیں اردو ادب و صحافت کے اس بے مثال خاموش خادم کے کارہائے نمایاں سے کماحقہ واقف ہو سکیں۔ فی الحقیقت ادائے فرض کا بہترین صلہ احساسِ ادائے فرض ہوتا ہے۔

⁂

حسن ہم کو شیریں معلوم ہوتا ہے اسلئے کہ وہ ہماری زندگی کے ساتھ دیر تک قائم رہنے والے سرود پر رقص کرتا ہے۔ علم گراں بہا ہے اس لئے کہ ہمارے پاس اس کو مکمل کرنے کا وقت نہیں ہے۔

ٹیگور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیانرائن نگم — ایک صحافی

علامہ ابو محمد ثاقب صاحب کانپوری

آنجہانی منشی دیانرائن نگم نے زمانہ کے ذریعہ کانپور کو جو شہرت بخشی ہے اسے اہل شہر بھلا نہیں سکتے۔ میں کوئی مفصل مضمون فن اور شخصیت پر سپرد قلم نہیں کر رہا۔ یہ کام اور ناخن کا یہ قرض میں نے بہت پہلے چکا دیا ہے "نقوش" کے شخصیات نمبر میں منشی صاحب پر میرا مضمون چھپ چکا ہے۔ منشی صاحب اور "زمانہ" ہماری زیادہ توجہ کے مستحق ہیں اور وہ توجہ ان دونوں کو اب تک نہیں مل سکی ہے سنا ہے کہ لکھنؤ یونی ورسٹی میں منشی صاحب پر تحقیقی کام کی شروعات ہو چکی ہے۔ خدا کرے یہ خبر صحیح ہو۔ ابھی منشی صاحب کے دیکھنے والے موجود ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر کام کرنے والے بھی موجود ہیں جن لوگوں سے ان کی مشورت تھی وہ بھی مل جائیں گے مگر ڈھونڈنے سے۔ فراق صاحب سے ان کے گہرے مراسم تھے خط و کتابت اور ملاقاتوں پر بڑی پابندی کے ساتھ عمل ہوتا تھا عبدالقادر بیرسٹر ان کے گہرے دوستوں میں تھے۔ میرے پاس علامہ اقبال۔ بیرسٹر عبدالقادر اور فراق کے خطوط موجود تھے جو انھوں نے مختلف ملکی سیاسی اور ادبی مسائل پر منشی صاحب کو لکھے تھے یہ خطوط مجھ سے میرے بیٹے سید ابوالخیر کشفی پاکستان لے گئے تھے۔ کاش ان قیمتی اور تاریخی دستاویزات کا کوئی حصہ عزیزم منشی سری نرائن نگم سلمہٗ کے پاس محفوظ ہوتا۔ منشی صاحب کی عظمت صرف اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے اردو صحافت کو درجۂ اعتبار تک پہنچا دیا۔

منشی صاحب نے اردو کے ادبی ماہناموں کی صحافت کو وہ سمت و جہت عطا کی جس پر آج کے تمام ادبی رسائل چل رہے ہیں۔ ادارت کے فرائض جس طور منشی صاحب نے پورے کئے۔ ان میں ان کا کوئی حریف نہیں یہ بات ضعیفی کی لغزشوں، بے خبری یا ارادت کیشی پر محمول نہ کی جائے۔ اردو کی پوری ادبی صحافت میری نگاہ میں ہے۔ جالب دہلوی، ظفر علی خاں، روزناموں کے میدان میں نامور ہیں۔ الہلال اور البلاغ مولانا ابوالکلام آزاد کی جولاں گاہ تھے۔ یہ اخبارات ان کے افکار اور ادبی شخصیت کا تعین تو کر سکتے ہیں صحافت کا نہیں۔ جالب دہلوی اور ظفر علی خاں صحافی تھے۔ صحافت میں کسی پرچے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی ترتیب وتہذیب دیکھی جاتی ہے۔ کام لینے کا ڈھنگ بھی خراج تحسین حاصل کرتا ہے۔ منشی صاحب مدیر تھے۔ انھوں نے ایڈیٹری کی ہے۔ ادارت وصحافت کو ادعا ختم کردیتا ہے۔ ذاتی فکر ونظر کی گہری چھاپ کھا جاتی ہے۔ صحافی میزبان ہوتا ہے۔ علامہ حسن نظامی رحمۃ اللہ علیہ، نیاز صاحب، جوش صاحب، حسرت موہانی اپنے میزبان آپ تھے۔ ان تمام اکابرین نے اپنے افکار ومعتقدات کے اظہار کے لئے اپنے جرائد کو وقف رکھا۔ مگر "زمانہ" کا انداز ہی نرالا تھا۔ یہاں تدوین وترتیب کی وہ شائستگی ہے جس پر صحافت اور ایڈیٹری ختم ہے۔

منشی صاحب ایسا سفینہ تھے جو صحافت کے بیکراں کو سنبھالے تھا۔ منشی صاحب نے پرورش کی آزادانہ سوچ اور فکر کی۔ "زمانہ" کی تہذیب وترتیب اور منشی صاحب کی صحافیانہ سرگرمیاں ایک مستقل عنوان ہیں۔ ایک مفصل مضمون کا خاکہ میرے ذہن میں ہے۔ منشی صاحب نے اپنے مشوروں اور صلاحیتوں سے ادباء وشعراء کی ایک پوری فصل اور نسل تیار کی تھی۔ صحافت پر اُن کے احسانات کا شمار مشکل ہے۔

دعا کریں کہ میری صحت اِس موضوع پر ایک مستقل مضمون کا بوجھ اٹھا سکے

مُصوّر کا تخیُّل

وہ نہ فانی مسرتوں کا متلاشی ہے۔ نہ ان کے لئے کوشاں
لیکن اپنے آپ کو اُن جمیل محسمات کے بوسوں سے سیراب کرتا ہے
جو اس کے تخیل کی وسعتوں میں آباد ہیں۔
طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک وہ اُس منعکس نہر پر غور
کرتا ہے، جس کو سورج کی شعاعوں نے روشن اور درخشاں بنا دیا ہے۔
زرد تتلیاں عشق پیچاں کی بیلوں میں منظر کی کیفیت کو دوبالا کر رہی ہے۔
لیکن وہ ان چیزوں کو قابل اعتنا تصور نہ کرتے ہوئے،
فطرت کی اس حقیقت مسلّمہ کا انکشاف کرتا ہے ..... جو حیاتِ انسانی
کے مقابلہ میں قطعاً لازوال وغیر فانی ہے؛

(زمانہ مارچ ۱۹۴۲ء) مولوی مقصود علی از شیلے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیا نرائن نگم ایک نصب العین
زمانہ ایک تحریک اور سنگ منزل

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی صاحب گوہاٹی

سورگیہ منشی دیا نرائن نگم ایک نصب العین تھے اور ان کی ادارت میں ۱۹۰۳ء سے ان کے وصال ۱۹۴۲ء تک پابندی سے شائع ہونے والا ماہنامہ رسالہ "زمانہ" ایک تحریک بھی تھا اور اردو زبان وادب کو پروان چڑھانے کے نقطۂ نظر سے ایک سنگ میل بھی تھا۔ مدیر موصوف کا اردو کے لئے عزم و جوش، ایثار و ولولہ اسی بات سے ظاہر ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اقتصادی اعتبار سے گھاٹے کا سودا پسند کیا ورنہ ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ کسی اعلیٰ سرکاری منصب پر بآسانی فائز ہوسکتے تھے۔ کیونکہ بیسویں صدی کے پہلے دہوں میں گنتی کے طلبہ ہی بی اے تک پہونچ سکتے تھے بلکہ مڈل اور انٹرینس جیسے چھوٹے امتحانات پاس کرلینے پر در ہائے ملازمت وا ہونے لگتے تھے۔ دیا نرائن نگم بی۔ اے تھے اور انھوں نے انگریزی ادبیات کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ لہٰذا اس دور کی اردو کی بے بضاعتی ان کے سامنے تھی۔ رگِ حمیت بھڑکی اور انھوں نے "زمانہ" کے اجراء پر غور کرتے ہوئے نیز اقتصادی پریشانیوں کی ہولناکی سے منھ پھیر کر اردو کے لئے ایک سنگ منزل فراہم کیا۔

زمانہ میں شعری و نثری تخلیقات کے علاوہ سماجی، ثقافتی، اقتصادی، تاریخی قومی موضوعات پر بھی مضامین ہوتے تھے۔ مزید براں انگریزی، اردو، ہندی وغیرہ زبانوں میں چھپی کتابوں پر عالمانہ و دیدہ ورانہ تبصرے بھی نکلا کرتے تھے۔ اداریوں اور تبصروں سے ابھرنے والی حقیقت و بصیرت ہر اعتبار سے در خور اعتنا ہوتی تھی۔ زمانہ کو منشی جی کے توسط سے مشاہیر کا تعاون حاصل رہا۔ کتنے لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اقبال کا قومی ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" سب سے پہلے "زمانہ" ہی میں ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ آنولہ کے ایک مشہور و معروف حکیم کا لستھ شاعر جوایا نے بریلی میں مجھے بتایا تھا کہ قومی ترانہ لکھنے کی فرمائش منشی دیا نرائن نگم صاحب نے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اقبال، چکبست اور درگا سہائے سرور سے کی تھی۔ بلکہ وہ یہ بھی بتلاتے تھے کہ ان تینوں شاعروں کو منشی جی نے خطوط ان کے اسامنے ہی لکھے۔ اگر تلاش کی جائے تو اس امر پر مزید روشنی پڑ سکتی ہے۔ پیلی بھیت میں سرور صاحب کے ایک رشتہ دار ابھی حیات ہیں، شاید ان کی جانب رجوع کرنے پر خط مذا مل جائے۔ اقبال کو قومی ترانہ لکھ کر جو ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی وہ "زمانہ" ہی کے توسط سے حاصل ہونا شروع ہوئی۔ بہر کیف "زمانہ" میں چوٹی کے شعراء کا کلام شائع ہوتا تھا۔ اکبر الہ آبادی، حالی، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، یگانہ، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، نوبت رائے نظر، جگت موہن رواں، اثر لکھنوی اور دوسرے چوٹی کے شعراء کی شعری تخلیقات "زمانہ" کے شماروں میں چھپتے رہے۔ مشمول نثری تخلیقات بھی وقیع و معیاری ہوا کرتی تھیں۔

بدلتی دنیا اور اس کے ہم عصری میلانات و رجحانات سے قارئین کو روشناس کرانے میں "زمانہ" نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کی بات اکثر و بیشتر سننے میں آتی ہے مگر نہ جانے کیوں "زمانہ" کی کارکردگی پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ اردو علمیت آج تک "زمانہ" کی پرانی فائلوں کی ورق گردانی تو کرتی ہے مگر "زمانہ" نے اردو کو جو پلیٹ فارم فراہم کیا، زبان و ادب کو جو استعداد و توانائی دی اس کا جائزہ نہیں لیا جاتا۔ غالباً بہت کم اشخاص اس حقیقت سے آشنا ہوں گے کہ دھنپت رائے کو پریم چند منشی دیا نرائن نگم ہی نے بنایا۔ زمانہ نے تمام اصناف ادبیات کو پروان چڑھایا۔

بایں ہمہ زمانہ گھاٹے کا سودا رہا اور منشی دیا نرائن نگم نے جملہ تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے اپنے مشن کو جاری رکھا بلکہ ۱۹۱۲ء سے ایک ہفتہ وار "آزاد" کو نکالنا شروع کیا۔ یہ ہفتہ وار خاصا مقبول ہوا بلکہ اس نے بہت بڑی حد تک "زمانہ" سے ہونیوالا مالی خسارے کو دور بھی کیا۔

منشی دیا نرائن نگم ہمہ جہت انسان تھے، بیباک صحافی، آنریری مجسٹریٹ، ممبر میونسپل بورڈ، کرائسٹ چرچ کالج میں اردو ادب کے پروفیسر، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب و ثقافت کے نقیب و علمبردار، غرض کہ ان کی زندگی ہمیشہ سماج کے فلاح و بہبود کے لیئے وقف رہی۔ ہندوستان کی سیاسی تحریک کے لیے بھی انھوں نے کچھ کم کام نہیں کیا۔ ۱۹۰۷ء میں لالہ لاجپت رائے کی جلاوطنی منٹو مارلو اصلاحات سے پیدا شدہ صورت حالات، رولٹ ایکٹ، ۱۹۲۵ء میں کانپور میں منعقد آل انڈیا کمیٹی کا اجلاس وغیرہ مسائل پر منشی جی بے باکانہ لکھتے رہے۔ ۱۹۳۱ء میں گنیش شنکر ودیارتھی کی شہادت کے بعد کانپور میں ہندو مسلم فساد نہایت سنگین واقعہ تھا۔ منشی دیا نرائن نگم کے اپنے محلے کے بیشمار مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دی۔ سیکولرازم کی ایسی عظیم مثال پیش کی کہ کانپور کے ہندو مسلم حضرات

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ابھی تک منشی دیانرائن نگم کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔

آج کا اردو ادب جواب معیار و وقعت میں کسی زبان کے ادب سے آنکھیں چار کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔ منشی جی کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اردو کے لیئے منشی دیانرائن نگم واقعی ایک ایسے مردِ کامل تھے جس کا پرتو درج ذیل شعر سے ابھرتا معلوم ہوتا ہے ۔

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشربِ نلبے
دل گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بے تابے

محبّت مادری

کوئی انسان اور کوئی قوم ایسی پیدا نہیں ہوئی جسمیں محبت مادری کا ذکر نہ ہو۔ ایسی کوئی قوم نہیں جس کے ادیبوں اور شاعروں نے اس سلسلہ میں خامہ فرسائی نہ کی ہو چنانچہ بزرگوں کے چند اقوال ہم اس جگہ نقل کرتے ہیں :-

ا۔ "صرف ماں سمجھ سکتی ہے کہ دوست رکھنا اور اس کے ساتھ ساتھ خوش رہنا کیا چیز ہے؟ میرا دل ان حضرات کے لئے افسوس کرتا ہے جو ماں کی خوشی کا احساس نہیں کرتے": رومن رولانڈ

۲۔ "اے مہر مادری تو مقدس ترین محبت ہے تیری ملکوتی عظمت کی توصیف اس آب و گل کی زبان سے ممکن نہیں": گوتم بدھ

۳۔ "اگر تمام دنیا ایک بیکس کا ساتھ چھوڑ دے اور کسی ایک کیلئے بھی اس کے دل میں ہمدردی باقی نہ ہو، پھر بھی اے ماں کی پاک محبت تو ایک مقدس ستارہ کے مانند اس لازوال آسمان پر ہمیشہ ثابت قدمی سے چمکتی رہے گی": افلاطون

۴۔ "ان آنکھوں کو یاد کر جو ہر ساعت تیری جستجو میں رہتی ہیں اور تیری خوشی کا سامان مہیا کرنے میں سرگرداں تھیں۔ ان ہاتھوں کو یاد کر جو راتوں کو اپنی شفقت کی وجہ سے تیرا درد دور کرنے کے لئے ذرا بھی ساکت نہیں ہوئے۔ اس گھڑی کو یاد کر جب اس نے تیری خاطر زخم پر زخم کھائے اور پھر بھی جاں نثار رہی۔ اور پھر وہ زانو ہو جا اور ان کیلئے دعائے خیر کر": رابندرناتھ ٹیگور

۵۔ "صرف ایک محبت ہی ایسی نعمت ہے جو حقیقتاً مکمل اور مثالی ہے اور یہ وہی محبت ہے جو ماں کو اولاد سے ہوتی ہے": مورلیس دونی

(مشیر احمد انصاری)

GC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیا نرائن نگم اور "زمانہ" کی ادبی خدمات

ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کاشمیری

منشی دیا نرائن نگم ۲۲ مارچ ۱۸۸۲ء کو کانپور میں ایک معزز کایستھ خاندان میں پیدا ہوئے ۲۱ برس کی عمر میں کرائسٹ چرچ کالج کانپور سے ۱۹۰۳ء میں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور اسی سال "زمانہ" کی ادارت قبول کی۔ ۱۹۱۳ء میں "آزاد" ہفتہ وار جاری کیا جو کچھ عرصہ تک روزانہ رہا۔ ۱۹۱۵ء میں آنریری مجسٹریٹ ہوئے۔

رام بابو سکسینہ مزید لکھتے ہیں:-

"آپ مختلف مصروفیتوں کے مرکز ہیں جس میں معاشرتی، سیاسی، علمی، ادبی، تعلیمی، اخبار، غرضکہ ہر قسم کے مشاغل اور مصروفیتیں شامل ہیں۔ سوشل رفارم (اصلاح معاشرت) کے معاملات میں آپ نہایت روشن ضمیر اور آزاد خیال، اور سیاسیات میں اعتدال پسند ہیں۔ تعلیمی اور ادبی مشاغل میں خاص کر آپ کو توغل ہے۔ اور بحیثیت ایک مدیر اور جریدہ نگار کے تو آپ ہمارے نوجوانوں کے لیے خضر طریقت ہیں کہ وہ آپ کی مثال کو دیکھیں اور آپ کی کامیابی سے سبق حاصل کریں۔ آپ نے اپنی پوری عمر اپنے پیارے "زمانہ" کی بہبودی اور ترقی میں صرف کر دی۔ "زمانہ" کا شمار اردو کے اُن مخصوص چند پرچوں میں ہے جو فی الواقع زبان کی سچی خدمت کرتے ہیں اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں قابل ہندو اور مسلمان دونوں بلا تفریق مذہب و ملت مضامین لکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہوتی ہیں اور اس میں معاشرتی اور سیاسی مضامین پر ایسے اہل قلم کے مضامین درج ہوتے ہیں جو اپنے اصابت رائے کے واسطے مشہور ہیں۔ خود منشی صاحب کے مضامین جب کبھی نکلتے ہیں نہایت جچے تُلے اور غیر جانبدارانہ ہوتے ہیں مگر ہم کو افسوس اور شکایت ہے کہ ان کے مضامین سے پرچہ زیادہ تر فیضیاب نہیں ہوتا۔ منشی صاحب ہندوستانی اکاڈمی کے ایک پُرجوش اور سرگرم ممبر بھی ہیں۔"[1]

سکسینہ صاحب نے نگم صاحب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار آج سے ۵۵ - ۵۸ سال قبل اس وقت کیا تھا جب کہ وہ انگریزی میں "ہسٹری آف اردو لٹریچر" مرتب کر رہے تھے۔ اس زمانے میں "زمانہ" عالم شباب میں تھا۔ اور اس کی چالیس جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔

---

[1] تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ ۱۹۶۶ء مترجمہ مرزا محمد عسکری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"زمانہ" کی فائلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نگم صاحب ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے دلدادہ تھے۔ ان کا دل مذہبی اور سیاسی تعصب سے آئینے کی طرح صاف و شفاف تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ زندگی کے نصب العین میں حسنِ عمل اور اعلیٰ کارکردگی کا جذبہ کار فرما تھا۔ وہ اعلیٰ قدروں کے پابند تھے کبھی کسی وقت مصلحت یا سیاسی دباؤ کے تحت دوسرے فرقوں کے بارے میں آشیانۂ دو عملی کو دل میں جگہ نہیں دیتے تھے۔ کانپور میں ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کی مسجد کا ہنگامہ برپا ہوا۔ مسلمان جوش میں آگئے، مظاہرہ کیا، کئی مسلمان گولی کا نشانہ ہوگئے۔ نگم صاحب نے ایک زبان ہوکر انگریزوں کی اس دہشت گردی اور بربریت کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۹۳۱ء میں کانپور میں جو فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا۔ اس میں موصوف نے بڑی فراخدلی سے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور مہذبانہ برتاؤ کیا اور محلے کے اجڑے ہوئے مسلمانوں کو اپنے مکان میں پناہ دی۔

نگم صاحب نے زمانہ میں "رفتارِ زمانہ" کے عنوان سے تحریک آزادی کو بڑی تقویت بخشی۔ انھوں نے "آزاد" کے ذریعہ آزادئ ہندوستان کی شمع فروزاں کرنے کے لئے عمر بھر جدوجہد کی۔ خود اخبار کا نام "آزاد" اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ غلامی کے خلاف ایک احتجاج اور آزادی کا سمبل تھا۔ انھوں نے نامساعد حالات اور تنگ دستی میں محض ایک خاص جذبے کی بنا پر ۱۹۱۲ء میں اخبار نکالنا چاہا تھا۔ اس سلسلے میں منشی پریم چند سے بھی تعاون کی درخواست کی۔ منشی صاحب اگست ۱۹۱۲ء کے ایک خط میں نگم صاحب کو لکھتے ہیں:

"آپ کا ہفتہ وار "کامریڈ"[1] کے نمونے کا ہونا چاہیے۔ مجھ سے جو مدد ہو سکے گی۔ کرتا رہوں گا۔ فی الحال میری طاقت مجھے اجازت نہیں دیتی کہ کچھ ایثار کر سکوں ــــ نام "ہندو" بہت موزوں تھا۔ میں ہفتہ وار ایک دو صفحے بلا ناغہ آپ کی خدمت میں بھیجا کروں گا۔ کچھ نوٹ ہوں گے۔ بن پڑا تو کوئی ایڈیٹوریل، کبھی کسی مضمون کا ترجمہ، کبھی کچھ، مگر اخبار کا نمونہ کامریڈ ہی ہو۔ پالیسی ہندو۔ اب میرا ہندوستانی قوم پر اعتماد نہیں رہا۔"[2]

نگم صاحب کی دوراندیشی اور تدبر دیکھئے کہ انھوں نے پریم چند کے مجوزہ "ہندو" نام کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ موصوف نے ہندوستان کی قومی یکجہتی اور مختلف فرقوں میں سیاسی ہم آہنگی کے جذبے کو فروغ دینے کے لئے اخبار کا نام آزاد رکھا۔ اور نومبر ۱۹۴۲ء یعنی ان کی موت تک برابر ہندوستانی عوام کی ترجمانی کرتا رہا۔

جب آل انڈیا کانگرس کا اجلاس ۱۹۲۵ء میں کانپور میں منعقد ہوا تو نگم صاحب نے اس موقعہ پر زمانہ کا ایک خصوصی نمبر بھی شائع کیا جس میں مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو اور دوسرے سرکردہ

---

[1] "کامریڈ" محمد علی جوہر انگریزی میں کلکتے سے نکالتے تھے۔

[2] پریم چند کے خطوط صفحہ ۴۳ مرتبہ مدن گوپال مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رہنماؤں کے پیغامات بھی درج ہیں۔

نگم صاحب بڑے باغ و بہار آدمی اور شریف النفس تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ جس میں تمام فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ دورِ حاضر کے سب سے بڑے مستند شاعر حضرت جوش ملیح آبادی جو بڑی سے بڑی شخصیتوں سے بآسانی متاثر نہیں ہو سکتے ہیں نگم صاحب کے حسن کردار اور اعلیٰ اقدار سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ انھوں نے موصوف کے جوہر کردار کی اپنی ایک شاہکار نظم "نگاہِ خلوص بیں" میں اس اسلوب سے ڈھالا کہ نگم صاحب سراپا پیکر خلوص نظر آتے ہیں۔ نظم میں ایک شریف انسان کی شرافت و بزرگی کے تمام خدو خال سامنے آجاتے ہیں "نگاہِ خلوص بیں" آج سے پورے چالیس سال قبل نگم صاحب کی زندگی میں پہلی مرتبہ جوش کی مشہور و معروف کتاب "آیات و نغمات" (ص ۴۶ تا ص ۴۸) مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور سنہ ۱۹۴۱ء میں چھپی تھی

ہنس راج رہبر نگم صاحب کے اخلاق و کردار کے بارے میں لکھتے ہیں[۱]:

"منشی دیا نرائن نگم بہت ہی شریف اور نیک واقع ہوئے ہیں۔ اور نہایت خلوص اور محنت کے ساتھ "زمانہ" کی ایڈیٹری کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایڈیٹر کا فرض ادب کو سنوارنا اور وسعت دینا ہے۔ جہاں اسے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنا ہوتا ہے وہاں نئے اور ہونہار ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی اس کا فرض ہے۔ وہ اپنے اس فرض کو بدرجۂ اتم نبھا رہے تھے۔ وہ لکھنے والوں کے ساتھ جھٹ دوستانہ تعلقات قائم کر لیتے تھے۔ میں اپنے تجربے سے ان کی حوصلہ افزائی اور انسان دوستی کا قائل ہوں سنہ ۱۹۳۶ء میں میں نے انھیں اپنا ایک افسانہ "بجھیا دادا" بھیجا۔ پہلے ان سے مطلق جان پہچان نہیں تھی۔ اور میری افسانہ نگاری کی ابتدا تھی۔ انھوں نے نہ صرف وہ افسانہ "زمانہ" میں شائع کیا بلکہ فوراً ہی ایک خط لکھ کر کامیاب افسانہ لکھنے پر مبارکباد پیش کی اور متواتر لکھتے رہنے کا تقاضا کیا۔ پھر جب تک مرحوم زندہ تھے، ان سے خط و کتابت رہی۔ انھوں نے نہ صرف ہمیشہ حوصلہ افزائی کی بلکہ نیک مشورے بھی دیئے۔

نگم صاحب کو آخر عمر میں گوناگوں آلام و مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا عرصۂ حیات آہستہ آہستہ تنگ ہونے لگا۔ جولائی سنہ ۱۹۳۹ء میں ان کی بیوی مختصر علالت کے بعد غیر متوقع طور پر انتقال کر گئیں دل کو چور چور کرنے کے لیئے یہ صدمہ کیا کم تھا کہ ایک اور کوہِ غم ٹوٹ پڑا یعنی بیوی کے انتقال کے صرف پندرہ روز کے بعد ان کی جواں سال صاحبزادی جن کا سن ۲۰ برس کا تھا ان کے فراق میں باپ کو ایک اور داغ جدائی دے کر رخصت ہو گئیں۔ ابھی بیوی اور صاحبزادی کی یاد تعزیت اٹھنے نہیں پائی تھی کہ موصوف کو اپنے چھوٹے بھائی رام سرن نگم ڈپٹی کلکٹر کی میت بھی فروری سنہ ۱۹۴۱ء میں اٹھانی پڑی۔ اللہ! اللہ! یہ وہ جانکاہ سانحات تھے کہ جنھوں نے نگم صاحب کے شیشۂ دل پر سنگ گراں کا سا کام کیا اور ان کے دل و دماغ کے تار و پود منتشر ہو گئے۔ ان کی نظر میں دنیا ویران ہو گئی اور زندگی کے حسین لمحات سنسان نظر آنے لگے۔ پیہم رنج و الم کے باعث شروع ستمبر ۱۹۴۲ء میں دل کی بیماری لاحق ہو گئی ۱۸ ستمبر سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

[۱] پریم چند ص ۲۳ مطبوعہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی بار دوم مئی سنہ ۱۹۵۵ء۔

صاحب فراش ہوئے اور گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہیں رہے۔ علاج معالجہ خوب کیا لیکن بے سود، دل پہلے ہی نڈھال ہو چکا تھا۔ اب قوی بھی مضمحل ہو گئے اور لگتا تھا کہ تارِ نفس چند ہی دنوں میں ٹوٹنے والا تھا۔ آخر کار پہلی اور دوسری نومبر ۱۹۴۲ء کی درمیانی رات ایک بجے کے قریب دل کا ایسا دورہ پڑا کہ علم و ادب اور آسمانِ صحافت کا یہ مہرِ درخشاں ۶۴ سال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ ع

کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

نگم اور زمانہ:۔ "زمانہ" اردو ادب کا شہرہ آفاق ماہنامہ تھا۔ یہ فروری ۱۹۰۳ء میں پہلی مرتبہ منشی شیو برت لال ورمن ایم۔ اے کی ادارت میں قیصری پریس واقع بریلی سے شائع ہوا تھا۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں "زمانہ" منشی دیا نرائن نگم کی ذمہ داری اور ادارت میں پھلنے پھولنے لگا اور جون ۱۹۴۹ء تک یعنی ۴۶ سال کے عرصۂ دراز میں ۹۲ جلدوں میں اردو ادب کی خدمت کرتا رہا۔ ہر جلد جنوری سے جون تک چھ ماہی ہوتی تھی۔ ابتدا میں اگرچہ زمانہ کا دفتر نئی چوک کانپور میں تھا لیکن یہ بریلی ہی میں چھپتا تھا۔ چند ہی مہینوں کے بعد نگم صاحب نے کانپور میں اپنا ذاتی پریس کھولا۔ یہ رسالہ ابتدا ہی سے شہرت سے ہمکنار ہوا تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں بڑی بڑی ہستیاں تھیں۔ ان میں شبلی، حالی، اکبر الہ آبادی، اقبال، آغا شاعر قزلباش، حسرت موہانی، سرور جہان آبادی، نوبت رائے نظر، چکبست لکھنوی، شاد عظیم آبادی، سورج نرائن مہر، محشر لکھنوی، شاد حیدر آبادی، عزیز لکھنوی، پیارے صاحب رشید، اعلیٰ محمد عارف، نادر کاکوروی، اثر لکھنوی، صفی لکھنوی، ریاض، آرزو لکھنوی، ظریف لکھنوی، یاس چنگیزی، عشرت لکھنوی، منشی جوالا پرشاد، منور لکھنوی، علامہ کیفی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، برق دہلوی، پنڈت کشن نرائن در ابر، سید سلیمان ندوی، پیارے لال شاکر، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، شیخ عبدالقادر، مولوی عبدالحق، وقار الملک، مرزا سلطان احمد، مولوی ذکاء اللہ، تیرتھ رام فیروزپوری، اقبال بہادر سکسینہ، منشی پریم چند، درگا سہائے سرور، سر تیج بہادر سپرو، وحید الدین سلیم پانی پتی، مجنوں گورکھپوری، .... فراق گورکھپوری، سید مسعود حسن رضوی، عزیز بلگرامی، بیتاب دہلوی، محمد یحییٰ تنہا، ضیاء الدین برنی، حامد حسن قادری، نیاز فتح پوری، نظم طباطبائی، پروفیسر محمد حبیب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

زمانہ اور منشی پریم چند میں چولی دامن کا ساتھ رہا۔ موصوف کے قریب ایک سو افسانے اور ڈرامے زمانہ میں شائع ہوئے۔ ان کا تاریخی ڈرامہ "کربلا" اس میں جولائی ۱۹۲۹ء میں قسط وار چھپنا شروع ہوا جو اب کتابی صورت میں آ گیا ہے۔ یہ نگم ہی تھے جنھوں نے پریم چند کو حیاتِ ابدی بخشی ۱۹۰۴ء کے آخر تک پریم چند "زمانہ" کے قلمی معاونین میں شامل ہوئے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک تنقیدی مضمون ۱۹۰۵ء میں زمانہ میں بغرض اشاعت اور ایک ناول کا مسودہ ایڈیٹر کے مشورے کے لئے بھیجا تھا[1] ان کی

---

[1] پریم چند کے خطوط ص ۳۱۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پہلی کہانی "دنیا کا سب سے انمول رتن" سنہ ۱۹۰۶ء میں زمانہ میں چھپی تھی۔ سنہ ۱۹۰۵ء سے سنہ ۱۹۰۸ء تک موصوف ادارۂ زمانہ سے کانپور میں منسلک رہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے آخر میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" کے نام سے زمانہ پریس کانپور میں چھپا۔ انگریز اس کی اشاعت سے برہم ہوئے اور انھوں نے اس کی کوئی سات سو جلدیں ضبط کیں۔ نگم صاحب کو پریس ایکٹ کی خلاف ورزی کے پاداش میں پچاس روپیہ کا جرمانہ ادا کرنا پڑا۔ اس کے بعد آئندہ لکھنے کے لئے انھوں نے دھنپت رائے اور نواب رائے کے بدلے دنیائے ادب میں پریم چند کے فرضی نام کو ایجاد کرکے ایسا چمکایا کہ لوگ ان کے اصلی نام سے واقف نہیں ہیں۔ یہ فرضی نام پریم چند کو بھی پسند آیا۔

اس بارے میں نگم صاحب پریم چند نمبر میں لکھتے ہیں:۔

"پریم چند شروع میں "نواب رائے" کے نام سے لکھا کرتے تھے اور یہ نام انھیں بہت عزیز تھا۔ کیونکہ ان کے والد پیار سے انھیں "نواب" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ اور یہ نام ہندو مسلمان کے معاشرتی اتحاد کو بھی تازہ رکھنے والا تھا۔ مگر جب "سوزِ وطن" کی بے ضابطہ ضبطی کے بعد الٹے افسروں نے انھیں تصنیف و تالیف کی ممانعت کر دی تو ان کو اس نام کو خیرباد کہنا پڑا۔ ان تنگ خیال افسروں کا بس چلتا تو آج ہندوستانی ادب میں پریم چند کا وجود ہی نہ ہوتا..... نواب رائے کی روح نے "پریم چند" کے قالب میں جنم لیا۔ یہ نام راقم الحروف ہی نے تجویز کیا تھا۔ اور عرصے تک وہ اس نام سے صرف "زمانہ" میں ہی لکھتے رہے۔ یہ پابندی خود ان کی محبت نے ان پر عاید کی تھی، ورنہ اس کا کوئی مطالبہ یا معاہدہ نہ تھا"

اس امر کا اعتراف خود پریم چند نے ۴ ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں بھی کیا تھا جو انھوں نے امتیاز علی تاج کو لکھا تھا۔ کہتے ہیں:۔

"نواب رائے میں ہی تھا۔ جب سوزِ وطن لکھنے کے بعد مجھے ڈیپارٹمنٹ نے مضامین لکھنے سے مجبور کر دیا اور ڈیپارٹمنٹل سختیاں شروع کیں تو میں نے بابو دیا نرائن کے مشورے سے یہ نام تجویز کیا۔" [1]

نگم صاحب لین دین کے معاملے میں بالکل کھرے تھے۔ وہ پریم چند کو زمانہ میں لکھنے کے لئے ہمیشہ معاوضہ دیا کرتے تھے۔ یہ معاوضہ پانچ سے دس روپے تک کا ہوتا تھا۔ نگم کے نام ایک خط میں پریم چند مورخہ ۲۲ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں:۔

"میرے پانچ قصے زمانہ میں نکل چکے ہیں۔ ۱۔ روئے حیات، ۲۔ معمہ، ۳۔ لال فیتہ، ۴۔ تقدیر، ۵۔ موٹھ۔ ان کا جو معاوضہ مناسب سمجھیں دیں!!"

"زمانہ اپنے تمام معاصر رسائل، خدنگ نظر، لکھنؤ، اردوئے معلّٰی علیگڈھ، مخزن لاہور، ادیب الٰہ آباد، الناظر لکھنؤ، معارف اعظم گڈھ، عصر جدید میرٹھ، دکن ریویو، دلگداز لکھنؤ۔

---

[1] پریم چند کے خطوط صہ ۲۱۵

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

شباب اردو لاہور، ہمایوں لاہور، صوفی پنڈی بہاء الدین پنجاب، تہذیب لکھنؤ، معیار لکھنؤ وغیرہ میں غیر معمولی شہرت کا حامل تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ نگم کی ادارت میں تقریباً چالیس سال تک پروان چڑھتا رہا۔ اس عرصۂ دراز میں۔ اردو کے بہترین اور اعلیٰ ترین شاعر، انشاء پرداز، افسانہ نگار، ناول نویس، محققین، ناقدین، مورخین اور دیگر ماہر فنون نے اپنی بیش بہا نگارشات سے زمانہ کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ زمانہ نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کو فروغ دینے میں غیر مسلمین کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ مسلمانوں کا ہے۔ اب صرف آبادی کے تناسب کے اعتبار سے الگ دلیل یا روائی بات ہے، زمانہ کی بے مثال ادبی خدمات کے پیش نظر ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ نگم صاحب اردو زبان کی ترقی کے لئے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے ایک سنگم تھے۔

زمانہ میں بہت سے شعرا کا وہ کلام بھی ملتا ہے جو ان کے کسی مجموعہ میں آج تک نہیں چھپا ہے اگر یہ کلام یکجا کر کے مرتب کیا جائے تو اردو ادب میں کئی دواوین کا اضافہ ہو سکتا ہے اسی طرح اس کے شماروں میں بہت سے مضامین اور افسانے ہیں جن سے لوگ ناواقف ہیں۔ ان میں اقبال کی تحریریں اور پریم چند کے افسانے قابل ذکر ہیں۔[1]

زمانہ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اس میں اقبال کی شہرۂ آفاق نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ یہ نظم بعد میں مخزن لاہور جلد ۸ نمبر ۱ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۰۴ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد جولائی ۱۹۱۲ء میں ادیب الہ آباد میں شائع ہوئی تھی۔

---

[1] چونکہ ادارہ کی طرف سے رسالہ زمانہ سے اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے اس مضمون سے اقتباساتِ زمانہ حذف کر دیئے گئے ہیں۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیا نرائن نگم اور "زمانہ"

جناب ڈاکٹر اطہر شیر صاحب

اردو زبان ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ تہذیب و ثقافت اور تمدن کا ایک قیمتی ورثہ ہے۔ اسکی ترویج و اشاعت میں اگر ایک طرف مسلمانوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے تو دوسری طرف ہندوؤں نے بھی اپنے خونِ جگر سے اسکی آبیاری کی ہے۔ پریم چند کی ادبی خدمات کو کون فراموش کر سکتا ہے، ایک طرف وہ اردو مختصر افسانہ کے بانی ہیں تو دوسری طرف انھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستان کے دیہاتوں کی سماجی زندگی کو پیش کر کے اردو ناول کو ایک نئی سمت دکھائی۔ پریم چند، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت کشن پرشاد کول، پنڈت دتاتریہ کیفی، سر تیج بہادر سپرو اور منشی دیا نرائن نگم سے لے کر کرشن چندر، کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ اور اوپندر ناتھ اشک تک اور پھر وشوا متر عادل، بلراج مینرا، جوگیندر پال، بلونت سنگھ، شانتی رنجن بھٹاچاریہ، بلراج کومل، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ سے لیکر فلمی دنیا کے آنند بخشی اور گلشن نندا تک اردو زبان و ادب نے جو تاریخ کا فاصلہ طے کیا ہے وہ جلوۂ صد رنگ نہیں ہزار رنگ ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ اور بھی کتنے نام ہیں جو ماضی اور حال کے روزن سے اپنی کرنیں پھیلاتے رہے ہیں اور پھیلا رہے ہیں۔ ان لوگوں کی خدمات آج بھی مینارۂ نور بنی ہوئی ہیں۔ اور پھر لتا منگیشکر اور آشا بھونسلے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ مانا کہ ان دونوں کی ادبی تخلیقات اب تک دیکھنے میں نہیں آئی ہیں مگر ان کے لبوں سے اردو کی میٹھی اور سریلی آواز کے رس بھرے نغمے جو ہمارے کانوں میں پڑ کر دل کے تاروں کو جھنجھوڑتے رہے ہیں اسے ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔

زبان و ادب ہو یا فلسفہ و حکمت اس میں جاں سوزی اور جاں سپاری کی ضرورت ہے۔ اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے بڑے خلوص، جذبے اور لگن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تاریخ کے دھارو کو موڑنے کے لئے خار دار وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جہاں آبلہ پا بھی چھل جاتے ہیں اور تب سینوں کے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بل چلنا پڑتا ہے۔ منزل انھیں لوگوں کو ملتی ہے۔ ایسے ہی باہمت اور بلند حوصلہ لوگوں میں منشی دیا نرائن نگم بھی تھے۔ نگم صاحب نے بیسویں صدی کے آغاز میں ایک رسالہ "زمانہ" نکالا جو ادب کے افق پر طلوع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شمالی ہندوستان کے اہم ترین اردو رسالوں میں اعلیٰ ترین مقام پر پہونچ گیا یہ رسالہ پہلے بریلی سے نکلتا تھا پھر اس کا دفتر کانپور منتقل ہوا۔ اس رسالہ میں اس زمانہ کے تمام نامور شعراء ادیب اور انشاء پرداز مثلاً مولانا نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، لالہ لاجپت رائے، رام تیرتھ اور نظم میں حالی، شوق قدوائی، شاد عظیم آبادی، اکبر الٰہ آبادی وغیرہ اس کے قلمی معاونین میں سے تھے۔ "زمانہ" اپنے دوسرے دور میں ایک نئی شان ایک نئی آن بان اور شباب آفرینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ اس عہد کے لکھنے والوں میں منشی پریم چند، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبال اور درد اں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "زمانہ" ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ پھر زمانہ کا تیسرا دور آیا جب وہ اپنی سنجیدگی اور پختہ کاری کی وجہ سے عوام اور خواص کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔

"زمانہ" جس وقت نکلا تھا اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات آج سے بالکل مختلف تھے صحافت کا معیار بھی کچھ عجیب تھا۔ اس وقت اردو کے اخباروں میں کرزن گزٹ، نیر اعظم، وکٹوریہ پیپر اور دبدبۂ سکندری جیسے اخبار جاری تھے۔ اور رسالوں کے عوض گلدستے نکلا کرتے تھے۔ جس میں طرحی غزلیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ان گلدستوں میں پیام عشق، گلچین سخن، گلچیں، عطر فطنہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "زمانہ" اپنے زمانے اور رنگ کا سب سے نیا اور مختلف رسالہ تھا جو اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کی وجہ سے ہر جگہ بے حد مقبول تھا۔ اس زمانہ میں اردو کے اور بھی رسائل نکلے اور بے شک ان رسالوں نے ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی۔ ان رسالوں میں اردوئے معلی، الناظر اور ادیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر یہ سب رسائل اپنی عارضی چمک دکھا کر بند ہو گئے۔ چونکہ ان میں حادثات کے تھپیڑوں کی تاب لانے کی طاقت نہ تھی۔ ان رسائل میں صرف زمانہ ہی ایسا تھا جس نے ہر مشکل کا جرأت اور بہادری سے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ اخبار اور رسائل کے ساتھ ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ ہمیشہ دولت مند ہاتھوں یا کسی سیاسی تحریک ہی کے سہارے زندہ رہتے ہیں مگر نگم صاحب نے تو کسی سیاسی جماعت کی مصلحت آمیزی سے متاثر ہوئے اور نہ رسالے کی مالی پریشانی سے گھبرا کر کسی دولت مند کے در کی جبہ سائی کی۔ انھوں نے صرف اپنی محنت، لگن اور ایثار سے "زمانہ" کو صرف ایک ادبی رسالہ بنائے رکھا اس کے لیے انھیں بہت سی قربانیاں دینی پڑیں۔ میر، مومن، غالب اور بیشمار شاعروں اور ادیبوں کو خود داریاں مشہور ہیں۔ ان لوگوں میں بہتوں کو معاشی بحران کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان لوگوں کو سوسائٹی میں جو عزت و آبرو حاصل ہوئی وہ صرف اپنی ادبی اور شاعرانہ عظمت کی وجہ سے ہی نہیں بلکہ بادشاہ، نواب اور امرائے وقت نے سرپرستی بھی کی۔ محض زبان و ادب کی خدمت کی وجہ سے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کسی کو تلخیٔ حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا مگر نگم صاحب کی پوزیشن بالکل برعکس تھی۔ اردو والوں نے آزمائش کے وقت ان کی مدد نہ کی۔ دوسری طرف خود ان کے لوگوں نے ان کے راستے میں بے پناہ رکاوٹیں پیدا کیں۔ انھیں گالیاں دی گئیں، دھمکیاں دی گئیں۔ مگر نگم صاحب نے تنہا ڈٹ کر سب کا مقابلہ کیا۔

نگم صاحب کے کام کرنے کا بھی انداز دوسروں سے الگ تھا۔ وہ ایک اڈیٹر کی حیثیت سے اپنے رسالہ میں صرف مضامین کی ترتیب نہ دیتے بلکہ ان کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے بہت سے ایسے شاعروں، ادیبوں، اور دانشوروں کو پیدا کیا اور عوام کے سامنے پیش کیا جو ایک امتیازی شان کے مالک بننے والے تھے۔ جو اپنے منفرد اسلوب، اسٹائل اور ہمہ گیری کی وجہ سے بعد میں صرف زبان و ادب ہی کے نہیں بلکہ ملک کے لیے باعثِ فخر ثابت ہوئے۔ پریم چند کو شہرت کی بلندی پر نگم صاحب ہی نے پہنچایا۔ سرور جہاں آبادی اور چکبست کی سحر اور قومی شاعری نگم صاحب ہی کی فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔ یہ تو مثال کے لیے صرف چند نام ہیں اور بھی کتنے شاعر اور ادیب ہیں جن کی شاعری، ادب اور صحافت کو نگم صاحب نے سنوارا، سجایا اور چمکایا۔

نگم صاحب اور "زمانہ" لازم اور ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ زمانہ اگرچہ ایک ادبی پرچہ تھا مگر نگم صاحب اپنے قارئین کے اندر سیاسی شعور بھی بیدار کرتے تھے۔ اس کے لیے وہ آخر میں "رفتار زمانہ" کے عنوان سے سیاستِ عالم کو بھی پیش کرتے۔ واقعات اور حالات پر تبصرہ کرتے۔ حکومت کے طرزِ عمل پر آزادانہ اپنی رائے پیش کرتے۔ یہ زمانہ برطانوی اقتدار کا تھا جہاں بہت سی دشواریاں تھیں۔ مگر نگم صاحب اپنے خیالات کے اظہار میں بڑی جرأت مندی کا ثبوت دیتے۔

نگم صاحب کانپور میں رہتے تھے اور کانپور اس زمانہ میں ہندو مسلم فساد کا مرکز تھا۔ ہندو مسلمانوں کے درمیان ان تلخیوں کے اثرات کانپور تک محدود نہ تھے بلکہ دور دور تک پھیل گئے تھے۔ مگر نگم صاحب بڑے حوصلے اور جرأت مندی کے ساتھ اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ اور وہ ایک سیکولر انسان تھے اور اس کے علمبردار بھی۔ وہ ہندو مسلم مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ خاص کر وہ مسلمانوں کیلیے ایسا ہمدردانہ رویہ اختیار کرتے جس کی مثال اس زمانہ میں کسی ہندو یا مسلمان کے یہاں مشکل سے ملتی ہے۔

کتابوں اور رسالوں پر تنقید علمی جرائد کا لازمی جزو ہے۔ نگم صاحب کے رسالہ "زمانہ" میں تمام علمی، سیاسی اور ادبی کتابوں پر تبصرہ ہوتا تھا۔ رسالہ کے پرانے فائلوں کو دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ کتابوں پر تبصرہ اور تنقید کس گہری نگاہ سے کیا جاتا تھا اور کس طرح کی ادبی موشگافیاں کی جاتی تھیں۔

نگم صاحب صرف ایک اچھے صحافی اور ادیب ہی نہ تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اپنا مضمون نگاروں اور قلمی معاونین کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ وقت پڑنے پر مالی تعاون بھی کرتے تھے۔ یہ ان کی بلند اخلاقی ہی تھی کہ "زمانہ" سے بہتر اور بلند پایہ مضمون نگار کسی رسالہ کو اس زمانہ میں حاصل نہ تھے۔

میں نے عرض کیا ہے کہ نگم صاحب صرف ایک بلند پایہ صحافی ہی نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ خود اچھے مضمون لکھتے دوسروں سے لکھاتے۔ ان کی شخصیت کے رنگارنگ پہلو ان کے خطوط سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں ایسی چاشنی، رنگینی اور بے ساختہ پن ہے جس کی مثال غالب کے خطوط میں ملتی ہے۔ پڑھیے اور قدم قدم پر مچلتے جائیے۔ ضرورت ہے کہ ان کے تمام مضامین کو جو رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔

رسالہ "زمانہ" ان کی زندگی کا حاصل تھا جس کے لیے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی "زمانہ" کا اپنا پریس تھا۔ "زمانہ" کے علاوہ نگم صاحب نے ایک ہفت روزہ "آزاد" بھی نکالا تھا جو ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا اور تقسیم ہند کے بعد تک جاری رہا۔ اس کے اجرا کی تحریک مسجد کانپور کی شہادت سے ہوئی۔ نگم صاحب کو مسلمانوں کے حقوق کا خاص خیال تھا جس کے لیے وہ ہمیشہ بے باکی سے اظہار کرتے۔ وہ گاندھی جی کے بڑے معتقد اور کانگریس کی تحریک کے حامی تھے اس لیے "زمانہ" میں "رفتار زمانہ" کے عنوان سے جو سیاست عالم پر تبصرہ ہوتا اس میں نیشنلزم، ہندوستانی زبان، سوراج، مہاتما گاندھی اور ہندوستانی تمدن وغیرہ کے مسائل پر اکثر مضامین شائع ہوتے تھے۔

نگم صاحب محفل میں جان محفل بن جاتے۔ دوستوں کے ساتھ گفتگو میں طنز بڑا شیریں مگر چوٹیلا ہوتا تھا۔ الفاظ نرم ہوتے تھے مگر ان میں تلوار کی کاٹ ہوتی تھی۔ یہ سب باتیں ان کے مضامین میں اور خطوط میں بھی ملتی ہیں۔ نگم صاحب کا ایک مضمون ہندوستانی زبان کے مسئلے پر "زمانہ" کے "قومی نمبر" ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون اپنی افادیت کے لحاظ سے آج بھی ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس میں نگم صاحب نے پریس، رسم الخط، اصطلاحات، اسلوب اور نظام تعلیم کے تمام پہلوؤں پر گہری بصیرت کا اظہار کیا ہے۔

نگم صاحب کی ذات بڑی ہمہ گیر تھی۔ وہ کرائسٹ چرچ کالج کانپور میں اردو کے استاد رہے، آنریری مجسٹریٹ ہوئے، میونسپل بورڈ کے لیے منتخب ہوئے۔ نگم صاحب کے والد جو کچہری میں اہلکار تھے وہ اپنے لڑکے کو وکیل بنانا چاہتے تھے مگر نگم صاحب نے وکالت کے پیشے کو کبھی اچھا نہ سمجھا اور اردو دنیا کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی ذات اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادب کا یہ درخشندہ ستارہ ۱۹۴۲ء میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ ان کے لائق فرزند سری نگم نے زمانہ کا "یادگار نمبر" ۱۹۴۳ء میں نکالا جو نگم صاحب کی یاد میں نذرانہ عقیدت ہے۔[1]

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

۱۔ آل انڈیا ریڈیو پٹنہ کے شکریہ کے ساتھ۔

خراج عقیدت

(جناب گوپال متل صاحب ایڈیٹر تحریک)

یہ امر موجب مسرت ہے کہ ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں منشی دیا نرائن نگم کا جشن صد سالہ منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر ایک یادگار نمبر بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

یوں تو منشی دیا نرائن نگم اور ان کے رسالے "زمانہ" کا پوری اردو دنیا پر احسان ہے لیکن میں نگم صاحب کا خصوصی طور پر ممنون ہوں کیونکہ "زمانہ" پہلا ادبی جریدہ تھا جس تک میری رسائی ہوئی۔ ہر چند کہ مخزن اس سے پہلے نکل رہا تھا لیکن میری رسائی مخزن تک بعد میں ہوئی اور سر عبد القادر سے تو بعد میں مجھے ذاتی ملاقاتوں کا بھی شرف حاصل ہوا جن کا میرے ادبی ذوق کی نشو و نما میں بڑا دخل ہے۔

"زمانہ" میں اس دور کے سبھی ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شائع ہوتی تھیں جن میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، چکبست اور فانی کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ "زمانہ" یوں تو ایک ادبی جریدہ تھا لیکن اس میں دیگر موضوعات پر بھی بہت اچھی چیزیں شائع ہوتی تھیں۔

سماجی اصلاحات کے نگم صاحب خاص طور پر حامی تھے۔ انھوں نے بیواؤں کی شادی کی حمایت بھی کی اور صغر سنی کی شادی اور جہیز کی مخالفت بھی۔ سیاسی معاملات میں بھی نگم صاحب دلچسپی لیتے رہے۔ ۱۹۲۵ء میں جب کان پور میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا تو اس موقع پر انھوں نے "زمانہ" کا خصوصی نمبر شائع کیا تھا۔ ادبی جرنلزم اور اردو زبان کی ترقی میں نگم صاحب نے جو حصہ لیا ہے اس کا سبھی کو اعتراف کرنا پڑے گا اور یہ اعتراف ہوا بھی ہے۔ جن ممتاز شخصیتوں نے ان کی خدمات کو سراہا ان میں مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور اور سر تیج بہادر سپرو کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

فرقہ واریت کے خلاف انھوں نے زبردست قلمی جہاد کیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب کان پور میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے تو انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ ان کے خلاف آواز بلند کریں بلکہ اپنے گھر کے دروازے مقامی مسلمانوں پر کھول دیے۔

منشی دیا نرائن نگم ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں انھوں نے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ کچھ ہی دن پہلے بریلی سے "زمانہ" جاری ہوا تھا جس کی ادارت کا بار انھوں نے نومبر ۱۹۰۳ء سے اٹھایا اور بریلی سے دفتر کانپور میں منتقل ہو کر آیا۔ "زمانہ" کے علاوہ انھوں نے اپنے سماجی اور سیاسی خیالات کے وسیع تر فروغ کے لیے ایک ہفت روزہ "آزاد" بھی جاری کیا۔ "زمانہ" کی ادارت کے علاوہ منشی جی کانپور کے کرائسٹ چرچ کالج میں اردو ادب بھی پڑھاتے تھے اور میونسپل بورڈ کے ممبر بھی رہے اور آنریری مجسٹریٹ بھی۔

ان کی شخصیت ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ ان کی یاد کو ہم ہمیشہ اپنے سینوں میں جگہ دیں۔ امید رکھنی چاہیے کہ ان کا جشن صد سالہ بڑے شان و شوکت سے منایا جائے گا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیا نرائن نگم کی خطوط نگاری

جناب محمد ایوب واقف صاحب

ایک سماجی انسان کو اپنی زندگی میں بہت سے لوگوں سے واسطہ رکھنا پڑتا ہے اور اس طرح کا واسطہ رکھنے کے لیے دراصل وہ مجبور بھی ہے، ایک طرف اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور دیگر اعزا و اقارب و احباب ہیں تو دوسری طرف وہ نا آشنا سماجی افراد بھی جن سے اپنی بعض ضرورتوں کے پیش نظر وہ ربط و ضبط رکھتا ہے۔ ان دونوں طرح کے لوگوں سے اس کے معاملات بہر حال ہوتے ہیں، اور ان سے کسی بھی صورت وہ اغماض نہیں برت سکتا۔ اب یہ ضروری نہیں کہ ان آشنا و نا آشنا افراد میں سب کے سب اس سے قریب ہی رہتے ہوں۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو ضرورتاً اپنے اطراف کے لوگوں کے حلقہ سے نکل کر دور دراز کے کسی مقام پر رہائش اختیار کرنی پڑتی ہے یا پھر اپنی ضرورت کے پیش نظر دور کے کسی نا آشنا شخص سے بھی ربط و ضبط اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اب اگر کسی انسان کو اس طرح کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے اور اسے لکھنے پڑھنے کا ہنر بھی آتا ہے تو پھر اپنی تحریروں کے ذریعہ اسے ہم کلامی و ہم نشینی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے اپنی ان تحریروں میں وہ ضرورت کے مطابق اپنے مخاطب سے پوری بات عرض کرتا ہے ایسی تحریروں کو ہی دراصل ہم رقعات یا خطوط کا نام دیتے ہیں۔ خطوط نگاری اب باقاعدہ ایک صنف قرار پا چکی ہے لیکن ابھی تک مشاہیر و اکابر کے خطوط کو ہی جمع کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

خطوط کا کوئی بندھا لگا اصول نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کے لیے کوئی بنا بنایا سانچہ و ڈھانچہ ہوتا ہے خط لکھنے والا اپنی مرضی و منشا کے مطابق اپنے مخاطب سے ہمکلام ہوتا ہے۔ کبھی تو وہ نرم، ملائم، سنجیدہ، متین اور متوازن اندازِ تحریر سے کام لیتا ہے اور کبھی تند خوئی، چرب زبانی اور غم و غصہ کا انداز اختیار کرنے والے جملوں سے اپنے خطوط کی دوکان سجاتا ہے غرضیکہ خطوط میں لکھنے والے کی طبیعت کے انشراح و انقباض دونوں پہلوؤں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ مکتوب نگار کبھی تو القاب و آداب کے ساتھ اپنی بات شروع کرتا ہے اور کبھی کبھی براہ راست مدعا بیان کرتا ہے لیکن ان تمام طرح کی تحریروں کو ہم خطوط کے زمرے میں ہی شامل کرتے ہیں۔

اردو زبان سے الگ اگر دوسری زبانوں کی خطوط نویسی پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تاریخ بہت پرانی ہے۔ انگریزی، عربی اور فارسی وغیرہ زبانوں کی تحریر ونگارش کے سرمائے میں خاصی تعداد ایسے خطوط کی ہے جو سیکڑوں سال قبل لکھے گئے ہیں۔ ہمارے بزرگانِ ذہین، اکابر علم وحکمت اور علمبردارانِ فکرودانش کے رقعات وخطوط سیکڑوں سال کے نشیب وفراز اور مروڑ زمانہ کے باوجود گنج گراں مایہ کی صورت اب بھی موجود ہیں اور اب تو ان خطوط ورقعات کو اس طرح محفوظ کر لیا گیا ہے کہ ان کے تلف ہونے کے امکانات کم سے کم ہو گئے ہیں۔ جہاں تک اردو خطوط نویسی کا تعلق ہے اس کی تاریخ کچھ بہت پرانی نہیں ہے یا کچھ بہت زیادہ تحقیق طلب نہیں ہے۔ اس لیے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال تک اردو زبان کے ادیب وشاعر بھی عام روش کے مطابق فارسی زبان میں خطوط لکھنے کے عادی تھے۔ کیونکہ فارسی اس وقت کی مروجہ زبان تھی۔ عدالتوں سے لے کر پرائیویٹ نشستوں تک اسی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا جاتا تھا۔ خود مرزا اسداللہ خاں غالب جن کی سراپا ادب ذات سے خطوط نویسی کی باقاعدہ تاریخ وابستہ ہے اور اسکا بھرم بھی قائم ودائم ہے۔ اپنی عمر کے آخری دو دہوں سے قبل تک فارسی ہی میں خطوط لکھتے تھے۔ غالب کے بارے میں اردو زبان وادب کے ناقدین ومحققین اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ انھوں نے ۱۸۵۰ء کے بعد ہی اردو زبان میں خطوط لکھنے کی ابتدا کی۔ غالب نے فارسی سے ہٹ کر اردو زبان میں خطوط لکھنے کی جو رسم ڈالی تو اس کے بھی کچھ خاص اسباب تھے۔ مولانا الطاف حسین اپنی یادگار اور مشہور زمانہ تصنیف "یادگارِ غالب" میں رقم طراز ہیں کہ

> "معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکورہ میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمات پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن "مہرنیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہو گئے اس وقت بضرورت ان کو اردو میں خط وکتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط میں جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب وہ "مہرنیمروز" کی ترتیب اور انشا میں مصروف تھے ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط وکتابت کرنی اور وہ بھی طرز خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے"

مولانا حالی کے علاوہ حامد حسن قادری، شیخ محمد اکرام، رام بابو سکسینہ اور مولانا غلام رسول مہر وغیرہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مرزا نے ۱۸۵۰ء کے آس پاس ہی اردو میں خط وکتابت شروع کی۔ اردو خطوط ہی کے سلسلے میں ایک بات اور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ابتدا میں اس پر فارسی کے اثرات غالب رہا کرتے تھے۔ وہی طول طویل لمبے لمبے القاب وہی تصنع اور بناوٹ کا انداز لیے ہوئے آداب

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہی تکلفات اور حشو زائد جو فارسی خطوط میں مروج تھے اردو خطوط کے رنگ و ڈھنگ ٹھہرے لیکن اردو خطوط نویسی میں فارسی خطوط کے ان اثرات کا عمل دخل زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اردو شاعروں اور ادیبوں کے خطوط میں سادہ و سلیس اور عام فہم زبان رواج پاتی گئی القاب و آداب میں سادگی بڑھتی گئی اور ہمارے عہد تک آتے آتے مقفع و مسجع عبارت کے سارے نقوش ایک ایک کرکے مٹ گئے اور اب تو خطوط میں عہد گزشتہ کا وہ انداز تخاطب اور تحریر کا وہ بھاری پن خطوط نگاری کا عیب سمجھا جانے لگا ہے۔

منشی دیا نرائن نگم کے خطوط سہل، شیریں اور حد درجہ سادگی اور صفائی کے طرز کی نمائندگی کرتے ہیں ان کے یہاں نہ افکار و خیالات کی صلابت ہے اور نہ تحریر میں الجھاؤ۔ ۱۹۰۳ء میں "زمانہ" کی ادارت انھوں نے اپنے ذمہ لی تو باقاعدہ طور پر خطوط لکھنے کی ابتدا کی۔ اور ان کی خطوط کا یہ سلسلہ ان کی عمر کے اخیر دنوں تک جاری رہا۔ "زمانہ" کے ابتدائی شماروں کو ہی دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ شروع سے ہی اس ماہنامہ میں وقت کے سر برآوردہ ادیبوں اور شاعروں نے لکھنا شروع کردیا تھا "زمانہ" کی بزم تحریر میں مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، مولانا حسرت موہانی، سر عبدالقادر، مولانا الطاف حسین حالی، اکبر الہ آبادی، برج نرائن چکبست اور منشی پریم چند جیسے منفرد فکرو فن کے ادیب شاعر اور دانشور شامل تھے۔ ان سب کے ساتھ منشی دیا نرائن نگم کے خصوصی تعلقات تھے۔ سب سے ان کی خط و کتابت تھی۔ منشی جی نے "زمانہ" کی ادارت تقریباً چالیس سال تک کی۔ اتنی طویل مدت میں انھوں نے یقیناً ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ان کے خطوط جمع کرنے کی کوئی باقاعدہ کوشش کی جائے تو ان کے خطوط ابھی بھی کافی تعداد میں دستیاب ہوسکتے ہیں۔ تین سال کی مدت گزری جب مجھے اس کا احساس ہوا میں نے اپنے دو چار بزرگوں کو جو فن تحقیق و تنقید میں درک رکھتے تھے لکھا اور ان کی توجہ کو اس طرف مبذول کرایا مگر نتیجہ خاطر خواہ نہ نکلا۔ آخر میں نے ہی یہ کام اپنے ذمہ لیا جن جن حضرات کے یہاں ان کے خطوط مل سکتے تھے خطوط لکھے۔ میرے خطوط پر کچھ حضرات نے اس طرف توجہ دی اور انھوں نے جس قدر خطوط انھیں مل سکے روانہ کردیے۔ بعضوں نے تو سبز باغ دکھایا ایفائے وعدہ کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ بہرحال اس تگ و دو کے بعد میرے پاس منشی دیا نرائن نگم کے سو سے زائد خطوط جمع ہو گئے۔ میں ان خطوط کو اردو ادب کے لیے بیش قیمت سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ان خطوط سے ایک ایسے انسان کی پہلو دار شخصیت جھانکتی ہے جس نے اردو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ تہذیب تمدن، مذہب، موسیقی، مصوری، معاشیات، لسانیات، سنگتراشی، نفسیات، سیاسیات، اخلاقیات، روحانیات، طنزیات اور اس طرح کے زندگی کے دیگر گوشوں اور شعبوں پر بے پناہ مواد فراہم کیا اور ان تمام اشیائے گراں مایہ کو زمانہ کی جھولی میں اس قرینہ اور سلیقے سے بکھیر دیا کہ ماہنامہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"زمانہ" برصغیر کے چالیس سال کی ادبی، سیاسی اور جمالیاتی تاریخ کی مکمل اور بھرپور دستاویز بن گیا اور یہ سب کچھ فرد واحد کی محنت شاقہ کا کرشمہ تھا۔

منشی دیا نرائن نگم کے ان خطوط کو جو میرے پاس محفوظ ہیں اگر میں خانوں میں تقسیم کروں تو ان کی تقسیم اس طرح ہوگی۔ ادبی خطوط، کاروباری خطوط اور ذاتی خطوط۔ ان تینوں طرح کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے منشی دیا نرائن نگم کے ذہن وفکر، طرز اسلوب اور عادات واطوار وغیرہ کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

اردو خطوط نویسی کی تاریخ میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مرزا اسداللہ خاں غالب اور مہدی افادی کے خطوط کی بڑی ہلچل ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط میں ان کی طرفہ عالمانہ نشان وطمطراق، غالب کے خطوط میں ان کی طبیعت کا انوکھاپن اور فکر وخیال کی شستگی وبرجستگی اور مہدی افادی کے خطوط میں ان کے قلم کی رنگینی اور الفاظ کی لالہ کاری وسحرطرازی ہے۔ اگر آپ منشی دیا نرائن نگم کے خطوط میں مذکورہ بالا تینوں شخصیتوں میں سے کسی ایک کے یہاں کے بھی اوصاف وکمالات تلاش کریں گے تو میں کہوں گا کہ آپ کو بڑی مایوسی وبے اطمینانی ہوگی۔ منشی جی بڑے سادہ لوح بندۂ خدا تھے جتنے سادہ وہ اپنے روزانہ کے معمولات میں تھے اتنے ہی سادہ وہ اپنی تحریروں میں بھی تھے۔ اب یہ تحریریں چاہے ان کے مکتوبات پر مشتمل ہوں یا ان کے مقالات پر۔ وہ ادیبوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن کے یہاں تحریر کی سادگی اپنی تمام تر پرکاری کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ مولانا عبدالحق اور پریم چند کا طرز نگارش منشی دیا نرائن نگم کے طرز نگارش سے میل کھاتا ہے۔ اگر میں سادہ، سلیس اور عام فہم نگارشات اور عربی وفارسی کی ادق تراکیب اور مشکل الفاظ کے تانے بانے پر مشتمل تحریروں کے الگ الگ خانے بناؤں تو ان دو الگ الگ خانوں میں منشی دیا نرائن نگم قسم اول کے خانہ میں جگہ پائیں گے۔ جہاں تک ان کی خطوط نویسی کا تعلق ہے یہاں بھی وہ تحریر کی بے پناہ سادگی اور برجستگی کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

منشی دیا نرائن نگم کے خطوط کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کے خطوط کی زبان میں کہیں بھی پیچیدگی، ابہام، ناہمواری اور نامطبوع اور گنجلک طرز تحریر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ جس سے پڑھنے والے کا ذہن خواہ مخواہ کے لیے الجھے۔ انھوں نے اپنے خطوط میں ان گنت معاملات ومسائل پر روشنی ڈالی ہے انھوں نے اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں کو بھی خطوط لکھے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جن سے ان کی برائے نام رسم وراہ تھی یا پھر ان لوگوں کو جن سے ان کا کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ان کے تمام خطوط ان کی مستقل مزاجی، ان کی اعلیٰ سوجھ بوجھ، ان کے مناسب انداز فکر اور خوشگوار توجیہہ واستدلال کا ہی عکس و پرتو ہیں۔ بسا اوقات وہ بعض غیر ذمہ دار اور کج اندیش لوگوں کے ناروا طرزِ عمل وطرزِ سلوک سے منقبض اور بددل ہو جاتے تھے لیکن ایسی صورت میں بھی پارائے ضبط ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا تھا۔ وہ دوسروں کے دلوں کا میلاپن دیکھ کر بھی دوسروں کے لیے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

حسنِ ظن اور نیک گمان ہی پایے رکھتے تھے۔ ان کے طرزِ استدلال میں بڑی معقولیت، موزونیت، سنجیدگی اور وقار پوشیدہ ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی اپنی کسرِ نفسی، مودّت اور خوش خلقی و خوش طبعی سے اپنے مکتوب علیہ کو اپنا اس قدر گرویدہ بنا لیتے تھے کہ اس کے دل میں بس وہی وہ رہتے تھے۔ اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ چھپتا ہوا طنز بھی کرتے تھے، چٹکی لیتے تھے لیکن ان کے اس نوع کے خطوط سے بھی لوگ سرگرانی و ناراضگی محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے طنزیہ فقروں کا اثر یہ ہوتا تھا کہ لوگ انھیں ٹوٹ کر چاہنے لگتے تھے۔ مثال کے طور پر حضرت ثاقب کانپوری کے نام ان کے خط کی عبارت ملاحظہ فرمائیں، خط کی عبارت پر نظر ڈالنے سے قبل آپ خط کا پس منظر جان لیں تو ان کے طنزیہ فقروں کی چبھن کا زیادہ احساس ہوگا۔ ثاقب کانپوری ایک بڑے بزرگ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ خود بھی بڑے پرہیزگار اور صوفی منش ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ان کے یہاں تشریف لائے۔ ذاکر صاحب کی آمد کے موقع پر ثاقب صاحب نے کچھ اور احباب کو مدعو کیا اس موقع پر نہ جانے کیوں ثاقب صاحب نے منشی دیا نرائن نگم کو دعوت نہیں دی۔ انھیں اس کی اطلاع ہوئی۔ ایسے مواقع پر نہ وہ چپ بیٹھتے تھے اور نہ ہی معاف کرتے تھے۔ قلم اٹھایا اور حضرت ثاقب کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یہاں جو چیز دیکھنے اور سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اگرچہ یہاں طنز کا نشتر بہت تیز ہے لیکن اس کا اثر بڑا دلفریب۔ اب آپ خط کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

عزیزی ثاقب صاحب!

آپ سید زادے ہیں اور میں آپ کا حلقہ بگوش۔ آپ کا نہیں آپ کے بزرگوں کا۔ کاشی کے ساتھ کعبہ بھی میرا ہے۔ میں اب لکھوں تو کیا لکھوں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین آئے اور آپ نے مجھے ہی نہ بلایا۔ اچھا شکایت پھر کروں گا پہلے نظیری کا ایک شعر سنا دوں ع

دیدہ ام دفترِ ہیچاں وفا صرف بہ صرف
نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

آپ خانقاہ میں رہتے ہیں اور خانقاہوں کے دروازے کبھی فقیروں پر بند نہیں ہوتے۔ شاید اب رسم و رہ خانقاہی بدل گئی ہو اگر ایسا ہو تو مجھے اطلاع دیں۔ ممنون ہوں گا۔

دعاگو

دیا نرائن نگم۔

آپ نے مندرجہ بالا خط کی عبارت ملاحظہ فرمائی اور خط میں اعلیٰ طنز کی جو کیفیت ہے اس کا بھی اندازہ کیا۔ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ انھوں نے جہاں کہیں بھی طنز کا کوئی داؤ پیچ استعمال کیا ہے وہاں کسی طرح کا عناد، کرختگی اور بے کھلاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کا ثبوت ان کا مندرجہ بالا خط اور

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اس طرح کے دوسرے خطوط ہیں۔ ان کے طنزیہ جملوں میں محبت اور خلوص کی ایک پیاری و نیاری قسم کی خوشبو ہے جو نظر افروز بھی ہے اور طرب اندوز بھی۔ در اصل وہ اس طرح کی اپنی تحریروں میں بڑی احتیاط و انضباط سے کام لیتے تھے ورنہ طنز نگاری تو ایسی چیز ہے کہ اگر سلیقہ نہ ہو تو اس سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔

منشی دیا نرائن نگم نے "زمانہ" کے ذریعہ بہت سے نوخیز ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی پرورش کر کے انھیں شہرت و مقبولیت بخشی۔ بے شمار شعری دواوین اور نثری تصانیف پر تبصرے اور مضامین شائع کیے۔ کسی دوست یا شناسا ادیب و شاعر کو کوئی کتاب پیسوں کی قلت کی بنا پر چھپنے سے رہ جاتی تو اسے چھاپنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتے۔ غرضیکہ جس طرح بھی ممکن ہوتا وہ دوستوں اور ساتھیوں کی امداد اور دستگیری سے پہلو تہی نہ کرتے۔ کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے کو مصیبتوں اور دشواریوں میں ڈال لیتے تھے۔ ایسا وہ محض اس لیے کرتے تھے کہ وہ دوسروں کے کام آجائیں۔ اپنے اس عمل سے انھیں یک گونہ سکون اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ مگر اس کے باوجود کبھی کبھی بعض لوگوں کا رویہ ان کے ساتھ مخلصانہ نہیں ہوتا تھا کچھ ناقص خیال اور خود غرضانہ ذہن کے لوگ انھیں جلی کٹی سنانے میں ہی اپنی شان سمجھتے تھے۔ برقؔ صاحب[1] کا دیوان شائع کیا گیا تو زمانہ بک ایجنسی کو بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی نے یہ لکھا کہ اس کی کچھ جلدیں وہ نقد قیمت پر خرید لے۔ زمانہ بک ایجنسی کے منیجر ٹھاکر چندر بھوشن سنگھ نے نقد قیمت ادا کرنے سے گریز کیا۔ اس پر منورؔ لکھنوئی نے منشی دیا نرائن نگم کو لکھا کہ

"........ اگر برقؔ صاحب کے کلام کے سکوں میں اتنی قیمت نہیں ہو سکتی تو غالباً اسے ملک کی انتہائی بد مذاقی اور اردو مصنفوں اور شاعروں کی بدقسمتی پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔"

منورؔ لکھنوی کے خط کا لہجہ سخت تھا۔ اس کا اثر منشی دیا نرائن نگم کے دل و دماغ پر کچھ اچھا نہیں ہوا اور ہوتا بھی کیسے۔ وہ کوئی فرشتہ تو تھے نہیں۔ دنیاوی انسان تھے اور دنیاوی انسان کی حیثیت سے وہ بھی محسوسات رکھتے تھے۔ چنانچہ منورؔ لکھنوی کی جلی کٹی باتوں کا جواب دینے کے لیے وہ کمربستہ ہوئے۔ انھوں نے ایک طویل خط لکھا۔ اپنے خط میں انھوں نے اپنے اضطراب اور رنجیدہ خاطری کا اظہار کیا لیکن یہاں بھی وہ شرافت اور اخلاق مندی کے دائرہ سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ ایسا غالباً اس لیے تھا کہ ان کے مزاج میں ایک ٹھہراؤ تھا جو انھیں اذیت ناک لمحوں میں بھی متوازن رکھتا تھا۔ اب ذرا اس طویل خط کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی کے خط کے جواب کی شکل میں لکھا تھا اور اس کی روشنی میں منشی جی کی معاملہ فہم طبیعت اور ان کی دور اندیشی کا اندازہ لگائیے۔

---

[1] جوالا پرشاد برقؔ۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وہ لکھتے ہیں کہ

"میں نہیں جانتا کہ میرے کون سے الفاظ سے حوصلہ شکنی کا اظہار ہوا اور قصور کی نوعیت اور اہمیت معلوم کیے بغیر خوامخواہ عذر خواہی میرا شیوہ نہیں ہے۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ بعض احباب موقع بے موقع موردِ الزام بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ حال ہی میں قادری[1] صاحب کی تازہ تصنیف 'داستان اردو' کے متعلق ان کے پبلشر نے نقد قیمت پر کتابیں خرید کر بک ایجنسی میں رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر میرے منیجر صاحب اس تجویز کو منظور نہ کر سکے۔ قادری صاحب کو اس سے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ بالکل تجارتی معاملہ تھا۔ اگر میرے کارکنوں کو روپیہ کمانے کا حوصلہ اور خاص کوشش کرنے کی لیاقت ہوتی تو وہ دس بیس روپے لگا دیتے۔ بصورتِ موجودہ جب بک ایجنسی کا کام معطل پڑا ہوا ہے کوئی رقم اٹھا دینا کہاں کا دستور اور کہاں کی عقلمندی ہے۔ شاید آپ بھول گئے کہ چالیس سال سے 'زمانہ' کی مسلسل اشاعت قائم رکھنے میں مجھ کو کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کیا میں نے اب تک کسی اہل قلم دوست سے اس کے لیے مالی امداد طلب کی۔ البتہ قلمی امداد کے لیے میں نے اپنے سب احباب قدیم وجدید مرحوم وموجود سب کا ہمیشہ کے لیے زیر بار احسان ہوں۔"

دیکھا آپ نے منشی دیا نرائن کی جمعیتِ خاطر کا کرشمہ، بددلی اور بدمزگی کے موقع پر بھی ان کے انداز فکر اور ان کے احساسات میں کتنی تنظیم اور کتنا توازن ہے۔ دراصل ان کے یہاں ایک پختہ اور محکم قسم کا سماجی خلوص تھا جو ان کے ذہن وفکر کو ہمیشہ پیکرِ حسن ولذت میں ڈھالتا رہتا تھا۔

ہم پہلے یہ بتا چکے ہیں کہ ماہنامہ 'زمانہ' ۱۹۰۳ء میں کانپور سے نکلنا شروع ہوا۔ ۱۹۳۶ء تک پہنچتے پہنچتے یہ برصغیر کا انتہائی اہم اور موقر جریدہ بن گیا اور اس کے مدیر منشی دیا نرائن نگم ایک قدآور اور اعلا درجہ کے مدیر کی حیثیت سے قابلِ لحاظ اور قابلِ عزت سمجھے جانے لگے۔ مگر اس کے باوجود منشی دیا نرائن نگم کے دل میں کبھی احساسِ برتری، غرور اور خود پسندی کا جذبہ جگہ نہ پا سکا۔ تاحیات ان کی علمی انکساری وبردباری قائم رہی۔ وہ اپنے ہمعصروں کی قدر ومنزلت میں پوری طرح سرگرم رہے وہ اپنے سے بہت کمتر درجہ کے لوگوں کے ساتھ بھی انتہائی شریفانہ سلوک کرتے تھے۔ وہ آج کل کے مدیروں کی طرح نہیں تھے۔ جب کوئی ادیب یا شاعر ان کی فرمائش پر کوئی تخلیق انھیں روانہ کرتا تھا تو وہ انتہائی مخلصانہ ڈھنگ سے اس کے ممنون ہوتے تھے۔ اسے فوراً شکریہ کا خط لکھتے تھے اور اگر کبھی کسی باعث خط لکھنے میں تاخیر ہوجاتی تو ندامت کا اظہار کرتے۔ یہاں ایک خط کا اقتباس

---

[1] مولانا حامد حسن قادری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ہم پیش کرتے ہیں۔ یہ خط مولانا احسن مارہروی کے نام ہے۔ مولانا نے ’زمانہ‘ کے لیے اپنی تازہ تخلیق روانہ کی تھی منشی جی حالات کی ناخوشگواری کے سبب جواب فوراً نہ لکھ سکے۔ اب جب انھوں نے بعد کو خط لکھا تو خط میں اپنی ندامت و شرمساری کا اظہار بھی کیا اور معذرت بھی پیش کی۔ خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے

جناب مخدوم و محترم بندہ،

تسلیمات عرض ہے

آپ نے باوجود علالتِ طبع کے ۲۹ر جولائی کے عریضہ کا جواب باصواب ۹ر اگست کو عنایت فرمایا۔ مگر میری بے بسی دیکھیے کہ معمولی صحت قائم ہونے کے باوجود آج پندرہ سولہ دن کے بعد جواب لکھنے کی توفیق ہوئی۔ حالانکہ بلا مبالغہ اور تصنع عرض کرتا ہوں کہ قریب قریب روزانہ عریضہ لکھنے کا خیال آتا رہا۔

آپ نے اس علالت کے باوجود ”زمانہ“ کے لیے غیر مطبوعہ غزل بھیج کر جو احسان کیا ہے اس کا شکریہ میرے امکان سے باہر ہے۔ یوں تو پوری غزل مرصع ہے مگر غزل سے بھی زیادہ قابلِ قدر یہ خیال ہے کہ آپ نے میرے تقاضا کا خشک جواب دینا گوارا نہ فرمایا۔ یہ مروت اور یہ وضع داری آج کل کی نئی پود سے مفقود ہوتی جارہی ہے۔ خداوند کریم عرصۂ دراز تک آپ کا سایہ برقرار رکھے ......۔“

مکتوب علیہ کی جس مروت اور وضع داری پر منشی دیا نرائن نگم دل و جان سے فریفتہ نظر آتے ہیں دراصل اسی مروت و وضع داری کو انھوں نے اپنی زندگی کا شیوہ بنایا تھا انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کی مسرتوں سے ہمیشہ اپنے دل کو تر و تازہ رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمارے سماج کے بیشتر لوگ انھیں ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ منشی دیا نرائن نگم نے اپنے پیچھے دولت کا انبار تو نہیں لگایا لیکن شرافت اور محبت کی جو گراں بہا دولت وہ چھوڑ گئے ہیں وہ ہر آنے والی نسل کے لیے بیش قیمت سرمایہ ہے۔

منشی دیا نرائن نگم کے خطوط سے اور بھی کچھ اقتباسات پیش کر کے ان کی زندگی کے دیگر پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کو جی چاہتا ہے لیکن مضمون کی طوالت کا خوف قلم کو روکتا ہے۔ آئندہ پھر کبھی ان کے مکاتیب پر اظہارِ خیال کی صورت پیدا ہوئی تو یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔ مگر اس مقالے میں ہم نے خطوط کے جتنے بھی اقتباسات پیش کیے ہیں ان کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ ان کے خطوط ان کے حالاتِ زندگی کی پوری شرح کرتے ہیں۔ انھوں نے جتنے بھی خطوط لکھے ہیں قلم برداشتہ لکھے ہیں اس لیے ان میں صداقت اور برجستگی کے جوہر تمامتر شد و مد کے ساتھ موجود ہیں۔ منشی دیا نرائن نگم کے خطوط رنگ رنگ کے تاثرات سے آراستہ و پیراستہ ہیں اور ان رنگ رنگ کے تاثرات کو موثر

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اور معتبر بنانے کے لیے انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ روزمرہ کی زبان ہے اس میں شیرینی ہے شگفتگی ہے روانی اور سادگی ہے۔ انھوں نے عربی اور فارسی کے بھی بہت سے الفاظ اپنے خطوط میں استعمال کیے ہیں لیکن ان الفاظ کو ان کے قلم نے اس ہوشیاری سے استعمال کیا ہے کہ وہ بھدے نہیں بلکہ ہار کے موتی کی طرح لگتے ہیں کہ انھیں نکال دیا جائے تو خط کا حسن جاتا رہے۔ مکتوب نگار کو اگر الفاظ کے برمحل استعمال پر دسترس ہو تو مکتوب نگاری کا کمال اس کے بس میں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ منشی دیانرائن نگم کے یہاں یہ شعور موجود ہے۔ ان کے خطوط کو پڑھنے والا ایک اور بات سے بھی لطف اندوز ہوگا کہ ان کا انداز تخاطب حد درجہ خوبصورت، پاکیزہ اور پر اثر ہے۔

ہم یہ پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ خطوط نویسی اب ایک مستقل صنف قرار پا چکی ہے۔ اس صنف کے ذخیرے میں بہت سے منفرد ادیبوں اور شاعروں کے خطوط جمع ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ منشی دیانرائن نگم کے خطوط، خطوط کے اس سرمائے میں بیش بہا اضافہ کا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط کی علمی و ادبی حیثیت تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ یہ ایک عہد کی سیاسی، ادبی، تہذیبی اور سماجی حالات کی بھرپور نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم منشی دیانرائن نگم کے خطوط کا پورا مطالعہ کریں۔

ستارے کی خودکشی

ایک ستارہ آغوش فلک سے تڑپ کر سمندر کے نیلگوں پانی میں کود پڑا۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عالم دیوانگی میں ہے لاتعداد ستاروں نے خوف و اضطراب کی نظروں سے دیکھا کہ کس طرح آسمان کی ایک روشن قندیل جو ان کے ساتھ مدت مدید سے جگمگا رہی تھی، چند لمحات کے اندر تاریکی میں غائب ہوگئی۔

میں گہرے سمندر میں اترا۔ اس کی تہہ میں متعدد ستارے بکھرے ہوئے تھے، جن کی روشنی ہمیشہ کے لیے فنا ہو چکی تھی۔ آخر اس گم شدہ ستارے پر کیا مصیبت نازل ہوئی؟ اس سوال کا جواب صرف میں جانتا تھا صرف مجھی کو معلوم تھا کہ جس زمانہ میں جبکہ یہ گم شدہ ستارہ آسمان کی آغوش میں جلوہ طراز تھا کون سی چیز اس کو دعوت مرگ دے رہی تھی۔ یہ خندۂ پیہم کا عذاب تھا کوئلے کا ایک ٹکڑا اپنی سیاہی کو چھپانے کے لیے ہنستا ہے۔ جس قدر یہ ہنستا ہے اسی قدر جلتا ہے۔ اسی طرح یہ ستارہ بھی ہنسا اور روشن ہوگیا۔ جب جلنے کی مصیبت زیادہ برداشت نہ کر سکا تو روشنی کی ہلاکت سے ٹھنڈے سیاہ پانی میں کود پڑا۔

ہزاروں لاکھوں چمکدار ستاروں نے اس گرے ہوئے ستارے کو دیکھا اور مایوسی کا قہقہہ لگا کر زبان حال سے کہا کہ۔

"اس ستارے کی موت سے ہمارا کچھ نقصان نہیں، آسمان اسی طرح ابدالآباد تک جگمگاتا رہے گا"

'زمانہ'، جنوری سنہ ۱۹۴۰ء۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رسالہ زمانہ

(ڈاکٹر شفیع احمد عثمانی)

رسالہ ’زمانہ‘ کا پہلا پرچہ فروری ۱۹۰۳ء[1] میں منشی شیو برت لال صاحب ورمن کی ادارت میں قیصری پریس بریلی سے شایع ہوا تھا لیکن عبدالرزاق صاحب قریشی نے اپنے ایک مضمون میں اس کے اجرا کے بارے میں سہواً لکھا ہے کہ رسالہ ’زمانہ‘ ۱۹۰۱ء سے نکلنا شروع ہوا[2]۔ ابتدائی نو مہینے (یعنی فروری سے اکتوبر ۱۹۰۳ء تک یہ رسالہ ’زمانہ‘ منشی شیو برت لال صاحب ورمن کی غور و پرداخت میں پرورش پاتا رہا۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۰۳ء سے اس کی زندگی کی کفالت منشی دیا نرائن صاحب نگم کی تفویض میں آئی۔ منشی جی نے چالیس سال تک بڑی جانکاہی سے اس کی پرورش کی اور اس چھوٹے سے پودے کو اس قدر تناور بنا دیا کہ اردو صحافت میں نہ معلوم کتنے اقتصادی بحران آئے مگر اس کی جڑوں کو جنبش نہ ہوئی۔

۱۹۰۳ء میں جب رسالہ ’زمانہ‘ نے جنم لیا اس وقت اردو کی حالت کچھ متزلزل سی تھی۔ وہ زبان جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول کا نتیجہ تھی، محض اس لیے معتوب ہو رہی تھی کہ اس کے حروف فارسی حروف ہیں یا مسلمان اس سے زیادہ رغبت رکھتے ہیں۔ ایسے دور میں رسالہ ’زمانہ‘ کا قائم رہنا ایک معجزہ سے کم نہیں۔

’زمانہ‘ ابتدا سے جس معیار ادب کا حامی تھا، اسے آخر تک برقرار رکھا۔ اس کے صفحات ابتدا ہی سے ایک صالح ادبی کوشش، اور پر خلوص علمی سعی و عمل کے لیے مخصوص رہے۔ اس نے اس دور کے جدید خیالات کی ترجمانی کر کے زندگی کے اعلیٰ معیار پیش کئے۔ اس کی تحریریں ہمیشہ سنجیدہ اور متین رہی ہیں اور ان کا لہجہ ایسا رہا ہے جو ان لوگوں کو بھی ناگوار نہ ہو جو لکھنے والوں کے ہم خیال نہ ہوں۔ اس نے ہمیشہ اردو لٹریچر کی اشاعت سے ہندو مسلم اتحاد کا عملی ثبوت دیا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو محض مسلمانوں ہی کی زبان نہیں بلکہ ہندو قوم بھی اس کو اپنے ملک کی زبان کی طرح عزیز رکھتی ہے۔ ہندوستان کے اردو رسالوں میں ایسا کوئی بھی رسالہ نظر نہیں آتا جس کے ہر نمبر میں مشترکہ طور پر ہندو مسلمان مضمون نگاروں نے سالہا سال لگاتار مضمون لکھے ہوں۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ گورنمنٹ کی پالیسی کو عوام پر اعلان کرے اور عوام الناس کی آواز کو سرکار تک پہونچائے۔

’زمانہ‘ کے صفحات میں اردو زبان کی بیسویں صدی کے نصف اول کی مکمل تاریخ ملتی ہے۔ اس نصف صدی میں اردو زبان نے جتنی ترقی کی ہے، اس کے صفحات اس کی پوری کہانی کے حامل ہیں۔ ادب کا کوئی سنجیدہ شعبہ ایسا

---

[1] ’زمانہ‘ فروری ۱۹۲۸ء (جوبلی نمبر): ۵۰ ع ۲ ص ۱۹۸ (بحوالہ دیا نرائن نگم)

[2] رسالہ ’آجکل‘ (اردو) دسمبر ۱۹۵۹ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نہ ہوگا جس پر نہایت پُر مغز مضامین نہ موجود ہوں۔ ادب، شعر، تاریخ، مذہب، تہذیب و تمدن، مصوری و موسیقی، سنگ تراشی، معاشیات، طبیعیات، لسانیات، نفسیات، طنزیات، فلسفہ، اخلاقیات اور روحانیت وغیرہ تمام موضوعات پر بڑے بڑے عالموں اور ماہروں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر ایک ایک موضوع پر یہ تمام مضامین یکجا کئے جائیں تو اردو میں متعدد علوم و فنون پر بہترین تصانیف کا اضافہ ہو جائے۔

رسالہ 'زمانہ' نے ۴۶ سال تک اردو ادب کی خدمت کی۔ اس مدت میں اس کی ۹۲ جلدیں شائع ہوئیں جس میں مجموعی طور پر ۳۲۲۳ مضامین مختلف موضوعات پر شائع ہوئے ہیں۔ مضامین کی تفصیل بقید عنوانات ذیل ہے:۔

ادبیات ۷۰۰، تاریخ اور سفرنامے ۶۴۳، سوانح عمریاں ۹۳۸، سماجی علوم ۴۴، لسانیات ۱۴۲، مذہبیات ۱۵۴، فلسفہ ۱۱۸، سائنس ۹۴، اطلاقی سائنس ۷۹، فنون اور تفریحات ۴۸، عمومیات (عام مضامین) ۸۲ — کل میزان:۔ ۳۲۲۳

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں سب سے زیادہ مضامین سوانح حیات پر شائع ہوئے ہیں۔ اس کے ۹۳۸ مضامین میں ۶۵۱ سوانح عمریاں صرف ادیبوں اور شاعروں کی ہیں۔ یہ تعداد اتنی کثیر ہے کہ اگر ان کی تدوین کرکے علیحدہ کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے تو ایک نایاب تذکرہ تیار ہو سکتا ہے۔ سوانح حیات کے بعد دوسرا نمبر ادبیات کا ہے۔ اس کے ۷۰۰ مضامین میں ۹۴ مضامین اردو شاعری پر ہیں جن کی تدوین سے اردو شاعری کے قدیم و جدید رجحانات پر سیر حاصل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ لسانیات کے تحت جو مضامین اردو ہندی تضیہ پر شائع ہوئے ہیں وہ بہت ہی بصیرت افروز ہیں۔ اردو ہندی قضیہ اس وقت بھی کم نہیں ہوا ہے بلکہ اس میں پہلے سے کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ ان مضامین کی تدوین اس پیچیدہ مسئلہ کے حل میں معاون ثابت ہو سکتی ہے

مضامین نثر کے علاوہ اس میں مجموعی طور پر ۳۹۹۶ قصاید، غزلیات، نظمیں، مراثی، رباعیات، قطعات سہرے اور گیت بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کے تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ یہ تعداد مضامین نثر سے بھی زیادہ ہے۔ ان کی ترتیب سے مختلف رنگا رنگ گلدستے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ یہ غزلیں اور نظمیں اس دور کے چوٹی کے شعرا کی ہیں۔

مضامین نگار — کسی رسالہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کو قلمی معاونین کس طرح کے ملے۔ رسالہ 'زمانہ' کو اس بات پر ناز ہے کہ اس دور کا کوئی اہل قلم ایسا نہیں گزرا جس نے 'زمانہ' کی قلمی معاونت سے دریغ کیا ہو۔ اس میں ۸۰۰ مضمون نگاروں نے اس کی قلمی معاونت کی یہ مضمون نگاروں کی اتنی کثیر تعداد شاید ہی کسی دوسرے رسالہ کو نصیب ہوئی ہو۔ اس میں مختلف اقوام و مذہب کے مشہور اہل قلم شامل ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے ہیں جنھوں نے 'زمانہ' کا سہارا لے کر لکھنا سیکھا اور آگے چل کر شہرت و مقبولیت حاصل کی اور آج دنیائے ادب میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے۔ جعفر علیخاں اثر لکھتے ہیں:۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"پچھلے ۲۵ سال کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی اگر فہرست مرتب کی جائے تو یقیناً ۷۵ فی صدی ایسے نکلیں گے جن کو 'زمانہ' نے چمکایا" [1]

اس کے مضمون نگاروں اور انشا پردازوں کی تعداد بہت کثیر ہے اور اس مختصر مضمون میں ان کے تخلیقات کا جائزہ لینا ناممکن ہے۔ اس لیے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف چند مشاہیر ادب کے اسمائے گرامی دیے جا رہے ہیں تاکہ رسالہ 'زمانہ' کی افادیت کا اندازہ ہو سکے مثلاً۔ بابو گنگا پرشاد ورما، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، برج نرائن چکبست منشی نوبت رائے نظر لکھنوی، لالہ بال مکند گپتا، جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی، منشی پریم چند، اقبال ورما سحر ہتگامی، محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی، تصدق حسین، حق پرست، شیام موہن لال جگر بریلوی، سلیم جعفر، محمد یحییٰ تنہا سید محمد حفیظ، جے آر رائے، سوامی رام تیرتھ، جعفر علی خاں اثر لکھنوی، منظور الحق کلیم اعظم گڑھی، اقبال بہادر سکسینہ مرزا سلطان احمد، شیو نرائن شمیم، ضیاء الدین احمد برنی، حسرت موہانی، عبدالحق، عبدالماجد دریابادی، شیخ عبدالقادر، محمد ہادی عزیز لکھنوی، محمد عزیز مرزا، فراق گورکھپوری، حامد حسین قادری، کشن پرشاد کول، لاجپت رائے بالک رام، آنند نرائن ملا، مہیش پرشاد، علی حیدر نظم طباطبائی، نیاز فتح پوری، پری پورنا نند، برج نرائن دتاتریہ کیفی اور پروفیسر محمد حبیب (علیگ) جیسے عظیم المرتبت ادیبوں نے اپنے مضامین سے اس رسالہ کی وقعت کو بڑھایا۔

منشی دیا نرائن نگم نے خود 'زمانہ' کے لیے اتنے مضامین لکھے جو شاید آج تک کسی مضمون نگار نے نہ لکھے ہوں گے۔ ان کے مضامین کی تعداد ۳۶۲ ہے۔ ان کے مضامین زیادہ تر 'رفتار زمانہ' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں، جس میں اس دور کے سماجی، معاشی، سیاسی اور تاریخی حالات پر تبصرہ ہوتا تھا۔ آپ نے ایک دوسرا سلسلہ 'یاد رفتگاں' کے عنوان سے بھی شروع کیا تھا جس میں وہ کسی مشاہیر ادب یا شاعر کے حالات قلمبند کرتے تھے۔

شعراء — یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ رسالہ 'زمانہ' کے قلمی معاونین میں مضمون نگاروں اور شعراء کی تعداد کم و بیش برابر ہے۔ قریب ۸۷۴ شعراء نے اپنی فکر بلند سے اس رسالہ کے اوراق کو گل و گلزار بنایا ہے۔ اس میں اس دور کے چوٹی کے تمام شعراء بلا امتیاز مذہب و ملت شامل ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا ذکر مضمون نگاروں کے ذیل میں اوپر آ چکا ہے۔ مضمون کی کم وسعتی کی وجہ سے یہاں پر بھی صرف چند ان شعراء کے اسمائے گرامی دیے جا رہے ہیں جو آسمان شاعری کے درخشندہ آفتاب اور درخشندہ مہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً حالی، شبلی، اقبال، اکبر الہ آبادی چکبست، شاد عظیم آبادی، اثر لکھنوی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، سرور جہاں آبادی، نوبت رائے نظر لکھنوی بشن نرائن ابر لکھنوی، نادر کاکوروی، احسان دانش، آرزو لکھنوی، جگن ناتھ آزاد، اصغر گونڈوی، افسر میرٹھی برق دہلوی، بیتاب بریلوی، ثاقب کانپوری، جگر بریلوی، حسرت موہانی، راز چاندپوری، جگت موہن لال رواں، روش صدیقی، ریاض خیرآبادی، اقبال ورما سحر ہتگامی، شرر سہارنپوری، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، فراق گورکھپوری تلوک چند محروم، محشر لکھنوی، سنت پرشاد مدہوش، آنند نرائن ملا، منور لکھنوی، سورج نرائن مہر دہلوی، رام پرشاد ناشاد نشتر واحدی اور علی حیدر نظم طباطبائی وغیرہ۔

[1] 'زمانہ' جوبلی نمبر، فروری ۱۹۲۸ء، جلد ۵۰، عدد ۲، صفحہ ۱۲۶

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زمانہ — منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں

(جناب غافل انصاری صاحب سنسارپوری)

اب سے سو برس پہلے اردو آسمانِ صحافت پر ایک درخشندہ ستارہ طلوع ہوا جسے زمانہ نے منشی دیا نرائن نگم کے نام سے پہچانا۔ نگم صاحب آنجہانی نے اپنی عمر کا دو تہائی حصہ اردو صحافت کی نذر کر دیا۔ اوائل کا ایک تہائی ان کے علوم سے بہرہ مند ہونے کا زمانہ رہا تھا۔ گویا اس طرح وہ ساری زندگی بحرِ علم سے دُرِ بے بہا چنتے رہے۔ کوئی بھی صحافی پہلے ادیب ہوتا ہے صحافی بعد میں۔ اسلئے کہ ادب کے رموز و نکات سے نا آشنا ہونے کی صورت میں کوئی صحافی صحت مند صحافت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا صحافی کا دائرہ کار اور ذمہ داریاں بھی مصنف سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہیں مصنف کسی خاص صنف سے دلچسپی رکھ سکتا ہے اور چاہے وہ اپنی متعینہ روش سے چاول بھر بھی اِدھر اُدھر نہ ہو لیکن صحافی کسی تنگ اور محدود دائرے میں رہ کر صحافت کے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے مختلف اصنافِ سخن، مختلف مضامین نثری و شعری، مختلف رجحانات در دایات قدیم و جدید سے معلومات رکھنا ازبس کہ ضروری ہوتا ہے۔ اس فیصلے کے وقت کہ کس تخلیق کو شاملِ اشاعت کرے کس کو مسترد کر دے، کون سی تخلیق تھوڑی سی ترمیم و اضافہ کے بعد مفید اور کار آمد بنائی جا سکتی ہے، قاری کے ذوقِ سلیم و ذوقِ طبع کا پورا پورا خیال رکھنا صحافی کا فرض ہے۔ اگر کوئی صحافی ان اور ان جیسی دوسری ضروری خوبیوں سے متصف نہیں ہے تو وہ اپنے انتخاب میں مضحکہ انگیز حد تک سہو کر سکتا ہے۔

زمانہ کے اوراق شاہد ہیں کہ منشی دیا نرائن نگم ان تمام خوبیوں کے مالک تھے جو ایک صحافی کے لیے لازمی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تقریباً چالیس برس تک بلا ناغہ ایک معیاری جریدہ کا اجرا برقرار رکھا۔ ادبی ذوقِ سلیم رکھنے والے قاریوں کی تعداد سماج میں یوں بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر ہر قاری اپنا ایک الگ ذوق رکھتا ہے اور رسالہ میں وہ اپنے ذوق کا سامان تلاش کرتا ہے۔ منشی دیا نرائن نگم نے جب اس میدان خارزار میں قدم رکھا تھا اس وقت تک ذرائع ترسیل و صحافت کے اصول و ضوابط بھی متعین نہ ہو سکے تھے لیکن ان کے فطری میلانِ طبیعت نے انھیں اس میں کامیابی سے ہمکنار کیا۔ زمانہ نگم صاحب کی علمی و ادبی استعداد ہی کا مظہر نہیں بلکہ زمانہ نے اپنے دور کے صحافتی کردار کو چار چاند لگائے۔ اگر یہ کہا جائے کہ آج تک غیر سرکاری جریدے زمانہ کے معیار و میزان کے شائع نہیں ہو سکے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ سطور ذیل میں زمانہ کا مختصر تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔ زمانہ کی خوبیوں کا تعارف کرانا بالواسطہ منشی دیا نرائن نگم کی خوبیوں کا اعتراف ہے۔

ماہنامہ زمانہ کا اجرا فروری ۱۹۰۳ء منشی راج بہادر صاحب کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ پہلے یہ پرچہ بریلی سے نکلا لیکن دو ہی برس بعد منتقل ہو کر کانپور سے نکلنے لگا۔ نومبر ۱۹۰۳ء سے زمانہ منشی دیا نرائن نگم کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا جس کو نگم صاحب نے تا دمِ حیات قائم رکھا۔ زمانہ کا عام شمارہ اوسطاً ۷۲ سے ۸۰ صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور صفحہ نمبر جلد میں سلسلہ وار چلا کرتے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

تھے۔ ایک جلد میں چند شمارے ہوتے تھے۔" زمانہ" کا کاغذ گلیز، کتابت عمدہ، طباعت نفیس اور ہر ورق حاشیہ سے مزین رہتا تھا۔ اوائل میں زمانہ عام کتابی سائز میں چھپتا تھا لیکن بعد میں سائز میں اضافہ کردیا گیا۔ زمانہ میں ادبی صفحات کے بعد آٹھ سے بارہ تک رف کاغذ پر اشتہارات شائع ہوتے تھے۔ زمانہ کے مشترکہ شمارے بہت کم شائع ہوئے کیونکہ زیادہ تر زمانہ پابندی وقت سے اشاعت پذیر ہوتا ہے۔ جن مہینوں میں مشترکہ شمارے شائع ہوئے ان میں حجم کو تقریباً دوگنا کردیا گیا تاکہ ناظرین کی طبع علمی کو آسودگی میسر ہوسکے۔ دراصل نگم صاحب زمانہ کو مالی منفعت کی غرض سے شائع نہیں کررہے تھے بلکہ ان کا مطمع نظر علم وادب کی ترویج وترقی تھا۔ وہ برسہا برس، مالی خسارہ اٹھاتے رہے لیکن انھوں نے رسالہ کو بند کرنا پسند نہ کیا۔

زمانہ کے مضامین نظم ونثر دونوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ زمانہ کے قلمی معاونین ہر مذہب، ملت، طبقہ اور جداگانہ خیالات کے حاملین ہوتے تھے اسی لیے زمانہ کے مضامین کے موضوعات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ مذہبی، معاشرتی، اصلاحی، سیاسی، ادبی، معلوماتی گویا کہ ہر رنگ کے موضوعات پر مشتمل مضامین زمانہ کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔ زمانہ کے زیادہ تر صفحات ادبی وتنقیدی مضامین سے مملو رہتے تھے تاہم رفتار زمانہ کے عنوان سے جو اداریہ قلمبند کیا جاتا تھا اس میں ممالک غیر ومعاملات ہند پر تبصرہ شائع ہوتا رہا ہے۔ رہنمایان قوم وملت اور مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کے سوانحی خاکے زمانہ کی جان ہوتے تھے۔ حالی، مومن، غالب، سوامی رام تیرتھ، مدھوسودن دت، محمد حسین آزاد، بابر، کونٹ ٹالسٹائی، سرور جہان آبادی اور نیپولین کے کارناموں پر مشتمل سوانحی خاکے خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو نظم ونثر کی شکل میں زمانہ کی زینت بنے ہیں۔

زمانہ کے زیادہ تر قلمی معاونین اپنے زمانہ کے مشہور اہل قلم تھے۔ ان میں سے اکثر نے اپنی علمی صلاحیت کو ناقابل تسخیر ثابت کیا۔ تاریخ ادب اردو میں جن کے نام سنہرے حرفوں میں لکھے گئے اور ایسے بھی تھے جن کو زمانہ کی بدولت شہرت دوام حاصل ہوئی۔ زمانہ کے علاوہ نگم صاحب نے اردو ادب کو جو بیش قیمت شے عطا کی وہ دھنپت رائے کا قلمی نام پریم چند ہے۔ یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ پریم چند سرکھیے کتنے ہی ادیب وشاعر زمانہ ہی کی بدولت شہرت کی بلندیوں کو چھوسکے سرور جہان آبادی، منشی پریم چند، سید علی سجاد عظیم آبادی، محمد حسین آزاد، منشی نوبت رائے نظر، منشی پیارے لال شاکر میرٹھی، منشی تلوک چند محروم، ضامن کنتوری، منشی جگیشور ناتھ ورما بیتاب، مسٹر حامد اللہ افسر میرٹھی، علی عباس حسینی وسیم خیرآبادی، جعفر علی خاں اثر، حامد حسن قادری، پیارے صاحب رشید لکھنوی، سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی، پنڈت برج نرائن چکبست، لالہ لاجپت رائے، پنڈت منوہر لال زتشی، پنڈت کشن پرشاد کول، پروفیسر سری رام، عبدالقادر سروری مقبول حسین وصل بلگرامی، سدرشن، مسٹر سری نرائن نگم، خواجہ حسن نظامی، ریاض خیرآبادی، صفی لکھنوی، منشی سورج نرائن مہر دہلوی، محشر لکھنوی، حسرت موہانی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا عبدالحلیم شرر، منشی ذکاءاللہ، مولوی نذیر احمد، لالہ نہال چند، وقارالملک، طالب بنارسی، جگت موہن لال رواں، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، منشی مہاراج بہادر برق، اصغر گونڈوی، پنڈت آنند نرائن ملا، منشی شیام موہن لال جگر بریلوی، ابوالاثر حفیظ جالندھری، پروفیسر فراق گورکھپوری

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

وغیرہ وغیرہ کتنے ہی مایہ ناز ادیب وشاعر دامن زمانہ سے وابستہ رہے۔ آج اردو ادب کو جن پر فخر ہے۔
زمانہ کا تصاویر کا حصہ بھی اپنی جگہ پر خوب تھا۔ ہر ماہ کسی نہ کسی مشاہیر ادب، فدائے ملت، رہنمائے قوم یا سیاسی لیڈر کی تصویر زمانہ میں شامل رہتی تھی۔ امیر افغانستان، مولانا حالی، سوامی رام تیرتھ، رنجیت سنگھ، ڈاکٹر ایم۔ اے۔ انصاری، مسیح الملک حکیم اجمل خاں، سر رابندر ناتھ ٹیگور، لارڈ بشپ کلکتہ، بشپ آف لکھنؤ، لالہ لاجپت رائے، مسٹر چنتامنی، مہاراجہ گیکواڑ، گنیش واسدیو جوشی وغیرہ کتنے ہی اکابرین ملت کی تصاویر زمانہ کے توسط سے ہدیہ ناظرین ہوئیں۔ جوبلی نمبر میں چھپن تصاویر شامل کی گئیں جن میں بیشتر وابستگان زمانہ اور زمانہ کے قلمی معاونین کی تصویریں ہیں جو آج اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔
زمانہ کی تصویروں میں صرف رہنمائے قوم یا شعراء و ادباء ہی کے لیے جگہ مخصوص نہ تھی بلکہ زمانہ کی نثری یا شعری تخلیق کی مناسبت سے بھی تصویریں شامل اشاعت کی جاتی تھیں۔ نثری یا شعری تخلیق کے پیکر تصویروں میں ڈھال کر پیش کیے جاتے تھے۔ شکنتلا، نامہ شوق، شراب و ساغر، ہولی، خواب ادشا، موسم سرما، بسنت رت، لیلیٰ مجنوں، گنجینہ، رموکش، عروس نو، اکبر اور شکار چیتا، فلسفہ خیام، تصویر متعلق قصہ منتر وغیرہ وغیرہ تخیلاتی تصاویر سے زمانہ کے صفحات مزین رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بیشتر تصاویر تاریخی اہمیت کی حامل ہیں جن میں الہ آباد نمائش کی تصاویر، گورو کل کے طلبا، یگیہ شالہ، صدر دروازہ اور گرد کل کی دوسری بہت سی تصاویر زمانہ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ ویلکم کلب، انگروت کے مندر کی نایاب تصاویر بھی زمانہ میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زمانہ کشیدہ کاری، دستکاری کے نمونے لیڈیز کورٹ، طبقہ ڈاک خانہ و تار گھر، طبقہ زراعت، طبقہ جواہرات، زمانہ دستکاریوں کی عمارت کی تصویریں ٹکینی کلر اور بلیک اینڈ وہائٹ میں زمانہ میں شائع ہوئیں۔ زمانہ کا تصاویری حصہ نہایت دیدہ زیب اور نظروں کو خیرہ کرنے والا ہے۔
زمانہ کے کاتبین بھی اپنے دور کے مشہور اہل فن میں شمار کیے جاتے تھے جن پر فن کتابت کو ناز تھا۔ کاظم حسین سلطان خاں، سجاد، منے خاں، تصدق حسین میرٹھی، رمضان خاں، منشی گوردو بخش، منشی شام بخش وغیرہ ایک طرف فن کتابت کے روشن تارے تھے اور دوسری طرف دامن زمانہ سے وابستہ تھے۔
مختصر یہ کہ مختلف علوم وفنون کے ماہرین، مصور، ادیب و شاعر، ناقد، لیڈر، رہنمایان قوم، مصلحین، مبلغین، مدیران اخبار و رسائل، مختلف نظریات اور مکتب فکر کے نمائندگان زمانہ کی محفل میں شامل رہے ہیں۔ ملک کے ان علمائے ادب اور ماہرین علم وفن کو زمانہ کے پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا سہرا منشی دیا نرائن نگم کے سر ہے جن کی مساعی جمیلہ نے اردو کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ قومی یک جہتی کا بے مثال نمونہ پیش کیا۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیانرائن نگم : اب ایسے انسان کہاں

جناب سید اختر الاسلام صاحب ایڈیٹر میرٹھ میلہ

ٹھیکے دار جگدیش سرن اگروال سے میری ملاقات بی سی لائنز میں ایس کے چٹرجی صاحب نے کرائی۔ چٹرجی صاحب میرے مخلص دوست اور اخبار میرٹھ میلہ کے سرپرستوں میں سے ایک ہیں۔ وہ اگروال صاحب کے کرایہ دار ہیں۔

اگروال صاحب نے بتایا کہ وہ پہلے کانپور میں رہتے تھے۔ اس لفظ سے فوراً میرا ذہن منشی دیا نرائن نگم صاحب کی طرف مڑ گیا۔ ان کے صاحبزادے برج نرائن نگم صاحب اپنے والد کا صد سالہ جشن منانے کی اسکیم بنا رہے تھے۔ منشی جی ماہنامہ زمانہ کے مدیر تھے اور زمانہ کی پرانی فائلیں اس مبارک موقع کے لیے ضروری تھیں جن کی حصولی کے لیے بی این نگم صاحب نے مختلف اخباروں میں اپنا مقصد بیان کیا تھا۔

میں نے اگروال صاحب سے کہا "آپ کانپور میں رہتے تھے۔ آپ کے پاس زمانہ کی کچھ فائلیں تو ہوں گی ہی"۔

"کانپور میں رہنے کے دوران ہم منشی جی کے ہی کرایہ دار تھے۔ وہ صرف زمانہ ہی کے اڈیٹر نہیں تھے بلکہ ایک اردو ہفت روزہ 'آزاد' بھی شائع کرتے تھے۔ بہت اردو نواز انسان اور بلند پایہ صحافی تھے۔ ان دنوں میری عمر ۱۸ برس تھی وہ مجھے اپنے لڑکوں کی طرح سمجھتے تھے۔ برج نرائن کے بڑے بھائی بشن نرائن نگم ان دنوں مجھ سے ایک دو کلاس آگے تھے بعد میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور آئی سی ایس کر لیا۔ سروس میں آئے تو ڈسٹرکٹ جج بنا دیے گئے۔ میرٹھ میں قریب دو سال رہے۔ ڈسپلن کے سخت پابند تھے۔ کیا مجال کہ کوئی وکیل بغیر کالا کوٹ اور بو پہنے اجلاس میں آجائے اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو وہ بات ہی نہ سنتے تھے۔ پھر وہ الہ آباد چلے گئے۔ شاید رجسٹرار ہو کر"۔ اگروال صاحب نے ذہن پر زور دے کر دھیرے دھیرے بتایا۔

"اور منشی جی؟" میں نے انکیس کر دیا۔

اگروال صاحب کی آنکھوں میں تیز چمک آگئی۔ فرط عقیدت سے انھوں نے کہنا شروع کیا "وہ بہت شریف النفس نیک سیرت، مہمان نواز، غریبوں کے ہمدرد تھے۔ تعصب اور تنگ نظری ان کو چھو کر ہی نہیں گئی تھی جب میرے پتا جی لالہ بشمبھر سہائے اگروال صاحب کا دیہانت ہوا تو منشی جی نے بہت اصرار کیا کہ میں میرٹھ نہ جاؤں وہیں رہوں لیکن وطن کی محبت نے مجھے ایسا وارفتہ کر دیا کہ میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر کانپور میں ہی رہتا تو ترقی کے راستے دگنے چوگنے ہوتے"۔

"منشی جی سے متعلق کوئی خاص واقعہ بتائیے" میں نے اگروال صاحب سے کہا "تاکہ آپ کی طرف سے منشی جی کو میں خراج عقیدت پیش کر سکوں"۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

"ایک بات اور تو بتاؤں بھی۔" وہ بولے "عوام تو عوام انگریز سرکار بھی ان کی عزت کرتی تھی۔ انھیں رائے صاحب کا خطاب دیا گیا تھا۔ وہ آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے تھے۔ بہت انصاف پرور انسان تھے۔ کبھی کسی کو بیجا سزا نہ دی غلطی کرنے والے کو اخلاقی طور پر سمجھا بجھا دیتے تھے اور اس طرح بڑے بڑے جھگڑے امن و سکون سے طے کر دیتے تھے۔"

اگروال صاحب ذرا رک کر پھر کہنے لگے "۱۹۳۱ء میں شہید بھگت سنگھ کی لاش جیل سے غائب کر دینے پر عوام انگریزوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ انگریز نے یہ صورت حال دیکھی تو اس جھگڑے کو فرقہ وارانہ نوعیت دے دی۔ تین دن اور تین رات تک پورا کانپور بغیر پولیس انتظام کے رہا۔ منشی جی نے اس دوران فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بہت عمدہ نمونہ پیش کیا۔ ان کی شرن میں قریب ڈھائی سو ہندو مسلمان آ گئے جن کی نہ صرف انھوں نے حفاظت کی بلکہ اپنے خرچ پر ان کی خوراک کا انتظام کیا۔ وہ دن رات لوگوں کو سمجھاتے بجھاتے رہتے۔ راتوں میں ہم نوجوان چھتوں پر چڑھ کر شرپسندوں سے مدافعت کرتے۔ اب ایسے لوگ کہاں ہو سکتے ہیں۔ وہ بہت عظیم انسان تھے۔"

کہتے کہتے اگروال صاحب کی آواز میں کچھ رقت آ گئی تھی۔

رونا کس بات کا؟

تم کیوں افسردہ ہوتے ہو؟ اس لیے کہ تم غریب ہو اور تمھارے پاس روپیہ نہیں ہے۔ مگر کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ گلاب کا پھول کیونکر مسکرا رہا ہے حالانکہ اس کے پاس مال و زر نہیں ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ باغ میں بلبل کیسے چہچہا رہا ہے حالانکہ اس کے پاس ایک کوڑی تک نہیں ہے۔ تم کیوں ڈرتے ہو؟ اس لئے کہ تم دنیا میں بے یار و مددگار ہو۔ مگر کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ گھاس کا سرسبز تنکا صحرا میں تنہا کھڑا ہے لیکن وہ کوئی سرد آہ نہیں بھرتا بلکہ جس مقصد کو پورا کرنے کے لیے پرماتما نے اس کو پیدا کیا ہے وہ اسی کو پورا کر رہا ہے۔ تم اس لیے ڈرتے ہو کہ تمھارا عزیز بیٹا یا تمھاری پیاری بیوی تم سے جدا ہو گئی۔ مگر کیا تم نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ تمھاری زندگی کا بہترین زمانہ وہ تھا جبکہ نہ تم بچہ رکھتے تھے نہ بیوی بلکہ تم ایک بے غم بادشاہ تھے۔ کیا تم نے نہیں پڑھا کہ گوتم بدھ کے جب بچہ پیدا ہوا تو اس نے سرد آہ بھری اور کہا "آج ایک بندھن اور بڑھ گیا" چنانچہ اسی رات اپنی بیوی اور نوزائیدہ بچہ کو چھوڑ کر روشنی کی تلاش میں راج بھون سے جنگل کو چل دیا۔ نوٹ کرو جس چیز کی آمد سے تم خوشی حاصل کرتے ہو اس کے چلے جانے پر تم ضرور صدمہ اٹھاؤ گے۔ اگر تم اپنی ایسی زندگی بنا لو کہ نہ تم کو کسی کی آمد پر خوشی ہو نہ بر آمد پر رنج تو تمھارے آنسو بلکل خشک ہو جائیں گے۔ اپنشد میں لکھا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو سب میں اور سب کو اپنے آپ میں دیکھتا ہے اس کو نہ آنے کی خوشی نہ گئے کا رنج۔ یہ ایک صداقت ہے تم اپنے فرض کو پورا کرو گھاس کے تنکے کی طرح پورا کرو جبکہ ہوا کو صاف کر رہا ہے پھر تم نہیں رو گے بلکہ دوسرے اشخاص تم پر شبنم کی طرح آنسو بہائیں گے جبکہ تم دنیا میں نہیں ہو گے۔ احمق ہے وہ انسان جو دنیا اور دنیا کی چیزوں کے لیے روتا ہے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ جن کے لیے وہ روتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کا ساتھ نہیں دے گی۔

زمانہ۔ اگست ۱۹۱۰ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

منشی دیا نرائن نگم — مجاہد قلم

(جناب رام پرکاش راہی صاحب)

رگوں میں اس کی
رچی ہوئی تھی، بسی ہوئی تھی
وطن کی الفت ....
وطن کی الفت جو بے محابا
وطن کی خدمت کے کارزار وفا طلب کی
اسیم وسعت میں کود پڑنے کی منتظر تھی
غلام، مجبور، موک جنتا کے گاندھی بابا ....
نہتے نیتا کی چھتر چھایا میں
نورِ ہستی کی جگمگاہٹ
شعورِ ہستی کی تلملاہٹ
متاع کاہست اور کیا تھی ....!
قلم اٹھایا
بساطِ قرطاس کو سنبھالا
سموئے اس میں مچلتی سوچوں کے تیز دھارے
جو بہتے بہتے ملائے رکھتے تھے
ایک دوجے سے
پیارے پیارے
وطن کی ندیا کے دو کنارے ....
وہ دو کنارے، سمجھیں برابر، بس ایک پانی ہی پاٹتا تھا
ملا جلا سا، وہ ایک گنگ وجمن کا پانی
جسے تمدن کی نزہتوں نے .... زبانِ اردو کا نام بخشا
شعورِ نثری، شعارِ شعری نے پُر فصاحت .... بیانِ اردو کا نام بخشا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

زبانِ اردو، بیانِ اردو کی وسعتوں میں
ادب، صحافت کا چولی دامن سمان رشتہ
وہ کچا رشتہ، اٹوٹ رشتہ
خلوصِ منشی دیا نرائن نگم کے ہاتھوں میں اک کرامات بن کے لہکا
پرو لیے اس نے اپنے معصوم پیچ وخم میں ....
انیک ہیرے، انیک موتی
کہ جیسے حالی، نذیر، شبلی
سرور، اکبر، شرر، عزیز و رواں کہ حسرت
علامہ اقبال اور چکبست
وہ پریم چند اور عظیم فانی
یہ ہیرے موتی، امول گوہر، تمام مل کر
نگم کی مالا میں جگمگائے
تو اک زمانے نے "اس زمانہ" کے گیت گائے
جسے نگم نے بڑے تردد، بڑے تدبر سے
ملک وملت کی ایکتا کی علامتِ جاوداں بنایا
تسلسلِ خدمتِ وطن کو ادب کی روحِ رواں بنایا
قلم کے حربے کو احتجاجِ عدم تشدد کا پُر اثر ترجماں بنایا
زماں مکاں کے بدلتے تیور بجا ہیں لیکن
جہاں یہ اردو ادب کے گوہر
زماں مکاں کے اٹل تقاضوں سے ماورا ہیں
کوئی زمانہ
عمیق یادوں کے آئینے میں
رچا ہوا پرتوِ "زمانہ"
مٹائے کیوں کر، مٹائے گا کیوں ؟
وفا کی رسمِ کہن جو بنیادِ استواری پہ منحصر ہے
اُسے زمانہ مٹائے کیوں کر
اُسے زمانہ مٹائے گا کیوں ؟

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بابوجی

(جناب ٹھاکر چند رجھوشن سنگھ)

اپنے آقائے نامدار، منشی دیا نرائن نگم صاحب کو ان کے دفتر کے ملازمین فرط محبت سے بابوجی کہا کرتے تھے۔ یوں تو زمانہ سے راقم الحروف کے تعلقات ۱۹۳۳ء سے ہی شروع ہو چکے تھے مگر جولائی ۱۹۳۵ء سے ان پر ایک گہرا رنگ چڑھنا شروع ہوا جو بابوجی کی وفات کے بعد آج بھی قائم ہے۔

مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ بابوجی سے دیانتداری، صاف گوئی اور خودداری کی جو تعلیم مجھے ملی وہ میری سب سے بڑی دولت ہے۔ میرے نام ان کے لکھے ہوئے خطوط سری دیریندر پرشاد سکسینہ کی معرفت رسالہ ہماری زبان میں چھپ چکے ہیں۔ کچھ اہم خطوط جناب محشر بدایونی کے پاس بھیج دئے گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ شائع ہوئے یا ضائع ہو گئے۔

بابوجی کے پاس اساتذہ اردو کے خطوط کا ایک بیش بہا خزانہ الگ الگ فائلوں میں تاریخ وار لگا ہوا موجود تھا۔ ان میں ڈاکٹر نظیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا حالی، اکبر الہ آبادی، سرور جہاں آبادی، نوبت رائے نظر، عزیز، صفی، چکبست، ڈاکٹر اقبال، اصغر، جگر، حسرت موہانی، فانی بدایونی، محروم، رواں، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عبدالحق سر شیخ عبدالقادر، پریم چند اور لالہ لاجپت رائے نیز سوامی رام تیرتھ کے خطوط موجود تھے۔ افسوس کہ یہ علمی دولت بجز خطوط پریم چند اور قومی ترانہ ڈاکٹر اقبال (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) تلف ہو گیا جس کی تلافی ناممکن ہے۔

بابوجی کو ناموں کے انتخاب میں بھی کمال حاصل تھا۔ کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ پریم چند کا نام انھیں کے حسن انتخاب کا گواہ ہے۔ دوسری مثال جو میرے سامنے کی بات ہے وہ حضرت جوش ملیح آبادی کے ادبی رسالہ کی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں حضرت جوش نے اپنے نئے مجوزہ رسالہ کا نام "کاخ بلند" رکھ کر بابوجی کو خط لکھا۔ یہ ثقیل نام جو فردوسی کے شعر...... کاخ بلند ...... کہ از بادو باراں نہ آید گزند کی رعایت سے رکھا گیا تھا۔ بابوجی کو پسند نہیں آیا اور اس کے بعد جوش صاحب نے کلیم نام سے اپنا رسالہ نکالا۔

بابوجی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ادیب یا شاعر رسالہ یا اخبار نکالنے کے جھگڑیں پھنسے۔ رسالہ نکالنا ادیب کے بس کی بات نہیں ہے۔ منشی پریم چند نے اس کا خمیازہ اٹھایا تھا۔ حضرت جوش بھی اپنا بار دوسروں پر ڈال کر الگ ہو گئے خود بابوجی کو بھی عمر بھر اس کا خمیازہ اٹھاتے رہے۔ مالی نقصانات تو اٹھاتے ہی تھے، اعلیٰ درجہ کی علمی صلاحیت کے باوجود وہ بہت کم لکھ سکے کیونکہ اڈیٹری کے فرائض ایک خاص قسم کا لٹریچر پیش کرنے کے علاوہ کسی دوسری طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی کہاں دیتے ہیں۔ انھوں نے ادیب اور شاعر ضرور پیدا کئے ہیں۔ کتنے مبتدیوں کو اعلیٰ درجہ کا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ادیب بنا دیا گرخود کچھ زیادہ نہ لکھ سکے۔ وہ ۱۹۰۳ء کے بی۔اے تھے۔ چاہتے تو اپنے چھوٹے بھائی سری رام سرن نگم مرحوم کی طرح ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ سے شروع کر کے کمشنر کے اعلیٰ عہدہ تک پہونچ سکتے تھے مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کچھ لوگ یہ بھی چاہتے تھے کہ زمانہ دیوناگری حروف میں ہندی زبان میں شائع کیا جائے۔ آئندہ خسارے کی ضمانت لیتے ہوئے دھنی اور کچھ پونجی والے لوگ پچھلا نقصان ادا کرنے کی بات بھی کہتے تھے مگر صفدار بابو جی اس کے لیے کبھی رضامند نہیں ہوئے اور یہ انھوں نے بہت اچھا کیا۔

راقم الحروف بھی اسی قسم کی دولت سے مالامال ہے اور یہ بابو جی کی دین ہے۔ ادیبوں سے ملنا ان کی تصنیفوں کو پڑھنا یہی اس کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ بغرض بابو جی سے جو کچھ اسے ملا وہ اس کو ہر طرح سے مطمئن رکھنے کے لیے کافی ہے۔ یہ خوشی کسی دولت سے کم نہیں کیونکہ اطمینان نہیں تو کچھ نہیں اور اگر اطمینان ہے تو پھر اور کیا چاہیے۔

صد سالہ جشن ولادت کی اس یادگار اشاعت کے موقع پر یہ شعر پڑھتا ہوا میں بابو جی کی خدمت میں سر نیاز خم کرتا ہوں ؎

شعور سجدہ نہیں ہے مجھ کو تو میرے سجدے کی لاج رکھ لے
یہ سر ترے آستاں سے پہلے کسی کے آگے جھکا نہیں ہے

مسافر

اس کا چہرہ گرد آلود تھا
سفر کی کوفت سے اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے تھے۔
اس کا لباس غلیظ اور بوسیدہ تھا
اس نے مجھے جھک کر سلام کیا
میں نے جذبات تفاخر کے ماتحت کہا "کیا چاہتے ہو؟"
"میں مسافر ہوں"
"برسوں سے یونہی راستہ طے کیے جاتا ہوں"
"راہ میں ملنے والے آدمی کو سلام کرنا میری عادت ثانیہ بن چکی ہے"
"مجھے کچھ نہیں چاہیے"
یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا
میں متحیر خاموش کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔
یہ مسافر مجھ سے زیادہ شریف ہے۔

جو اپنی منزل کی طرف بڑھتے جاتا ہے
جو اپنی راہ کی صعوبات اور آفات سے نہیں گھبراتا اور
جو لوگوں کو بے لوث سلام کرتا ہے۔
آہ نمائش اور نمود نے
ہمیں حقیقت سے کس قدر بعید کر دیا ہے۔
ہم سب سفر حیات میں مصروف ہیں
مگر منزل سے غافل، شرافت سے عاری اور انسانیت سے محروم
دور افق مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا
مگر مسافر کا سایہ آگے ہی آگے بڑھتا نظر آتا تھا
خدا جانے وہ اپنی منزل پر پہونچا یا نہیں۔
مگر اس نے میرے غرور کو شکست ضرور دی۔
(زمانہ۔ جولائی سن ۱۹۴۰ء)

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

دادا صاحب

برج نرائن نگم

ہم اپنے والد صاحب کو دادا صاحب کہتے تھے۔ وجہ بہت معمولی، وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے تھے اور وے سب انھیں دَدّا یا دادا کہتے تھے۔ جب میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا اس وقت تک ابتدائی منازل طے ہو چکے تھے اور عمر اردو ادب کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی تھی۔ خاندانی پیشہ وکالت بالائے طاق رکھا جا چکا تھا۔ خسارہ کے ڈر سے جائداد کا بٹوارہ کر کے دادا صاحب کو خاندانی جائداد سے الگ کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بزرگان خاندان کی مرضی ورائے کے خلاف اٹھایا گیا تھا۔ ان سب بادِ مخالف کے باوجود اپنے ارادہ پر مستحکم رہے کتنی زیادہ ہمت تھی۔ کتنا زیادہ مصمم ارادہ۔ کتنا زیادہ ذوق ادب!

ساتھ بھی بے لوث لوگوں کا شروع ہی سے ہوا تھا۔ جناب منشی راج بہادر صاحب دیوان رامپور اسٹیٹ جو 'زمانہ' کے بانی تھے انھوں نے کبھی اپنا نام ظاہر نہیں ہونے دیا حالانکہ ہر طرح کی مالی امداد کرتے رہے تاکہ زمانہ زیست سے محروم نہ ہو جائے! جناب منشی شیو برت لال ورمن صاحب جو اپنی قربانیوں اور خدمات کی وجہ سے مہرشی کے درجہ کو پہنچے اور دیال باغ آگرہ کے بہت ممتاز ہستیوں میں سے ایک ہوئے، اس کے پہلے ایڈیٹر تھے۔ لیکن ذاتی حوادث کی وجہ سے ان کو چھٹی کی سخت ضرورت پڑ گئی۔ نگاہ منتخب نے دادا صاحب کو چنا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۱ سال ہی کی تھی۔ بی۔ اے پاس کر کے قانون کی پڑھائی کر رہے تھے لیکن اس عمر میں بھی اردو ادب میں ستارہ بن کر چمکنے لگے تھے۔ ان کا پہلا مضمون اس وقت کے نامور رسالہ 'مخزن'، لاہور میں ۱۹۰۱ء ہی میں شائع ہو چکا تھا۔ دادا صاحب اور بھی رسائل میں لکھتے تھے جس میں پٹنہ سے جاری ہونے والا 'کایستھ سماچار' بھی تھا۔ چنانچہ جناب سچدانند سنہا صاحب جو پٹنہ سے دہلی جا رہے تھے دادا صاحب سے کانپور اسٹیشن پر ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ کانپور اسٹیشن پر جب ایک نو عمر طالب علم ملاقات کے لیے سامنے آیا تو حیرت میں رہ گئے۔ بے ساختہ کہا 'برخوردار۔ یہ عمر اور یہ زور قلم'، اس کے بعد ہمیشہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کے لیے ایک دوسرے کے گرویدہ ہو گئے اور یہ رشتہ تازیست قائم رہا۔

'زمانہ' فروری ۱۹۰۳ء میں بریلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ نومبر ۱۹۰۳ء میں پرچہ داداصاحب کا پہلا مرتبہ پرچہ ہے۔ اس کے سرورق پہ تحریر ہے "حسب فرمائش لالہ شیوبرت لال ورمن ایڈیٹر" اور اپنے نام کے پہلے "مرتبہ" لکھا۔ شروع سے لے کر ۱۹۴۲ء کے آخری پرچہ تک انھوں نے "مرتبہ" کے لقب کو اپنایا۔

جنوری ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں جو نوٹ تحریر ہے اس میں داداصاحب نے لکھا ہے کہ شوق اکتساب و خدمت ملکی نے بالآخر فتح پائی اور 'زمانہ' کی ترتیب اپنے سر لی گئی۔ جوش خدمت ملک ایسا جوش ہے کہ جس کے آگے اپنی ہستی، اپنا مستقبل کچھ بھی معنی نہیں رکھتا یا یوں کہیے کہ یہ وہ دماغی سیلاب ہے کہ جو اس سے لطف اندوز ہو وہی اس کے بہاؤ کی رفتار کو سمجھ سکتا ہے۔

جولائی ۱۹۰۴ء کے پرچہ میں داداصاحب نے اپنا ذہنی معیار اور نصب العین 'زمانہ' کے بارے میں مفصل طور پہ تحریر کر دیا (ملاحظہ ہو عرض حال صفحہ ۱۴۰) ظاہر ہے کہ داداصاحب کی نگاہ میں خدمت ملک کا ایک مکمل نقشہ کھنچا ہوا تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنا نصب العین کو اس طرح سادی زبان میں بیان کر دیا۔ نہ صرف بیان ہی کیا بلکہ اس پر عمل پیرا بھی ہوئے اور اپنی ۲۱ سال کی عمر سے لے کر حیات کے آخر تک اپنی قریب چالیس سال کی ادبی زندگی میں ہر طرح سے نبھایا۔ کسی قسم کی لغزش نہ ہوئی۔ باہمی میل جول و قومی یک جہتی کے زبردست علم بردار رہے اور ضمیر اور خدا سے ہی واسطہ تھا۔ ملک کی پولیٹیکل جد و جہد میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے اور سوشل ریفارم کے بانی و حامی رہے۔

اس ذہنی معیار اور نصب العین پہ عمل درآمد کرنا آسان نہ تھا۔ دو مرحلے سامنے تھے ایک تو مضامین نگار کا دو یم اقتصادی۔ مضامین اور مضامین نگاروں کی دشواری حائل نہیں ہوئی۔ داداصاحب کی خط نگاری اور طرز تحریر شاید کچھ اس قدر دلکش تھا کہ جس کو بھی لکھا اس نے کھلے دل سے آگے بڑھ کر حوصلہ افزائی کی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے سیدھے اور سچے طرز تحریر سے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے منکسر اور ملنسار مزاج نے لوگوں کے دلوں کو جیت لیا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بیان پالیسی سے لوگ متاثر ہو گئے ہوں یا ان سب ہی خوبیوں کا میل جول رہا ہو۔ غرضکہ ابتدا ہی سے چوٹی کے ادیبوں اور شعرا کے مضامین اور نظمیں زیب 'زمانہ' ہوتی رہیں۔ بفضلہ قلمی معاونین کی کمی کبھی داداصاحب نے محسوس نہیں کی۔ ان کو جستجو ہمیشہ ہی جاری رہتی تھی اور خط کتابت کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شاید داداصاحب کی ہر دلعزیزی یا 'زمانہ' کا معیاری رسالہ ہونے کی وجہ سے بہترین انشا پردازوں اور شعرا نے 'زمانہ' کو اور رسائل کے اوپر ترجیح دی۔ یہاں پر کم سے کم چند ہستیوں کا ذکر بے موقعہ نہ ہوگا جیسے اکبر الہ آبادی، سوامی رام تیرتھ، لالہ لاجپت رائے،

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

نواب محسن الملک، پریم چند، مولانا شبلی، حالی، نذیر احمد، سرور، چکبست، مہاراجہ کشن پرشاد، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی۔ فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی۔ یوں تو شاید ہی کوئی اعلا پیمانہ کے ادیب یا شاعر رہا ہو جس کا تعلق زمانہ اور اس کے ایڈیٹر سے نہ رہا ہو۔

اکبر الہ آبادی نے تو از سر نو دوبارہ قلم اٹھا کر 'زمانہ' میں جنوری سنہ ۱۹۰۴ء سے مستقل لکھنا شروع کیا۔ داد اصاحب کے اصرار پر علامہ اقبال نے قومی ترانہ لکھا جو کہ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء کے 'زمانہ' میں پہلی بار 'ہمارا دیس' کے عنوان سے طبع ہوا۔ اکبر الہ آبادی کی اولین نظم و قومی ترانہ اس رسالہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ پریم چند کے ابھرنے میں بھی داد اصاحب کا کافی ہاتھ رہا۔ کچھ ضرور خصوصیت داد اصاحب میں ہوگی۔ حالانکہ اخیر تک وہ اپنے آپ کو "مرتب" ہی کہتے رہے جیسے کہ سوائے ترتیب دینے کے اور کچھ زیادہ کام نہیں کیا۔

زمانہ اولاً قیصری پریس بریلی سے اشاعت پذیر ہوا۔ جب داد اصاحب نے یہ کام اپنے کندھوں پر لے ہی لیا تو ضروری ہو گیا کہ اس کا دفتر اور طباعت کا کام کانپور میں منتقل کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی اخیر سنہ ۱۹۰۴ء تک ہو گیا اور چند ہی سال کے عرصہ میں 'زمانہ' پریس بھی کانپور میں قائم ہو گیا۔ یہ ایک مختصر سا پریس تھا جو 'زمانہ' کی اشاعت کے لیے کافی سمجھا گیا۔

جب میں سنہ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوا اور ہوش سنبھالا تو اسی چھاپہ خانہ کی کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ کھٹ کے شور میں پلا۔ یہ میرے لیے شور نہیں تھا اور نہ ہے، یہ نغمہ تھا جو آج بھی میرے دل کے لیے کشش رکھتا ہے۔ طبیعت ہوتی ہے کہ اس مشین کے نغمہ کو زندگی بھر سنتا رہوں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جسے لوگ کریہہ سمجھیں دوسرے کے لیے نغمہ ہو۔ انگریزی کہاوت ہے "ایک آدمی کی غذا دوسرے کے لیے زہر ہو سکتی ہے"۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں اخبار آزاد کا اجرا ہوا۔ شاید وجہ یہی تھی کہ 'زمانہ' کی آمدنی گھر کے مصارف کے لیے ناکافی تھی۔ چھاپہ خانہ میں بھی کام کافی نہ تھا اس لیے تھوڑے ہی اسٹاف سے آزاد کا جاری کرنا ممکن ہو گیا۔ ہفتہ وار کی صورت میں نمودار ہوا اور شروع میں بہت کچھ توقع پوری کی۔

ادھر سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی اور کچھ عرصہ کے لیے 'آزاد' روزانہ اخبار ہو گیا۔ جنگ کے ختم ہوتے ہوتے بڑھتی گرانی اور روپیہ کی قیمت میں گراوٹ کی وجہ سے مالی مشکلات بڑھتی ہی گئی۔ چنانچہ 'زمانہ' پریس کو فروخت کرنا پڑا۔

اردو زبان اتنے زیادہ عرصہ سے ملک کی زبان ہونے پر بھی خاطر خواہ ترقی نہ کر سکی تھی۔ نہ ہی اپنی جڑیں مستحکم کر سکی۔ کم سے کم یہ تو ظاہر ہی ہے کہ 'زمانہ' ایسے معیاری اور پایہ کے رسالے کو بھی کسی قسم کی حوصلہ افزائی نہ کسی سرکاری قاعدہ ادارہ یا قدردانان اردو سے ملی۔ نہ دائرہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

خریداران ہی خاطر خواہ ہوا کہ کبھی فراغ البالی سے سانس لی جا سکتی۔ جو زبان ایسے رسالے کے لیے کبھی دو چار ہزار خریدار صرف پانچ روپیہ سالانہ بطور چندہ خریداری کے بھی نہ پیدا کر سکے تو اس کے مستقبل کا خدا ہی حافظ۔ بہت پرانی مثل ہے زبان نیچے سے اٹھتی ہے نہ کہ اوپر سے تھوپی جائے۔ اگر آپ ان سب امورات کا صحیح اندازہ لگا سکیں تو آپ دادا صاحب کی زندگی کی روزمرہ رسّہ کشی کو سمجھ سکیں گے اور ان کے پایہ استقلال کی داد دے سکیں گے۔ ان کے سامنے ایسے حل کبھی پیش ہوئے جب کہ کہا گیا کہ اسے ہندی میں نکالا جائے۔ اس کے معیار کو بدل ڈالا جائے لیکن دادا صاحب کی خودداری نے اسے کبھی منظور نہیں کیا اور اپنے ذہنی معیار جو انھوں نے خود ہی قائم کیا تھا اُسے تبدیل کرنا گوارا نہ کیا۔ نہ ہی کسی قسم کی لغزش آنے دی اور نہ ہی اردو کو خیر باد کہا۔ خانہ داری کے بڑھتے ہوئے اخراجات، یونیورسٹی و کالج کی پڑھائی کا بڑھتا ہوا خرچ ان سب حوصلہ شکن منازل کو طے کرنے کے لیے کس قدر ہمت اور زبردست استقلال لازمی رہا ہوگا۔

یہاں پر اپنی والدہ یعنی دادا صاحب کی رفیقہ حیات کا تذکرہ لازمی ہے کیونکہ انھیں کی ذات صفات کی وجہ دادا صاحب اپنی روش اور معیار پر قایم رہ سکے۔ بہتر ہے کہ میں دادا صاحب ہی کے الفاظ میں ان کا ذکر کروں جو انھوں نے میری والدہ کی وفات کے بعد قلمبند کیے تھے (ملاحظہ ہو آپ بیتی زمانہ اگست ۱۹۳۹ء)

"مسز دیا نرائن کے حسن انتظام، سلیقہ مندی، معاملہ فہمی اور گھریلو دور اندیشی کا سرسری ذکر نہ کرنا بھی انتہائی ناشکری ہوگی۔ انھیں کے سلیقہ شعاری اور جفاکشی کی بدولت راقم اتنے دنوں گھر گھرستی کے تمام بکھیڑوں سے آزاد رہ کر ملک کی بری بھلی جو ادبی خدمت ممکن ہوئی اطمینان اور سیر چشمی سے انجام دے سکا۔ مرحومہ کی حسن لیاقت اور تندہی کی بدولت میری زندگی بے فکری و آسودہ حالی میں بسر ہوئی۔ انھیں کے ایثار و جفاکشی کی وجہ سے مجھے اپنے محدود ذرایع کے باوجود وہ اطمینان قلب رہا جس سے زیادہ وسیع ذرایع والے شخص کو بھی مشکل ہی سے نصیب ہوا ہوگا اور اگر مصائب و مشکلات میں بھی میری ہمت قائم رہی تو اس کا کریڈیٹ اسی نیک بخت خاتون کو ملنا چاہیے جس نے میرے کنبے کی پرورش و تربیت کا بار اس قابلیت و جفاکشی کے ساتھ اپنے ذمہ لے رکھا تھا جس نے شروع سے آخر تک اپنی زندگی کے پچاس سال فرض شناسی خدمت گزاری اور دوسروں کی دلجوئی میں بحسن و خوبی بسر کر دیے جو جیتے جی دوسروں کے لیے مرتی رہی۔"

انھیں وجوہات سے وقت کٹتا گیا اور 'زمانہ' زمانے کے ساتھ عمر پاتا گیا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ 'زمانہ' یا 'آزاد' کا کوئی نمبر نہ نکلا ہو۔ اتنی مستحکم زندگی یا طولانی عمر شاید ہی کسی اردو رسالہ یا اخبار کو ملی ہو۔

دادا صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہی جا چکا ہے جو کہ 'زمانہ' کے یادگار نمبر کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میں ناظرین کی توجہ حضرت جوش ملیح آبادی

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کی نظم "نگاہِ خلوص بین" اور اس کے جواب میں جو خط داد اصاحب نے لکھا ہے، کی طرف مبذول کروں گا۔ داد اصاحب کے کیریکٹر کا ایک خصوصی پہلو جس سے کہ ظاہر ہے کہ وہ خود ستائی کو پسند نہیں کرتے، نمایاں ہے۔ خیال رہے کہ یہ نظم ان کی زندگی کے بعد ہی 'زمانہ' کے یادگار نمبر میں پہلی بار شایع کی گئی تھی۔

ایک اور خصوصی پہلو مارچ ۱۹۳۱ء میں نمایاں ہوا جبکہ سردار بھگت سنگھ کی پھانسی کے بعد کانپور میں سخت احتجاج کی صورت اختیار کی۔ ہم لوگ ایک ہندو مسلم ملی جلی آبادی والے محلہ میں رہتے تھے۔ محلہ مکھنیا بازار، مچھلی بازار، مصری بازار، نزدیک ہیں، چوبے گولہ، قصائی باڑہ، نئی سڑک بھی دور نہیں۔ ورا کم خوش حال طبقہ زیادہ ہے۔ مندر اور مسجد بھی کافی ہیں۔ شری گنیش شنکر ودیارتھی، داد اصاحب سے ۷۔۸ سال عمر میں چھوٹے تھے۔ ان کے نزدیکی دوست اور ہم پیشہ تھے۔ ۱۹۱۳ء میں جب ودیارتھی جی نے ہندی کا ہفتہ واری 'پرتاپ' کا اجرا کیا اس وقت داد اصاحب اردو صحافت کی زندگی میں دس سال گزار چکے تھے۔ کافی صلاح و مشورے ہوتے تھے اور اکثر ملاقات اور گھر میں آنا جانا رہتا تھا۔

مارچ ۱۹۳۱ء کا فساد کچھ زیادہ ہی فتنہ انگیز تھا۔ ہم دو بھائی اس وقت الہ آباد میں طالب علم تھے۔ داد اصاحب اور والدہ کی زبانی بعد میں معلوم ہوا کہ محلہ کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ فساد نے ہیبت ناک صورت اختیار کر لی تھی۔ ہندو مسلم اپنے اپنے مکان چھوڑ چھوڑ کر حفاظت کی جگہ چلے گئے تھے۔ دن کو کمتر لیکن رات کو بیشتر ہر ہر مہادیو اور اللہ اکبر کے نعروں کی دہشت اور بھی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی اہمیت آپ تب ہی سمجھ سکیں گے اگر آپ شہر کے قتل و خون کے بیچ تاریک رات میں چاروں طرف سے اٹھتے ہوئے نعروں کی گونج کا تصور کر سکیں ساتھ ہی اپنے کو اکیلا بے یار و مددگار محسوس کر سکیں۔ سب ہی خواہاں نے صلاح دی کہ مکان چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اس مسئلہ پر بہت غور ہوا لیکن یہ خیال کر کے کہ جانے کے بعد محلہ میں خون خرابہ کی انتہا نہ رہے گی ترک مکان کا خیال چھوڑ دیا گیا۔

ودیارتھی جی شہادت سے دو گھنٹہ پہلے داد اصاحب سے ملنے مکان پر آئے تھے۔ بہت دیر تک صلاح و مشورہ ہوتا رہا۔ فساد کو فرو کرنے کی ترکیبیں سوچی گئیں۔ گشت کے مشورے ہوئے، دونوں اصحاب باہر نکلے۔ ودیارتھی جی چوبے گولہ ہوتے ہوئے نئی سڑک کی طرف جانے لگے منع کرنے پر بھی نہ مانے اسی کے تھوڑی ہی دیر بعد ان کی شہادت ہو گئی۔ تب تو فساد نے بہت ہی خوفناک صورت اختیار کر لی۔ محلہ والے سخت پریشان ہو گئے لیکن داد اصاحب نے اپنے پاے استقلال کو نہ ڈگنے دیا بلکہ محلہ کے جو ہندو و مسلمان خوف زدہ تھے ان سب کو بلا کر بلا امتیاز اپنے گھر میں جگہ دی۔ یہ داد اصاحب

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

کا ذاتی رسوخ و ہر دلعزیزی ہی تھی کہ کسی بھی محلہ والے ہندو یا مسلم کا بال بانکا نہیں ہوا۔ اس طرح ایک اور ذہنی معیار وقت آزمائش پر میدان عمل میں بھی پورا اترا۔

ایک اور خصوصی پہلو دادا صاحب اور میرے بیچ گفتگو میں ابھر کر سامنے آیا۔ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ میں ایم۔ ایس سی پاس کر چکا تھا۔ مقابلہ کے امتحانات کی تیاری میں ہمہ تن مشغول تھا۔ ملک میں کچھ اقتصادی گراوٹ کی وجہ سے سرکاری ملازمت میں داخلہ بہت محدود و کم ہو گیا تھا۔ میرے بڑے بھائی صاحبان مقابلہ سے ملازمت میں داخلہ حاصل کر چکے تھے۔ مجھے اپنے اوپر اطمنان تھا پھر بھی یہ وقت بہت مشکل و دشوار ہوتا ہے۔

اس وقت دادا صاحب کے ایک عزیز دوست انکم ٹیکس محکمہ میں برسر اقتدار تھے۔ انسپکٹروں کی بیسیوں جگہ کا اعلان ہوا۔ داخلہ محض انتخاب سے تھا۔ تنخواہ ضرور کم تھی، دادا صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں یہ ملازمت پسند کروں گا میں نے انکار کر دیا سوچا کہ اگر اتنی ہی تنخواہ کی ملازمت کرنا ہے تو گھر کا اخباری کام کیا برا ہے۔ دس ہی پندرہ روز میں طبیعت نے پلٹا کھایا سوچا کہ گھر کی ملازمت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جو ملتا ہے وہی سہی۔ اس کے پہلے گھریلو باتوں میں دادا صاحب کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ برخوردار شکر ادا کرو تم لوگوں کو میں نے کاتب یا دفتری نہیں بنا دیا۔ جو کہ بہت حد تک سچ تھا۔ جن مراحل سے دادا صاحب گزرے تھے وہ سب ہم لوگوں کو معلوم تھے۔ چنانچہ میں نے دادا صاحب سے ذکر کیا کہ مجھے وہ ملازمت منظور ہے کوشش کر دیجیے۔ کسب معاش کے بلند خیالات و عملی صورت کی رسہ کشی کس کو پریشان نہیں کرتی۔ کس کے پیر نہیں لڑکھڑاتے۔ کس کا دماغ لغزش نہیں کھاتا۔ یہ بات سن کر کچھ دیر وہ خاموش رہے پھر جو جواب دیا اس سے میں حیرت میں پڑ گیا۔ فرمایا۔ برخوردار میں نے تمھیں پہلے ہی موقع دیا تھا۔ تم نے انکار کر دیا اب میں اپنے ایک دوست کے لڑکے کی سفارش کا وعدہ کر چکا ہوں۔ اب میں پہلے ان کی سفارش کروں گا اور اگر گنجائش سمجھی تو تمھارے لیے دوسرے نمبر پر کہنے کی کوشش کروں گا۔ سفارش کہیے یا مقدر وہ دوست کا لڑکا منتخب ہو گیا اور بالآخر پاکستان بننے پر تبادلہ ملازمت پر جا کر انکم ٹیکس کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔ اس وقت تو مجھے بہت تکلیف محسوس ہوئی لیکن آج میں اس کی وجہ سے دادا صاحب کی دوگنی عزت کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ایسا کیریکٹر مجھے بھی عطا فرمائے۔ یہ انسانی خوبی نہ تھی یہ خصلت فرشتہ تھی۔ جو معیار ذہنی اپنے لیے قائم کیا اس پر عمل بھی کیا۔ اصول کے لیے ہر قسم کی قربانی انھیں بہر صورت منظور تھی۔

اب اور کچھ لکھنے کو باقی نہیں ہے البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دادا صاحب نے اپنی ساری زندگی، اپنی ساری خدمات، اپنا سارا اثاثہ اپنا حال اور مستقبل سبھی کچھ اردو کے نذر کر دیا۔ کسی بدل کی پرواہ نہ کی کسی ستائش کی تمنا نہیں کی، کسی صلہ کے خواستگار نہیں رہے۔ بے لوث خدمت کرتے

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

رہے لیکن اردو زبان اور قدر دانانِ اردو نے انھیں کیا کچھ دیا۔ ان کی وفات سے چالیس سال کے عرصہ میں ایک دفعہ بھی انھیں یاد نہ کیا گیا۔ افسوس تو یہی ہے کہ ان سب کے باوجود اردو بولنے والے اصحاب جن میں میں بھی شامل ہوں کیا کچھ نہیں چاہتے لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آپ کیا کریں گے۔ یہ کبھی خیال بھی نہ آیا کہ میں کیا کروں گا اگر سوال ہے تو صرف اتنا کہ مجھے جو چاہیے وہ کیوں نہیں ملتا۔

پیڑ وہی سرسبز ہوتا ہے جس کی خدمت کی جائے۔ جڑیں مضبوط بنائی جائیں لیکن کیا اردو کی جڑیں مضبوط ہیں۔ کیا جڑیں خاطر خواہ ہیں۔

⁂ ⁂ ⁂

نذرِ حقیر

صبح کا وقت تھا، پہاڑی کے سرد پہلو سے ٹکراتا ہوا دریائے جمن خاموشی سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے گروجی اپنے بھگتوں کو دھرم اپدیش دے رہے تھے، فضا امرت برسا رہی تھی۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ دریا بھی اسی رفتار سے بہہ رہا تھا۔ گروجی بھی اسی طرح اپدیش دے رہے تھے

گروجی کا چیلا رگھوناتھ بھی آیا، اس نے گروجی کو پرنام کرتے ہوئے کہا "میں شری مہاراج کی سیوا میں یہ نذرِ حقیر لایا ہوں، قبول فرمائیں۔ یہ کہہ کر اس نے گروجی کے نزدیک دو بیش بہا طلائی کڑے رکھ دیے۔ سورج کی کرنیں پڑتے ہی کڑے جگمگا اٹھے۔ رگھوناتھ کے چہرے سے غرور جھلکنے لگا

گروجی نے اپدیش دیتے دیتے ایک کڑے کو انگلی میں ڈال کر گھمانا شروع کیا۔ کڑا انگلی سے نکل کر دریا میں جا پڑا اگرنے کی ذرا سی آواز ہوئی، پھر فضا ساکن ہو گئی۔

رگھوناتھ دریا میں گھس کر کڑا تلاش کرنے لگا، صبح سے شام ہو گئی مگر کڑا نہ ملا۔ رگھوناتھ واپس آیا۔ اس کے تمام کپڑے پانی میں تر بتر ہو گئے تھے، بدن تھکان سے چور اور چہرہ اترا ہوا تھا۔

اس نے گروجی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہو کر عاجزی سے دریافت کیا "اگر مہاراج مجھے یہ بتانے کی کرپا کریں کہ کڑا کس طرف اور کہاں گرا تو میں اسے پھر تلاش کر دوں ممکن ہے مل جائے۔"

گروجی نے دوسرے کڑے کو پانی میں پھینکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "وہاں"

دریا میں پھر ذرا سی آواز ہوئی، اور تمام فضا اسی طرح پھر خاموش ہو گئی۔

ٹیگور

"زمانہ" اپریل ۱۹۴۰ء

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

بھولی بسری یادیں

سری نرائن نگم

بچپن میں میں نے جب آنکھیں کھولیں اور کچھ شعور آیا تو میں نے دیکھا کہ والد کے پاس آنے والوں کا سلسلہ تقریباً صبح سے شام تک جاری رہتا تھا اور علمی ادبی چرچوں، شعر و شاعری کے تذکرے اور سوشل پولٹیکل مسئلوں پر پُرلطف مباحثوں سے محفل گرم رہتی تھی۔ بہت دنوں تک رسالہ کا دفتر ہمارے سکونتی مکان سے علٰحدہ کہیں قریب تھا۔ والد کا سارا وقت قریب قریب وہیں کٹتا تھا اور میں و میرے بھائی دن کا کافی وقت وہیں صرف کرتے تھے۔ آنے والوں میں نہ فقط مقامی و بیرون جات کے اردو کے ادیب و شاعر و نثر نگار ہوتے تھے بلکہ باہر سے آنے والے ہندی ادیب و شاعر بھی والد سے ملنے آتے تھے۔ اس کے علاوہ چونکہ والد کو قومی تحریک و سوشل ریفارم سے کافی دلچسپی تھی اس لیے مقامی پولٹیکل لیڈر بھی تبادلہ خیال یا رسمی طور پر آیا کرتے تھے۔ اس طرح اگر ایک طرف ایسی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں جہاں علم و ادب کے چرچے ہوتے تھے تو دوسری طرف بے غرض سچے وطن پرستوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ جہاں لوکمانیہ تلک کے ہوم رول و گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون و لبرل (Liberal) پارٹی کی پالیسی پر بحث مباحثے و تنقیدیں ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں جو میں نے گھر بیٹھے دیکھا و سنا ویسا موقع کسی دوسرے کو کم نصیب ہوا ہوگا۔ آج بھی وہ منظر و وہ صورتیں آنکھوں کے سامنے پھرتی ہیں۔ ان چند سطروں میں نہ فقط آپ کو ان سے روشناس کرانا ہے بلکہ ان کو خراج عقیدت بھی پیش کرنا ہے۔

پہلی ہستی جن سے میں روشناس ہوا سرور جہاں آبادی تھے۔ سرور کا 'زمانہ' و اس کے ایڈیٹر سے دلی تعلق تھا۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ 'زمانہ' میں ہی شائع ہوا۔ یہ ہمارے سکونتی مکان میں مہینوں مقیم رہے۔ دبلے پتلے چھوٹا قد گندمی رنگ، بال کچھ گھونگھرالے، آنکھیں چمکیلی، مونچھیں گھنی پان کے شوقین اور شراب کے دلدادہ تھے جو بالآخر قاتل ثابت ہوئی اور وہ صرف سینتیس سال کی عمر میں جبکہ ان کا کلام اپنے انتہائی عروج تک بھی نہ پہنچ پایا تھا اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پھر بھی اس قلیل عرصہ میں انھوں نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ کسی شاعر کے لیے باعث فخر ہو سکتا ہے۔ ان کی آمد سخن بے پناہ تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے جو امنڈا چلا آرہا ہے ایک بحر بیکراں ہے کہ موجیں لے رہا ہے۔ ان کی اچھوتی تشبیہیں اور نئے استعارے سننے والے کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔ بلاشبہ وہ اپنے وقت کے اردو نظم کے بادشاہ تھے۔ لطف یہ کہ ان کا کلام رنگارنگ کے موضوع سے لبریز تھا۔ انھوں نے قدرتی مناظر، انسانی جذبات، حب وطن اور کائنات کی چھوٹی بڑی تخلیق پر طبع آزمائی کی اور اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا۔ اگر زندگی اجازت دیتی تو وہ اردو نظم کو بڑی بلندی تک پہنچا دیتے لیکن افسوس کہ افق اردو پر یہ ستارہ پوری طور سے ابھر بھی نہ پایا تھا کہ ڈوب گیا۔ رنج کا مقام ہے کہ آج کی اردو جاننے والی پبلک ان کے کلام سے پوری طرح آشنا بھی نہیں ہے۔ ان کے کلام کا ایک مجموعہ 'نغمانہ سرور' کے نام سے عرصہ دراز ہوا زمانہ پریس سے شائع ہوا تھا اور دوسرا انڈین پریس الہ آباد سے غالباً 'جام سرور' کے نام سے نکلا تھا لیکن اب دونوں نایاب ہیں۔ اس کے بعد کسی نے ان کے کلام کو یکجا کر کے شائع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

منشی نوبت رائے نظر لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور 'زمانہ' کے ادارہ میں مہینوں بلکہ برسوں کام کیا۔ کچھ دنوں 'اودھ' اخبار لکھنؤ کے ایڈیٹر اور اور غالباً انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہونے والے اردو رسالہ 'ادیب' کی ادارت بھی کی۔ نظر صاحب نہایت متین و سنجیدہ طبیعت کے تھے۔ ان کے کلام میں صفائی، ستھراپن اور لکھنؤ کی زبان کا نکھار تھا۔ بذات خود بھی نہایت وضعدار تھے۔ گندمی رنگ، قد کچھ لمبا، چھریرا جسم۔ اچکن، پاجامہ اور ٹوپی پہنتے تھے۔ لباس ہمیشہ صاف و ستھرا ہوتا تھا۔ افسوس کہ ان کے کلام کا زیادہ حصہ اب ناپید ہے۔

پریم چند جی کے بارے میں اتنا لکھا اور کہا جا چکا ہے کہ اس میں کسی معتد اضافہ کا امکان نہیں ہے۔ 'زمانہ' سے ان کو کافی لگاؤ تھا بلکہ ان کی تحریری زندگی کا آغاز غالباً 'زمانہ' سے ہی ہوا۔ پیشتر وہ نواب رائے کے نام سے لکھتے تھے۔ 'زمانہ' میں کئی مضامین جن میں روٹھی رانی کا بھی طویل تاریخی افسانہ شامل ہے اسی نام سے شائع ہوئے تھے۔ بعد میں مصلحتاً ان کو یہ نام ترک کرنا پڑا۔ پریم چند کا نام والد ہی کا تجویز کیا ہوا تھا جس کو انھوں نے پسند کر کے اختیار کر لیا۔ ابتداءً ان کی کہانیاں صرف 'زمانہ' میں شائع ہوتی تھیں لیکن حالات سے مجبور ہو کر انھوں نے دوسرے رسالوں میں بھی لکھنا شروع کیا اور بالآخر ہندی کا آسرا لینا پڑا اور یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ اس سے ان کی شہرت بہت جلد سارے ملک میں پھیل گئی لیکن اس کے باوجود ان کو 'زمانہ' کا ہمیشہ خیال رہا اور اس کے ایڈیٹر کو وہ اپنا قریب ترین دوست اور بھائی سمجھتے رہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پریم چند جی نہ صرف ہمارے مکان اکثر آتے تھے بلکہ ہفتوں و مہینوں ہمارے یہاں مقیم رہتے تھے۔ ہمارا گھر ان کے لیے خانہ بے تکلف تھا اور ہر چھوٹا بڑا ان سے بخوبی واقف تھا اور ان کو ماسٹر صاحب کے نام سے پکارتا تھا۔ گورا رنگ، کشادہ پیشانی، چھوٹا قد، دبلا پتلا جسم، غضب کے ہنسوڑ اور باذاق تھے۔ ہنستے تھے تو اس قدر دل کھول کر کہ مکان کے مردانہ حصے میں ہنستے تو ان کے قہقہہ کی آواز زنانہ حصہ تک جو کافی دور تھا جاتی تھی۔ بے تکلف اور ہر چھوٹے بڑے حتی کہ بچوں میں گھل مل جاتے تھے اور ان کے کھیلوں میں شریک ہو جاتے تھے۔ ایک بار گھر کے لڑکے لاٹری کا کھیل کھیل رہے تھے وہ بھی شریک ہو گئے اور ایک ٹکٹ اپنے نام سے اور اپنے ڈنڈے کے نام سے لیا۔ ہم لوگوں کی مایوسی کی انتہا نہ رہی جبکہ پہلا انعام ان کے نام اور دوسرا ان کے ڈنڈے کے نام نکل آیا۔ اس پر جو انھوں نے ہنسنا شروع کیا تو کئی منٹ تک ہنستے ہی رہے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کرسی پر بیٹھتے تھے تو زیادہ تر ایک پیر دوسرے پیر رکھ لیتے تھے اور اس کو ہلایا کرتے تھے۔

پریم چند جی اپنے وقت کے ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نویس تو تھے ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت ایماندار، اپنے اصولوں کے پکے اور خالص محب وطن تھے۔ سرکاری ملازمت کے دوران جب بھی وہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے دورہ پر جاتے تھے تو ایک پیسہ بھی نذرانے کے نام سے لینے کے روادار نہیں تھے۔ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی تحریک میں انھوں نے سرکاری ملازمت ترک کر دی۔ میں نے ایک بار ان سے پوچھا کہ آپ کی نظر میں آپ کا سب سے اچھا افسانہ کون ہے یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ غالباً میرا سوال ہی بے تکا تھا۔

افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ وہ پیچش کے پرانے شکار تھے اور آخر کار اس موذی مرض نے مہلک صورت اختیار کر لی اور وہ ایک لمبی بیماری کے بعد ہم سے جدا ہو گئے۔ ان میں اور میرے والد میں جو محبت، دوستی و برادرانہ تعلقات تھے وہ تمام عمر قائم رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ان کی نازک حالت کا تار آیا تھا اس کے دوسرے ہی دن والد کے ایک اہم خاندانی مقدمہ کی سنوائی کی تاریخ تھی لیکن اس کے باوجود والد فوراً دوسری گاڑی سے بنارس چل دیے اور اس عظیم افسانہ نویس، محب وطن اور ایک شریف انسان کے دنیا کو خیرآباد کہنے کے پہلے پہنچ گئے۔ زمانہ نے اپنا خراج عقیدت پریم چند نمبر شائع کر کے ادا کیا۔

گنیش شنکر ودیارتھی کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان کی ہستی پر کسی ملک کو ناز ہو سکتا۔ وہ آزادی کے سچے سپاہی اور انسانیت کے علمبردار تھے۔ ان کا مشہور ہفتہ وار اخبار

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

'پرتاپ' ہندی میں، کانپور سے شائع ہوتا تھا اور کانگریس کی پالیسی اور ملک کی آزادی کی بے خوفی سے حمایت کرتا تھا جس کا خمیازہ کئی بار ان کو حکومت وقت کے ہاتھوں اٹھانا پڑا۔ گنیش جی اکثر ہمارے یہاں آتے تھے بلکہ جب بھی 'پرتاپ' حکومت کے عتاب کا شکار ہوتا تھا تو اس کے مدافعت کے لیے اکثر ہمارے گھر میں باہمی مشورہ ہوتے تھے۔ گنیش جی کی وضع قطع نہایت سادہ تھی۔ کھدر کی دھوتی اور اسی کا کرتا پہنتے تھے۔ افسوس کہ ۱۹۳۱ء کے مقامی فرقہ وارانہ فساد فرو کرنے کی کوشش میں یہ انمول رتن کھو گیا۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ۲۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو وہ سہ پہر کے وقت .... ہمارے یہاں آئے اور بہت دیر تک فسادات پر اظہار غم کرتے رہے۔ اس وقت وہ بنگالی محال کا جہاں ہندو آبادی کی اکثریت تھی، دورہ کر کے آئے تھے۔ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہندو بھی اتنے بے رحم ہو سکتے ہیں۔ شام کو قریب پانچ بجے وہ نئی سڑک جو مسلم محلہ تھا جانے پر تیار ہو گئے تاکہ کوشش کر کے فرقہ وارانہ فساد فرو کرا سکیں۔ والد نے ہر چند ان کو منع کیا لیکن وہ نہ مانے۔ آخر کار مجبوراً والد وہیں ان کو چوبے گولہ کی گلی ہو کر نئی سڑک کے ناکے تک پہونچا آئے۔ اس وقت بھی والد نے ان کو آگے جانے سے منع کیا لیکن وہ نہ مانے۔ اس کے بعد وہ زندہ نہیں لوٹے۔ اس وقت ان کے ہمراہ فقط دو والنٹیر تھے۔

گنیش جی ان چند ہستیوں میں تھے جو خلوص، وایمانداری سے ہر ممکن قربانی کر کے دیش کی سیوا کرتے تھے اس پاداش میں وہ کئی مرتبہ جیل بھی گئے اگر وہ جیتے رہتے تو وہ لال بہادر شاستری کی طرح سچے اور ایماندار دیش بھکت ثابت ہوتے۔

کبھی کبھی آنے والوں میں مولانا حسرت تھے۔ اگر ان کو کوئی دیکھتا تو اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا کہ یہ شخص جو اپنی ظاہری شکل صورت سے بے نیاز ہے، اقلیم غزل کا بادشاہ اور ایک سچا وطن پرست ہے۔ چہرہ پر چیچک کے داغ، ڈھیلی دہری کا پاجامہ صاف کم میلا زیادہ، معمولی سی اچکن زیب تن جس کے بٹن اکثر کھلے ہوئے۔ وہ ملک کی آزادی کے خواہاں اور لوکمانیہ تلک کے پولیٹکل اصولوں سے قریب تھے۔ اسی وجہ سے گاندھی جی کے زیر اثر کانگریس سے ان کی پٹری نہیں بیٹھتی تھی۔ وہ وطن کے خاطر اس وقت جیل گئے تھے جبکہ جیل میں اے۔ بی کلاس کا امتیاز نہ تھا اور پولیٹکل قیدیوں سے معمولی قیدیوں کی نسبت زیادہ سختی برتی جاتی تھی۔ ان کا یہ شعر واقعات کی سچی تصویر تھی

ہے مشق سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
یک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کو کرشن جی سے عقیدت تھی اور وہ ہر سال ایک نظم ان کی نذر کرتے تھے ان کا

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

ایک شعر ہے

حسرتؔ کی بھی قبول ہو متھرا میں حاضری
سنتے ہیں عاشقوں پر لطف و کرم ہے خاص

جگر مرادآبادی صاحب جب کبھی بھی کانپور آتے تھے تو ہمارے یہاں بغیر آئے واپس نہیں جاتے تھے بلکہ اگر ان کا قیام کانپور میں زیادہ عرصہ تک ہوتا تو کئی بار آتے تھے اور دیر تک رہتے تھے۔ جگر اور جوش کے کلام کو خود ان کی زبان سے سننے والا اس کی لذت کو نہیں بھول سکتا۔ دونوں کے پڑھنے کا انداز اتنا دل نشیں تھا کہ سننے والے کا جی نہیں بھرتا تھا اور ان کے اشعار کی خوبیوں کو اور بھی نکھار دیتا تھا تاہم دونوں کا انداز جداگانہ تھا۔ جگر کے ترنم میں درد کی کسک تھی۔ جوش کے پڑھنے میں ترنم تو ہوتا ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ایک شکوہ بھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک بحر بیکراں ہے کہ امنڈا چلا آتا ہے۔

جگر پہلے رند لاابالی تھے۔ داڑھی اور سر کے بال پریشان، آنکھیں مست تھیں ان سے ذہانت کا اظہار ہوتا تھا۔ لباس کی طرف سے بے اعتنائی اگر اچکن کے بٹن کھلے ہیں تو پروا نہیں اگر اچکن کچھ کم صاف ہے تو بلا سے۔ بعد کو وہ زاہد پارسا ہو گئے اور طور طریقوں میں متانت اور سنجیدگی آگئی لیکن صاف باطن وہ پہلے بھی تھے اور آخر تک رہے۔ جوش کا یہ مصرع غالباً ان ہی کے ایسے انسانوں کے لیے کہا گیا ہے ع بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں۔

جہاں کہیں اردو شاعری کی محفل سجے گی آپ جگر کو صف اول میں پائیں گے۔

میں ان خوش نصیب لوگوں میں ہوں جن کو جوش کے قریب گھنٹوں بیٹھنے اور ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا موقع ملا ہے اور میں ان چند گھنٹوں کو اپنی زندگی کی بیش قیمت گھڑیوں میں شمار کرتا ہوں۔

جوش کو قدرت نے جیسی صورت دی ہے ویسی ہی سیرت عطا کی ہے۔ وہ ایک خالص اور باوضع انسان ہیں۔ حافظہ ان کا بلا کا ہے۔ ایک ہی نشست میں وہ اپنی طویل نظمیں گھنٹوں سناتے چلے جاتے ہیں۔ پیتے وہ ضرور ہیں لیکن اس کا اثر ان کے طرز عمل یا گفتگو پر نہیں ہوتا ہے۔ والد تو جوش کو شاعر انقلاب کہتے تھے اور دونوں کے تعلقات برادرانہ تھے۔

ہندی شاعروں وادیبوں میں جو ہمارے یہاں آتے تھے ان میں پنڈت سری نرائن چترویدی، میتھلی شرن گپت اور پنڈت بنارسی لال چترویدی کے نام قابل ذکر ہیں۔ پنڈت سری نرائن چترویدی اور میتھلی شرن جی گپت جب آتے تھے تو دیر تک اپنی کویتائیں سناتے تھے اور یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ شاعری میں زبان کی کوئی قید نہیں ہے اور ہر زبان کا شاعر اپنے جذبات واحساسات کے اظہار میں دوسری زبان کے شاعروں سے قریب ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

جگہ کی کوتاہی اس کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ میں اس تذکرہ کو طول دوں ورنہ آنے والے اصحاب میں روش صدیقی، ساغر نظامی، جگت موہن لال رواں، مرزا جعفر علی اثر، منور، سحر عشق آبادی، سفت پرشاد مدہوش، جگر بریلوی، ڈاکٹر ایم حفیظ، سلیم جعفر کا ذکر باقی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں کیپٹن سوریہ پرتاپ کے بارے میں کچھ لکھنا ضروری ہے۔ ان کے متعدد مضامین حق پرست کے نام سے زمانہ میں شائع ہوئے۔ وہ جو صحیح و درست سمجھتے تھے اس کو بے خوفی سے سپرد قلم کرنے میں ہچکچاتے نہیں تھے۔ ان کے لکھے ہوئے مباحثے پڑھ کر اگر کوئی یہ رائے قائم کرے کہ وہ کٹر اور تنگ خیال تھے تو وہ غلطی پر ہوگا۔ ان کے سینے میں محبت بھرا دل تھا اور وہ اچھے دوست و نیک انسان تھے البتہ جس کو وہ صحیح سمجھتے تھے اس کو کہنے میں ان کو دریغ نہیں تھا۔

اب مناسب ہے کہ میں اس بزرگ ہستی کے بارے میں کچھ کہوں جس کی کشش لوگوں کو یہاں کھینچ لاتی تھی اور جس شمع کے گرد اردو کے ادیب و عالم جمع ہوتے تھے اور خود محظوظ ہوتے تھے اور ان کو بھی محظوظ کرتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے کانپور کے ایک معزز کایستھ گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے دادا منشی شیو سہائے اور ان کے چھوٹے بھائی منشی گور سہائے کانپور کے سربرآوردہ وکیلوں میں تھے۔ ابتدائی تعلیم سرکاری اسکول میں پائی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کانپور کے کرائسٹ چرچ کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس زمانہ میں اس کالج کا شمار صوبہ کے چوٹی کے کالجوں میں ہوتا تھا۔ اس کے اسٹاف میں متعدد انگریز پروفیسر تھے اور تعلیم کا معیار بہت بلند تھا اور پڑھنے اور پڑھانے والوں کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد گھر والوں کی توقع تھی کہ وکالت کا پیشہ اختیار کریں گے لیکن یہاں دوسری ہی لگن لگی تھی اور ۱۹۰۳ء ہی میں انھوں نے 'زمانہ' کی ادارت قبول کر لی اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ زمانہ کے ہو گئے اور زمانہ ان کا ہو گیا اور یہ تعلق نومبر ۱۹۴۲ء میں ان کے سفر آخرت اختیار کرنے پر ہی ختم ہوا۔ ایک اردو ادبی رسالہ کا انتالیس سال تک زندہ رہنا ایک معجزہ تھا جو فقط ان کی ان تھک کوششوں و قربانیوں سے ظہور میں آیا۔ اس طویل عرصہ میں جن مالی مشکلات و پریشانیوں کا ان کو مقابلہ کرنا پڑا اس کا اندازہ کسی دوسرے کے لیے لگانا مشکل ہے لیکن جس آئیڈیل کو لے کر وہ چلے تھے اس کو انھوں نے زندگی بھر نبھا دیا اور رسالہ کے معیار کو کبھی نہیں گرنے دیا اور نہ اس کی پالیسی میں کوئی فرق آیا۔

ان کی گھریلو زندگی نہایت سادہ تھی۔ گوشت و شراب سے پرہیز تھا لیکن تنگ دلی سے کام نہیں لیتے تھے۔ دوسروں کے گوشت کھانے اور اعتدال سے پینے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے زندگی بھر ایک وضع کی پوشاک پہنی۔ گھر میں دھوتی کرتا قمیص یا پاجامہ و باہر چوڑی دار پاجامہ

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اچکن و گول ٹوپی ۔ مذہبی تعصب چھو بھی نہیں گیا تھا۔ ان کے قریب تر لوگوں میں ہر مذہب کے لوگ تھے ۱۹۲۷ء و ۱۹۳۱ء میں کانپور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ۔ جس محلہ میں ہمارا گھر تھا وہاں ملی جلی آبادی تھی لیکن فقط ان کی ذات سے ہمارے محلہ میں امن و امان رہا بلکہ راستے باہر سے آنے والوں کے لیے بھی محفوظ رہے ۔

جسمانی صفائی کے سختی سے پابند تھے ۔ بلا لحاظ موسم دن میں دو بار غسل کرتے تھے ۔ پان کا شوق تھا خود کھاتے تھے اور آنے والوں کو کھلاتے تھے ۔ اگر کھانے یا ناشتہ کے وقت کوئی ملنے والا آ گیا تو اس کو باصرار کھانا یا ناشتہ میں شریک کرتے ۔

دن کا معمول یہ تھا کہ صبح چھ، سات بجے اٹھتے اور ناشتہ کے بعد کام میں مصروف ہو جاتے انگریزی و اردو اخبارات کا مطالعہ کرتے، انگریزی کے روزنامہ کے علاوہ انگریزی کا ہفتہ وار سوشل ریفارمر اور سرونٹ آف انڈیا کے انگریزی ہفتہ وار و گاندھی جی کے ینگ انڈیا پڑھتے تھے انگریزی کے ماڈرن ریویو و انڈین ریویو بلاناغہ پڑھتے ۔ انگریزی کے مشہور مقالے، ڈرامے و ناول بھی نظر سے گزرتے تھے ۔ کتابوں کا شوق تھا اور ان کے کتب خانہ میں اردو و انگریزی کتابوں کا اچھا خاصہ مجموعہ رہتا تھا ۔

ناشتہ کے تھوڑی دیر بعد رسالہ کا کام شروع ہو جاتا تھا۔ آنے والے مضامین غور سے دیکھتے ان میں ضروری اصلاح و کانٹ چھانٹ کرتے اور بعض میں صفحہ کے صفحہ لکھ کر پیوند لگاتے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ آنے والوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ۔ زیادہ تر ان سے بات بھی کرتے جاتے تھے اپنا کام بھی کرتے جاتے تھے ۔ اگر مضمون اشاعت کے بالکل ناقابل ہوا تو اس کو رد کر دیتے ۔ نامہ نگار اصحاب سے برابر خط و کتابت جاری رہتی اور ان کو لکھنے پر آمادہ کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی کوششوں سے اردو نثر و نظم لکھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ۔

گفتگو کا انداز بہت دلکش تھا ۔ دو ہی چار منٹ میں سننے والا خواہ وہ عمر میں بڑا ہو یا چھوٹا تعلیم یافتہ ہو یا ان پڑھ ان سے بے تکلف ہو جاتا تھا ۔ پہلو میں دردمند دل تھا اور اگر ممکن ہوتا تو دوسروں کی تکلیف رفع کرنے کی کوشش کرتے لیکن اصول کے پکے تھے اور اس کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے ۔

سوشل ریفارم و سدھار کے اوائل عمر سے حامی تھے ۔ ازدواج بیوگان کے طرفدار تھے جہیز کے خلاف انھوں نے ۱۹۱۴ء میں آواز اٹھائی تھی اور کائستھوں میں سدھار کے لیے زوردار قدم اٹھائے تھے آج کل یہ بات اتنی اہم نہیں معلوم ہوتی ہے لیکن اب سے ساٹھ پینسٹھ سال

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

پہلے کا نقشہ ہی اور تھا۔

رسالہ کی ادارت کے فرائض یہ اجازت نہیں دیتے تھے کہ خود زیادہ لکھتے پھر بھی جو مضامین انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں ان کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو صفحات سے زائد ہے۔ ان میں 'زمانہ' کا وہ حصہ شامل نہیں ہے جس کو وہ تقریباً ہر ماہ رفتارِ زمانہ کے نام سے لکھتے تھے۔ اس میں ملک و بیرونجات کے واقعات پر ایک بے لاگ تبصرہ ہوتا تھا۔ ان سب کے علاوہ مشہور کتابوں پر تنقیدیں و علمی خبریں بھی 'زمانہ' میں شائع ہوتی تھیں۔ مشہور اہلِ قلم کی تصنیفوں و شعرا کے کلام کی جو تنقیدیں 'زمانہ' میں شائع ہوئی ہیں وہ ایک غیر جانب دار نقاد کے لیے مشعلِ راہ ہو سکتی ہیں۔

عزم و استقلال مزاج میں تھا باوجود مالی مشکلات کے انھوں نے اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ان کے بچے ہمیشہ صاف و ستھرے رہے۔ مہمانوں کی خاطر مدارات کھلے دل سے تا حدِ امکان کرتے تھے اور ان کے لیے گھر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا وہ ایک شفیق باپ تھے لیکن اصولوں کے سختی سے پابند تھے۔

ملک کی آزادی کی بڑی آرزو تھی۔ اپنے سفرِ آخرت کے چند دن پہلے بولے کہ دیش کی آزادی کی خواہش باقی رہ گئی لیکن اگر وہ جیتے رہے تو ان کو تقسیمِ ملک سے بڑا صدمہ پہونچتا ان کا خیال تھا کہ مذہب ہر شخص کا اپنا نجی معاملہ ہے اور ہندو و مسلمانوں و نیز دوسرے مذہب کے ماننے والوں میں یک جہتی کے کافی سامان موجود ہیں اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قدم سے قدم ملا کر ترقی کی طرف چل سکتے ہیں۔

اردو سے ان کو جو لگاؤ تھا وہ ظاہر ہے لیکن وہ اس کے ساتھ ہندی کے مخالف نہیں تھے ان کی رائے میں شمالی ہندوستان میں دونوں ہی زبانوں کی گنجائش تھی البتہ عام فہم الفاظ کا استعمال پسند کرتے تھے۔

صوبہ میں ہندوستانی اکاڈمی کا قیام ان کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھی اور یہ پودا ان ہی کی آبیاری سے سرسبز ہوا تھا۔

مزاج میں نفاست پسندی اور سلیقہ (orderliness) بدرجہ اتم تھا۔ رسالہ کا دفتر بہت صاف ستھرا رہتا تھا۔ آمدنی و خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا تھا۔ ضروری کاغذات و مراسلات حتیٰ کہ باہر سے آنے والے خطوط کی سلسلہ وار باقاعدہ فائل رکھتے تھے۔ ان خطوط میں پریم چند جی کے بھی وہ خطوط تھے جن کو امرت رائے جی نے چٹھی پتری جلد ایک میں شائع کیا ہے۔ جس باقاعدگی سے یہ خطوط و نیز دیگر خطوط رکھے جاتے تھے اس سے ان کا حسنِ مذاق و سلیقہ ظاہر ہوتا ہے ورنہ عام طور پر خطوں کا جواب دینے کے بعد لوگ ان کو ردی کی ٹوکری کے حوالہ کر دیتے ہیں

۲ر نومبر ۱۹۴۲ء کو ایک طویل بیماری کے بعد علم و ادب کا یہ چراغ بجھ گیا اور حقیقی معنوں

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

میں ایک انسان دنیا سے رخصت ہوگیا۔
کہتے ہیں کہ جب تک کسی کے جاننے والے ، اس کی یاد کرنے والے دنیا میں موجود رہتے ہیں وہ شخص دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کی یادوں میں باقی رہتا ہے۔

گرم اشکوں میں نہاں ہے کوئی — سرد آہوں میں نہاں ہے کوئی
میں نے گھبرا کے جو اک روز جگر — دی یہ آواز کہاں ہے کوئی
درد چیخا کہ مجھی میں ہے وہ شوخ — غم پکارا کہ یہاں ہے کوئی

چنانچہ اب بھی جب ان کی یاد آتی ہے تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں لیکن اب ان کو رخصت ہوئے قریب چالیس سال ہو گئے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کے جاننے والوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ ان کا نام فقط اوراق کی زینت بن کر رہ جائے گا۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانہ کی خاک

⁂ ⁂ ⁂

With best compliments From:

TRACK PARTS OF INDIA Ltd.
4, Industrial Area, Govind Nagar,
P O. Udyog Nagpr, KANPUR-208 022

Telex : 0525-248 **Phones :** 21652
Gram : TRACK 21752

Manufacturers of :- TRACK COMPONENTS for Crawler Tractors & CLOSED DIE STEEL FORGINGS.

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

اُردو دُنیائے افسانہ نگاری میں ایک نیا اُبھرتا نام

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جو ہندی افسانوی دنیا میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ہندی افسانہ نگاری میں ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں۔

اگر آپ

قومی یکجہتی کے دلدادہ ہیں، یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی، یا دیہات (گاؤں) کی سادہ اور پاک فضا میں زندگی بسر کرنے والوں کی جی داری۔ عزت و ناموس پر مٹنا، باہمی رفاقت اور غیر فرقہ وارانہ روابط کی دل کشی، سچی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں، نیز جہیز اور دیگر مجلسی برائیوں کو دور کرنے کی حمایت کرتے ہیں تو ـــــ پڑھیے

مانسرور

جو ڈاکٹر اُودے سرن ارمان کے اکیس ایسے اچھوتے اور دل و دماغ پر اثر کرنے والے سچائی پر مبنی اردو افسانوں کا مجموعہ ہے جو اپنی دل کشی، بہترین لکھائی چھپائی اور دیدہ زیب قومی یکجہتی کے رنگوں میں آپ کی نظروں کو دعوت مطالعہ دے گا۔ قیمت ۱۲/- روپے علاوہ محصول ڈاک

یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کسی بھی افسانہ کو شروع کریں اور بغیر پورا پڑھے کتاب کو رکھ دیں

مانسرور کا انگریزی ایڈیشن بھی بہت جلد منصۂ شہود پر آ رہا ہے جسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے جناب ادیب لکھنوی ریٹائرڈ پرنسپل، رام رتن انٹر کالج، بلاری نے۔ اس کے علاوہ مانسرور کا ہندی ایڈیشن شائع ہو گیا ہے جو ہر اچھے بک سیلرز کے ہاں دستیاب ہے۔

ملنے کا پتہ

یو ایس اے اسپتال پوسٹ بلاری ضلع مراد آباد یو۔ پی

نوٹ:۔ دفتر ماہنامہ شان ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے بھی یہ کتاب دستیاب ہے۔

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

انا - اوران

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri

CC-0. Kashmir Research Institute, Srinagar. Digitized by eGangotri